مرتبہ

ڈاکٹر قمر رئیس

ربِ لامکاں کا صد شکر ہے کہ اس نے ہمیں توفیق دی کہ ہم اردو ادب کی کتب کو سافٹ میں تبدیل کر سکے۔ اسی صورت میں یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ مزید اس طرح کی عمدہ کتب حاصل کرنے کے لئے ہمارے گروپ میں شمولیت اختیار کریں۔

انتظامیہ برقی کتب

گروپ میں شمولیت کے لئے:

محمد ذوالقرنین حیدر: +92-3123050300

اسکالر سدرہ طاہر صاحبہ: +92- 334 0120123

بار اوّل : جون ۱۹۷۶ء
نگراں : سید راحت علی کرمانی
قیمت : ۲۵ روپے
مطبوعہ : خواجہ پریس دہلی

ڈی لکس ایڈیشن
قیمت : ۶۰ ساٹھ روپے

ترتیب

ترجمہ کا فن

ترجمہ کی روایت

مقدمہ

انسانوں کے درمیان باہمی ارتباط، اتحاد اور یگانگت کی راہ میں جو سب سے اہم فطری رکاوٹ حائل رہی ہے، شاید وہ زبانوں کا فرق ہے۔ اس فرق کو مٹانے اور انسان کے علم و عرفان اور ادب کو بنی نوع انسان کی مشترک میراث بنانے میں ترجمہ نے جو اہم اور نتیجہ خیز رول ادا کیا ہے انسانی تہذیب کی تاریخ کا ہر ورق اس کا گواہ ہے۔ ترجمہ نے ہی ایک قوم کے ذخیرۂ علم و ادب کو دوسری قوموں تک پہنچایا ہے۔ ایک انسانی گروہ کے تجربات سے دوسری جماعتوں کو فیض اٹھانے کا موقع دیا ہے۔ اس ذخیرہ میں جیسے جیسے توسیع و اضافہ ہوتا رہا ہے ترجمہ کی رفتار بھی تیز تر ہوتی رہی ہے۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ انسانی علوم کو فروغ دینے میں جہاں اور بہت سے اسباب اور عوامل رہے ہیں

وہاں ترجمہ بھی ایک طاقتور محرک کا رول ادا کرتا رہا ہے۔

بیسویں صدی سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں انسان کی حیرت زا فتوحات اور کامرانیوں کی صدی ہے۔ایک زمانہ تھا جب انسان کا سارا سرمایۂ علم، منطق و فلسفہ، طب و ہیئت یا پھر اساطیر دینیات اور ادبیات کی چند مستند کتابوں تک محدود تھا۔کسی بھی ذہین طالب علم کے لئے اس سرمایۂ علم پر عبور حاصل کرنا دشوار نہیں تھا لیکن اب جب فضائے بسیط کی طرح انسان کا علم بھی بے کراں ہو گیا ہے ۔ اس علم سے بہرہ ور ہونے کے لئے ایک نہیں ہزاروں زندگیاں درکار ہیں ۔سوال یہ ہے کہ علم کی اس ہوشربا افزونی میں جس طرح مشینوں اور دوسرے بے شمار خودکار آلات کا حصہ ہے کیا ترجمہ میں بھی میکانکی آلات کے استعمال کا امکان ہے ؟ اگر نہیں تو اس کے بغیر کیا ترجمہ آج اور آنے والے زمانے میں اپنا منصب ادا کر سکے گا؟ یعنی روز افزوں علم و ادب کو کسی ایک زبان سے دوسری زبانوں میں منتقل کر سکے گا؟ یہ مسئلہ سچ مچ بہت بڑا ہوتا اگر دنیا کے اکثر ملکوں میں ایک سے زاید زبانیں سیکھنے اور سکھانے کا رجحان پرورش نہ پاتا۔اس کے باوجود اپنے آپ میں یہ سوال اب بھی اہم ہے ۔بے شک ترجمہ کے کام میں بھی اب مشینیں ہاتھ بٹانے لگی ہیں۔ قانون ساز ایوانوں اور بین الاقوامی اجلاسوں میں ہی نہیں بلکہ دوسرے بہت سے اداروں میں بھی جہاں مختلف زبانیں

بولنے اور سمجھنے والے اراکین شریک ہوتے ہیں وہاں یہ منظر عام ہے
کہ ایک مقرر اپنی زبان میں تقریر کر رہا ہے اور اسی وقت دوسرے
شرکا۔ اپنی اپنی زبان میں اس کی تقریر کا ترجمہ سن رہے ہیں۔
یہ سب صوتی آلات اور ہیڈ فون جیسی ایجادات کے ذریعہ ہی ممکن
ہو سکا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ فوری ترجمہ خواہ سو زبانوں میں ہو،
بہرحال انسانی کوشش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اصل سوال یہی ہے کہ
اب جب کہ ہر روز، ہر ساعت دنیا کی مختلف زبانوں میں ماہرین
علم اپنے اپنے شعبہ میں علم و آگہی کا اضافہ کر رہے ہیں۔ کیا مشینوں
کی مدد کے بغیر صرف انسانی کوشش سے اس بسیط خزانہ کو دوسری
زبانوں میں منتقل کیا جا سکتا ہے تاکہ کرۂ زمین کے دوسرے گوشوں
میں کام کرنے والے ماہرین بھی ان نئے انکشافات سے اکتساب
کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہو گا۔ اسی صورت حال کا
اندازہ کر کے اب سے تقریباً تیس سال پہلے ۱۹۴۷ء میں A. D. Both
نے ایک ایسی خود کار مشین کی ایجاد پر زور دیا تھا جو ایک زبان سے
دوسری زبان میں ترجمہ پر قادر ہو۔ کم و بیش اسی زمانہ میں سوویت یونین
میں بھی مترجم مشینوں کا تصور پیش کیا گیا۔ ضرورت نے ایجاد پر اکسایا اور
آج سوویت یونین، امریکہ اور دنیا کے بعض دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں
الکٹرانک کمپیوٹر مترجموں کی مدد سے سائنس اور ٹکنالوجی کی تحریروں
کے خام ترجمے ہو رہے ہیں۔ خام اس لئے کہ یہ ترجمے اب بھی انسان

کے ہاتھوں کیے جانے والے ترجموں کا بدل نہیں بن سکے ہیں۔
وہ اس وقت تک قابل اعتماد نہیں ہوتے جب تک کہ وہ انسان کے
ذریعہ اصل سے تقابل اور اصلاح کے مرحلہ سے نہ گذریں۔ ان
مترجم مشینوں کی کوتاہی یہ ہے کہ ان کا حافظہ محدود ہوتا ہے۔ وہ
عام طور پر ایک لفظ کے لئے ایک ہی لفظ فراہم کرتی ہیں۔ جب کہ ایک
لفظ اکثر مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ عبارت کے سیاق وسباق
میں کوئی لفظ جس خاص مفہوم میں استعمال ہوا ہے اسے سمجھنا اور دوسری
زبان میں اس کا صحیح متبادل تلاش کر کے لکھنا یہ انسان کے بس کا تو
ہے مشینیں اس صلاحیت سے محروم ہیں۔ دوسرے یہ کہ مرکبات بندشوں
سابقوں اور لاحقوں کے استعمال سے لغوی معنوں میں جو فرق پیدا ہوتا
ہے مشینیں ان کی تفہیم اور ترجمہ سے بھی معذور ہیں۔ جہاں تک محاورات
ضرب الامثال یا پھر لفظوں کے علامتی اور تخلیقی استعمال کا تعلق ہے۔
مشینوں کے ذریعے ان کے ترجمہ کا توفی الحال تصور بھی محال ہے۔ ان
مشینی ترجموں کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسے دونوں زبانوں ... سے
سرسری واقفیت رکھنے والا کوئی طالب علم محض لغت میں دیکھ دیکھ کر
لفظی ترجمہ کرے۔ ظاہر ہے کہ وہ لغت میں دیئے ہوئے لفظوں کے
مختلف معنوں میں سے کسی ایک معنی کے انتخاب میں ہی نہیں قواعد یا
صرف ونحو میں بھی غلطیوں کا مرتکب ہوگا۔ مگر مشینیں ان کے مقابلے میں
اس لئے قابل ترجیح ہیں کہ وہ زیادہ سرعت سے کام کریں گی اور تھکنے

کا نام نہیں لیں گی ۔ دوسرے یہ کہ الکٹرانک مشینوں کو اگر ترجمہ کے سلسلہ میں کوئی خاص ہدایت کر دی جائے گی تو اس کی پابندی میں وہ لغزش نہیں کریں گی ۔ کہا جاتا ہے کہ دس لاکھ ریاضی داں ایک گھنٹہ میں کاغذ قلم لے کر حساب کا جتنا کام کر سکتے ہیں وہ صرف ایک کمپیوٹر اتنے ہی وقت میں بغیر کسی غلطی کے بخوبی انجام دیتا ہے ۔ ٹکنالوجی اور سائنسی علوم کی برق رفتار ترقی کے اس دور میں ایسے مترجم کمپیوٹروں کی ضرورت ہے جو علم کے خزانوں کو اسی سرعت سے ایک زبان سے دوسری زبانوں میں منتقل کر سکیں جس سرعت سے ان میں اضافہ ہو رہا ہے ۔ اور شکر ہے کہ گذشتہ ربع صدی میں اس میدان میں جو تجربے ہوتے ہیں ان کی رفتار تسلی بخش ہے اور وہ دن دور نہیں جب نہ صرف سائنسی علوم بلکہ بعض سماجی علوم کے ترجمے بھی مشینوں کے ذریعہ اطمینان بخش طور پر ہونے لگیں گے ۔

اصل مسئلہ ہے ادبی تصانیف اور تخلیقی نگارشات کے ترجمہ کا ۔ جو صدیوں سے اہل نظر کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے اور اس کے کچھ اصول اور ضابطے مرتب کئے جانے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں ۔ ترجمے تو ہر زبان میں خواہ وہ مشرق کی ہو یا مغرب کی طلوع تہذیب کے دور سے ہوتے آئے ہیں ۔ لیکن یہ عجب اتفاق ہے کہ جہاں مغرب میں اٹھارھویں صدی کے اوائل سے ہی ترجمہ کے فن اور اس کے مسائل پر سنجیدہ غور و فکر کے نشانات دمقالوں کی صورت میں) ملنے شروع ہو جاتے ہیں وہاں

مشرق کی بیشتر زبانوں میں بیسویں صدی میں بھی اسے زیادہ قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اردو جیسی ترقی یافتہ زبان میں ترجمہ کے فن پر اب تک کوئی تصنیف وجود میں نہیں آئی۔ (یہ الگ بات ہے کہ بعض دارالترجموں میں کچھ اہم اصول طے کر لئے گئے) یہ تسلیم کرنے میں ہمیں تامل نہیں ہونا چاہیئے کہ ترجمہ کو ایک فن سمجھنے اور ترجمہ کرتے ہوئے کچھ خاص اصولوں کو پیش نظر رکھنے کی تحریک اور تصور ہمیں مغربی اقوام سے رابطہ کے بعد ہی ملا ہے۔ اس سے قبل نہ تو اخذ و ترجمہ میں کوئی فرق کیا جاتا تھا اور نہ ہی تصنیف و ترجمہ میں کوئی خاص امتیاز روا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ برطانوی اقتدار کے بعد شعر و ادب کے مترجم کچھ مشترک اصولوں کے پابند ہو گئے۔ ایسا تو مغرب میں بھی نہیں ہوا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ ترجمہ کے سلسلہ میں ایک اخلاقی ضابطہ اور فنی سلیقہ پیش نظر رہنے لگا۔ اس کے نتیجہ میں اصل مصنف کے ساتھ جو بے انصافیاں اور شوخیاں برتی جاتی تھیں وہ کم ہو گئیں۔

وہ حضرات جو تخلیقی ادب کے ترجمہ کو ناممکن قرار دیتے یا وہ جو ٹرانسلیٹر کو Traitor اور Imitator کے تحقیر آمیز القاب سے یاد کرتے ہیں ترجمہ کی اہمیت سے منکر نہیں اور شاید وہ اس حقیقت کے منکر بھی نہیں کہ ترجمے نے انسانوں اور قوموں کے درمیان حائل بہت سی دیواروں کو توڑا ہے۔

اس نے ہر عہد میں نئے نئے افکار و نظریات کو ایک قوم سے دوسری

قوم تک پہنچایا ہے۔ ایک تہذیب کو دوسری تہذیب سے روشناس کرایا ہے۔ ترجمہ کے ذریعہ ہی ایک زبان دوسری زبان کے اظہارات اس کے مزاج اور اس کی نحوی ساخت سے متعارف ہو کر اپنا روپ رنگ بدلتی اور وسعت حاصل کرتی ہے۔ اکثر دوسری زبانوں کے شاہکاروں کا ترجمہ ہی ادیبوں کو نئے ادبی میلانوں، اور فنی معیاروں کا احساس دلا کر نئے تجربات اپنانے کا اور نئے ادبی رجحانات کا محرک ثابت ہوتا ہے۔ یہ ایسے حقائق ہیں جن کے ثبوت کے لئے دلائل کی ضرورت نہیں۔ اس لئے آج اس بحث کے مقابلہ میں کہ تخلیقی ادب کا ترجمہ ممکن ہے یا نہیں یہ سوال زیادہ اہم ہے کہ ترجمہ کی مشکلات کیا ہیں اور ان پر کس طرح قابو پایا جا سکتا ہے۔؟

ظاہر ہے کہ یہاں مشکلات سے مراد وہ دقتیں نہیں ہیں جو ایک ذوشق یا دونوں زبانوں میں سے کسی ایک یا دونوں سے کم واقفیت رکھنے والے مترجم کو پیش آتی ہیں۔ ادبی تصنیفات کے ترجمہ کے سلسلہ میں کچھ بنیادی ضرورتیں اور شرطیں ایسی ہیں جن کی تکمیل بہر حال ضروری ہے۔ مترجم کو دو زبانوں اور دو قوموں کے درمیان لسانی اور ثقافتی سفیر کا نام دیا گیا ہے۔ اس لئے کسی بھی زبان کی تصنیف کو کامیابی سے اپنی زبان میں منتقل کرنے کے لیے پہلی شرط یہی ہے کہ اصل تصنیف کی زبان، اس کے ادب اور اس کی قومی تہذیب سے نہ صرف واقفیت بلکہ دلچسپی اور ہمدردی ہو۔ دوسری اہم شرط اپنی زبان پر اس کی قدرت اور نئے خیالات کے

اظہار کے لئے نئے الفاظ، ترکیبیں اور اصطلاحیں وضع کرنے کی استعداد ہے۔ تیسری ضرورت اصل تصنیف کی زبان سے ایسی گہری واقفیت ہے کہ وہ اس کی باریکیوں، نفاستوں اور تہ داریوں کو بخوبی سمجھ سکے۔ چوتھی یہ کہ اصل تصنیف جس عہد اور جس موضوع سے تعلق رکھتی ہے اس عہد کی زندگی اور زبان اور اس موضوع کی اہم تفصیلات سے مترجم کی واقفیت ہو۔ اور آخری لیکن سب سے اہم شرط ادبی ترجمہ کی صلاحیت، دلچسپی اور شوق و انہماک ہے۔ اگر یہ نہیں تو دوسری تمام شرطوں کی تکمیل بھی کامیاب ترجمہ کی ضمانت نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ تمام ضرورتیں تو ترجمہ کے سلسلہ میں مبادیات کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ترجمہ کے مسائل اور مشکلات کا احاطہ کئی زاویوں سے کیا گیا ہے اور کیا جا سکتا ہے۔ اس کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ ترجمہ کا مفہوم اور اس کی غایت کیا ہے؟ عام طور پر یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ ترجمہ اصل تصنیف کا نعم البدل نہیں بن سکتا۔ نہایت کامیاب اور دلکش ہونے کے باوصف ترجمہ ترجمہ ہی رہے گا اور اس کی گنجائش رہے گی کہ اس کے بعد کا ترجمہ اُس سے بہتر ہو۔ یعنی تکمیلِ فن کی جو خوبی اصل میں ہے وہ ترجمہ کو حاصل نہیں ہو سکتی اس سلسلہ میں ایک استثنائی رائے ہندی کے شاعر ڈاکٹر بچن کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر مترجم اعلیٰ درجہ کی تخلیقی صلاحیت کا مالک ہو اور ترجمہ دیانتداری سے کرے تو اس کا ترجمہ اصل تخلیق سے زیادہ وقیع فن پارہ بن سکتا ہے۔ اس لئے کہ ترجمہ کے عمل میں دو تخلیقی جوہر بروئے کار ہوتے

ہیں ایک مصنف کا اور دوسرا مترجم کا[1] ہندی کے ایک دوسرے شاعر شری کانت ورمانے اپنے ایک مضمون میں یہ نہ جانتے ہوئے کہ وہ ڈاکٹر بچن کی تائید کر رہے ہیں ایک دلچسپ مثال دی ہے۔ کچھ امریکی شاعروں نے ہندی کی منتخب نظموں کا ترجمہ کیا تھا جو بلومنگٹن (امریکہ) سے شائع ہوا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ ان میں سے بہت سی نظمیں اصل زبان میں نہایت ہی بے کیف تھیں لیکن ترجمہ میں وہ حیرتناک حد تک جاندار بن گئی ہیں[2]

یہاں مجھے ایک روسی نقاد بلنسکی کا ایک دلچسپ مقولہ یاد آرہا ہے کہ "بری کتابوں کا اچھا ترجمہ پڑھ کر ایسی ہی وحشتناک کوفت ہوتی ہے جیسی کہ اچھی کتابوں کا برا ترجمہ پڑھ کر" دراصل یہ مسئلہ ہی الگ ہے۔ اور ترجمہ کی دنیا میں اکثر کچھ خوش نصیب اور کچھ بدنصیب ادیبوں کے ساتھ یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ ؏

ایسے ویسے، کیسے کیسے ہو گئے
کیسے کیسے، ایسے ویسے ہو گئے

دوسرے مصرع کی تکرار زیادہ ہوتی ہے۔

بات اچھی تصانیف کے اچھے ترجمے کی ہو رہی ہے اگر ڈاکٹر بچن کی رائے کو صحیح مان لیا جائے (جس کی کوئی مثال میرے علم میں نہیں) تو سوال یہ ہوگا کہ جس مصنف کی تخلیق کے حسن کو مترجم کی تخلیقی فکر دوبالا کر دے تو اصل

---

[1] ہندی، انوواد، شمارہ ۱۰۵ ص ۱۰۵ [2] ہندی، انوواد، شمارہ ۲۶-۲۷ ص ۴۹

مصنف کیا اسے اپنی تخلیق کا دیانتدارانہ ترجمہ تسلیم کرے گا؟ اور اگر کرے گا تو اس کی مثال کیا اس بے ایمان لکڑہارے کی نہیں ہو گی جسے جل پری جب سونے کی کلہاڑی دکھاتی ہے تو وہ کہتا ہے "ہاں ہاں یہی میری کلہاڑی ہے"

ترجمہ فن ہو یا نہ ہو ترجمہ ضرور ہے۔ ماضی میں ترجمہ کے نام پر کچھ بھی ہوتا رہا ہو۔ لیکن ڈاکٹر جانسن نے مدتوں پہلے جو بات کہی تھی اسے آج عالمی سطح پر تسلیم کیا جا رہا ہے کہ ترجمہ کو اصل سے بہتر بنانے کی کوشش کسی طرح مستحسن نہیں۔ مترجم کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ کسی تصنیف کی معنوی یا فنی اہمیت کے پیش نظر اسے اپنی یا ترجمہ کی زبان میں پوری دیانت سے منتقل کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن چوں کہ کسی بھی تصنیف یا تخلیق کے تار و پود TEXTURE میں صرف معنوی نہیں بلکہ تہذیبی تخلیکی اور لسانی عوامل .... باہمی طور پر شیر و شکر ہوتے ہیں۔ اس لئے دیانت دارانہ ترجمہ کا کام تخلیق کے مقابلہ میں زیادہ نازک پیچیدہ اور ذمہ دارانہ ہوتا ہے۔ اس میں دو رائیں نہیں کہ ہر تخلیقی فن پارہ میں کچھ ایسے عناصر ہوتے ہیں جو دوسری زبان (خاص طور پر ایک مختلف تہذیبی ماحول کی پروردہ زبان) میں بجنسہٖ منتقل نہیں کئے جا سکتے۔ اس معذوری کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ جہاں تک مواد اور نفسِ موضوع کا تعلق ہے اصل تصنیف کے تخلیقی جوہر کو دوسری زبان میں قابل لحاظ کامیابی کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے اس طرح کہ قارئین ترجمہ کے آئینہ میں اصل تصنیف کی فکری اور فنی اہمیت کو نہ صرف محسوس کر سکیں۔ بلکہ محظوظ بھی ہوں۔ اور یہ افسانوی

ادب، ڈراما اور شاعری کسی بھی صنف میں ممکن ہے۔ فنِ ترجمہ نگاری کے اس نظریہ اور عمل کی بنیاد قابلِ ترجمہ ہونے کی صلاحیت (TRANSLATIBILITY) کے اصول پر رکھی گئی ہے۔ اس کی رُو سے کسی ادبی تخلیق کے مواد کو دوسری زبان میں اس سے مطابقت رکھنے والے اسلوب وہیئت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خواہ فارم کی سطح پر بعض اجزا عناصر کے سلسلہ میں دونوں زبانوں کا اختلاف کتنا ہی شدید ہو۔ اشتراکی ملکوں بالخصوص سوویت یونین میں اسی نظریہ پر عمل کیا جارہا ہے۔ لیکن یہ عمل کسی بندھے ٹکے فارمولے کی صورت میں نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ ہر نئی تصنیف کے ترجمہ میں مترجم کو کچھ نئے اور انوکھے مسائل کا سامنا ہوتا ہے جن کو وہ اپنی ذہانت اور بصیرت سے آزادانہ طور پر حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بے شک اسے تحسین وتحریف کی آزادی نہیں وہ ہر جملے اور ہر مصرعے کا ترجمہ کرتا ہے لیکن اس کا مطمحِ نظر مجموعی صورت میں اس تخلیق کی معنویت اور تخلیقی انفرادیت کی باز آفرینی ہی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مغرب میں ترجمہ کے جن دو نظریوں پر زور دیا جاتا رہا ہے انھیں آزاد اور لفظی ترجمہ کا نام دیا گیا ہے۔ دونوں کا مقصد اصل تخلیق کو دوسری زبان کے قارئین تک اس طرح پہنچانا ہے کہ اس کی معنوی اور ظاہری ہیئت میں وحدت قائم رہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ اول الذکر میں اصل تصنیف کے تخلیقی اور جمالیاتی عناصر پر زور دیا جاتا ہے اور موخر الذکر میں اس کی معنویت پر۔ حقیقت میں لفظی ترجمہ کو دیانت دارانہ ترجمہ کا نام بھی دیا گیا ہے یعنی یہاں

اصل مصنف اور اس کی تصنیف سے وفاداری ترجیحی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ زبان اور الفاظ اساسی طور پر خیال کے ابلاغ کا ذریعہ ہیں اور ترجمہ میں بھی توجہ اس خیال کو منتقل کرنے پر ہوتی ہے۔ جس کی علامت اصل متن میں کوئی لفظ ہوتا ہے لیکن دشواری یہ ہے کہ تخلیقی ادب میں کم وبیش ہر لفظ خیال کے ساتھ ساتھ تاثر کیفیت اور ایک مخصوص فضا کے اظہار کا ذریعہ بھی ہوتا ہے اور یہی وصف اس کی ایمائی قوت اور تخلیقی حسن کی دلیل ہوتا ہے۔ اسے نظر انداز کر کے الفاظ کے صرف لغوی معنیٰ پر اصرار کو دیانت داری کے بجائے کوئی اور نام دیا جانا چاہئے۔ لیکن اس کا جو حل آزاد ترجمہ کے حامیوں نے (بالخصوص شاعری کے ترجمہ میں) تلاش کیا ہے اسے بھی تسلی بخش نہیں کہا جا سکتا۔ وہ ترجمہ کو تخلیق یا باز آفرینی کا عمل سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک مترجم کا کام یہ ہے کہ وہ اصل تخلیق سے پیدا ہونے والے تاثرات میں اس طرح ڈوب جائے کہ وہ اس کا اپنا تجربہ معلوم ہوں۔ پھر وہ تخیل کی مدد سے ان تاثرات کو اپنی ہی زبان کے ایسے پیکر میں ڈھالے کہ اس زبان کے قارئین بھی اس کے تاثرات سے اسی طرح محظوظ ہوں جس طرح وہ خود ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ زمان و مکان کے مختلف نقطوں سے تعلق رکھنے والے مختلف افراد پر اصل تخلیق کے تاثرات بھی مختلف ہوں گے۔ ہر مترجم اپنے مخصوص تجربات اور اپنی ذہنی اور جذباتی افتاد کے آئینہ میں ہی اصل تخلیق کے تاثرات قبول کرے گا اور پھر ان کی تخلیقی صورت گری میں

اس کے تخیل کی منفرد کائنات اثر انداز ہوگی۔ اس طرح وہ ترجمہ کے نام پر جو کچھ پیش کرے گا ضروری نہیں کہ وہ اصل تخلیق سے مطابقت رکھتا ہو۔ اس سلسلہ میں رباعیات عمر خیام کے مشہور مترجم فٹزجیرالڈ کے مسلک کی ہمنوائی کرنے والے فرانسیسی شاعر پال ویلیری کا یہ بیان قابل توجہ ہے۔ وہ کہتا ہے۔

" ترجمہ کرنا، کسی علّت (اصل تخلیق) کے معلول کی، ایک دوسری علّت (ترجمہ) کے توسط سے، امکانی قربت (صحت) کے ساتھ تشکیل نو کرنا ہے لہ"

یہاں ویلیری اس پر زور دیتا ہے کہ تخلیقی مترجم کا کام کسی فن پارہ یعنی علّت و محرک کی ترجمانی کرنا نہیں بلکہ اس فن پارہ کی قرات یا سماعت سے جو تاثرات مترجم کے ذہن و تخیل میں بیدار ہوں ایک نئی علّت (ترجمہ) کے ذریعہ ان کی بازآفرینی کرنا ہے۔ اس کی وفاداری اصل تخلیق سے نہیں بلکہ اپنے تاثر سے ہوگی۔ جن کو بہ تمام و کمال ادا کرنے کی کوشش میں وہ کم و بیش اسی تخلیقی عمل سے گذرے گا جس سے کہ اصل تخلیق کار گذرا ہے۔ ویلیری جس طرز کی علامتی اور ایمائی شاعری کا

لہ انگریزی میں ویلیری کا اقتباس

TO TRANSLATE IS TO RECONSTITUTE AS NEARLY AS POSSIBLE THE EFFECT OF A CERTAIN CAUSE (THE ORIGINAL) BY MEANS OF ANOTHER CAUSE (THE TRANSLATION)

The Art of Translation : Delhi : 1962, P. 23

نمائندہ اور برگزیدہ رہا ہے ممکن ہے اس انداز کی یا اس سے مماثل شاعری کے ترجمہ کے لئے یہ فارمولا صحیح ثابت ہو لیکن اعلیٰ درجہ کی فکرانگیز اور حیات افروز شاعری اور عام تخلیقی ادب کے ترجمہ پر اس کا اطلاق اور اس پر عمل مایوس کن بلکہ گمراہ کن نتائج کا سبب ہو سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اعلیٰ شاعری کے ترجمہ کے لئے خواہ وہ نثر میں ہو یا نظم میں اعلیٰ درجہ کی تخلیقی صلاحیت درکار ہے۔ ڈرائیڈن کے مذکورہ بیان میں بھی اسی حقیقت پر زور ہے۔ لیکن اس ضمن میں مترجم کے لئے جو وصف سب سے زیادہ ضروری ہے وہ وہی ہے جسے KEATS نے منفی استعداد "کا نام دیا ہے۔ یعنی ترجمہ کے عمل میں مترجم اپنی شخصیت کو معطل رکھنے پر قادر ہو۔ وہ اصل تخلیق کی فضا اس کے مواد اور محرکات میں اسی طرح اپنے آپ کو گم کر دے جس طرح اصل فنکار نے اپنے تخلیقی عمل کے دوران کیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ شرط بہت کڑی ہے اور اس پر امکانی عمل در آمد مغرب میں مشرقی ادب کے جس بہتر سے بہتر ترجمہ کو پیش کر سکتا ہے۔ وہ فٹزجیرالڈ کا رباعیات عمر خیام کا ترجمہ ہے۔ اور یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ نہ صرف مشرق بلکہ مغرب کے فارسی شناس علماء کی قابل لحاظ تعداد اسے ترجمہ تسلیم کرنے میں تامل کرتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ترجمہ کی بے شمار مشکلات اور اس کے کثیر مسائل کا احساس اردو میں عام نہیں ہے۔ اس کا کچھ اندازہ ان ہی حضرات کو ہو سکتا ہے۔ جنھوں نے سنجیدہ انہماک کے ساتھ اردو میں دوسری

زبانوں کے تخلیقی ادب کا ترجمہ کیا ہے یا پھر وہ جنھوں نے اصل زبان کی تصانیف اور ان کے تراجم کا تقابلی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا ہے زیر نظر کتاب کے پہلے حصّہ "ترجمہ کا فن" میں اہل نظر کے جو مقالات جمع کیے گئے ہیں ان کا مقصد ان ہی مسائل کی طرف اردو کے طلبہ اور عام قارئین کی توجہ مبذول کرانا ہے۔

جہاں تک اردو زبان میں ترجمہ کے آغاز و ارتقاء اس کے اصولوں اور نظریوں، اس کی مشکلات اور فتوحات اور اردو زبان و ادب پر ترجمہ کے نتیجہ خیز اثرات کا تعلق ہے افسوس ہے کہ اس کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ اس لئے کہ اس صدی کے ابتدائی دہوں میں وحید الدین سلیم۔ مولوی عبد الحق، ظفر الرحمن دہلوی اور میر حسن جیسے چند بزرگوں کے علاوہ اردو کے کسی ادیب اور عالم نے اس موضوع کو سنجیدہ مطالعہ اور علمی تحقیق کے قابل نہیں سمجھا۔ قدیم کلاسیکی نثر میں اردو شاعری کے سرمایہ سے قطع نظر نثر کی بیشتر کتابیں فارسی ادب کا ترجمہ ہیں۔ سب رس، کربل کتھا، نو طرز مرصع، باغ و بہار، گنج خوبی، آرائش محفل اور انیسویں صدی کی دوسری بے شمار داستانیں، سب ترجمہ ہی تو ہیں۔ لیکن یہ ترجمہ کس نوعیت کا ہے؟ اس کے پیچھے اگر کچھ اصول کچھ مقاصد کار فرما رہے ہیں تو وہ کیا ہیں۔؟ مترجم نے کہاں تک اصل سے دیانت داری برتی ہے۔ کہاں متن سے انحراف کیا گیا ہے؟ اگر آزاد ہے تو مترجم کے ذہن میں آزادی کا کیا مفہوم اور مقصود تھا۔؟

ان ترجموں نے کس طرح اور کس حد تک اردو زبان اور اردو نثر کے اسالیب کو متاثر کیا ؟ یہ اور اس طرح کے دوسرے سوالات پر کسی عالم نے سنجیدگی سے غور و خوض کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی ۔ نہ ہی اس مقصد سے اصل متن اور ترجمہ کی عبارت کا تقابلی مطالعہ کیا گیا یہ کام ملک کی دوسری زبانوں میں ہوا ہے اور ہو رہا ہے لیکن اردو میں کیا افراد اور کیا ادارے کسی نے بھی اس موضوع کو قابل اعتنا نہیں سمجھا ۔

یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ اردو کو ایک جدید زبان بنانے، ملک گیر سطح پر اسے مقبولیت بخشنے اور ہندوستانی زبانوں میں اسے ایک امتیازی شان عطا کرنے میں جہاں چند دوسرے عوامل رہے ہیں وہاں یورپی بالخصوص انگریزی علوم و ادب کے تراجم نے بھی اہم رول ادا کیا ہے ۔ ان ہی تراجم کے ذریعہ اردو زبان کے لئے ایک ترقی یافتہ صنعتی تمدن کے دروازے کھل گئے ان دروازوں سے عقلیت، افادیت، آزادی ۔ انسان دوستی، روشن خیالی، ذوق تحقیق اور سائنسی طرز فکر کے جو خوشگوار جھونکے آئے ان سے اس زبان میں تازگی اور توانائی نمو پاتی رہی ۔ نت نئے علوم اور نئے تصورات کو جگہ دینے کے لئے خاموشی سے اصطلاحیں وضع ہوتی رہیں عدل و انتظام ہو یا مدارس کا نیا درسی نظام سب سے پہلے اور سب سے آگے بڑھ کر اردو ہی نے اپنی خدمات پیش کیں۔

درسی کتابوں، ضابطوں اور قوانین کے ترجموں میں اس نے الفاظ اور اصطلاحوں کے جو سکے جاری کئے ۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کا چلن عام ہو گیا۔ اور اس پذیرائی کے تاریخی اسباب تھے۔

ان ترجموں کا آغاز یوں تو مشنری اداروں اور بعض افراد کے ہاتھوں اٹھارہویں صدی کے وسط میں ہو گیا تھا لیکن اس کی رفتار و معیار میں تیزی اور نتیجہ خیزی انیسویں صدی کے نصف اول میں ہی پیدا ہوتی ۔ جہاں تک انگریزی سے ترجمہ کا تعلق ہے فورٹ ولیم کالج کا کارنامہ صرف چند لغات کی تدوین تک محدود ہے یا پھر چند کہانیوں اور ڈراموں کے اقتباسات کے ترجمے ہیں جو جان گلکرسٹ نے نمونے کے طور پر کئے یا کرائے تھے ۔ دلی کالج میں اس کے پرنسپل بوترو کی رہنمائی میں ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام ۱۸۴۱ء میں عمل میں آیا ۔ لیکن اس سے تین سال قبل حیدر آباد میں نواب فخرالدین خاں شمس الامرا ثانی سائنسی علوم کے انگریزی رسائل کے ترجمہ اور طباعت کا انتظام کر چکے تھے ۔

بقول مولوی عبدالحق ۱۸۳۹ء سے ۱۸۴۰ء تک انھوں نے علم ہیئت، ریاضیات اور بعض دوسرے علوم کی نصف درجن کتابیں ترجمہ کرا کر اپنے سنگی چھاپہ خانہ میں چھپوائیں ۔ اپنے مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے نواب شمس الامرا نے ایک کتاب کے آغاز میں لکھا ہے ۔

"بعض علوم اہلِ فرنگ میں ایسے رواج پائے ہیں کہ ان کا نام بھی

یہاں کے لوگوں نے نہیں سُنا۔ چنانچہ علم آب وہوا اور برق مقناطیس اور کیمسٹری وغیرہ۔ اس واسطے مدت سے ارادہ تھا کہ مبتدیوں کے فائدے کے لئے کوئی کتاب مختصر جامع چند علوم کی زبان فرنگ سے ایسی ترجمہ کی جاوے کہ فرصت قلیل میں اس کی معلومات سے طالبوں کو کچھ فائدہ میسر ہووے۔ مختصر رسالوں کے دیکھنے سے انکی طبیعت آشنائے علوم ہو جائے گی پھر طالبین از خود ارادہ مبسوط کتاب کے دیکھنے کا کریں گے۔[1]

حیدرآباد میں نواب شمس الامراء کی ان مبارک کوششوں سے بے گانہ رہ کر کم وبیش اسی زمانہ میں اودھ کے نواب محمد علی شاہ سید کمال الدین حیدر سے مغرب کے جدید علوم کی کتابوں کا ترجمہ کرا رہے تھے۔ جو مطبع سلطانی لکھنؤ سے شائع ہو رہے تھے۔

مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:-

"لکھنؤ کی رصدگاہ کے ایک معزز کارکن مولوی کمال الدین نے رصد گاہ کے ناظم کرنل ولکاک کی نگرانی میں کوئی بارہ رسالوں کا ترجمہ کیا جو فن۔ ہئے آلیہ ہیئت، علم الہوا، علم المناظر، حرارت، طبعیات آلات ریاضی، قوت مقناطیسی، کیمیا وغیرہ پر تھے۔[2]"

یہ کتابیں مبتدیوں کے لئے تھیں اور ان میں انگریزی اصطلاحوں

---

[1] اردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ۔ کراچی ۱۹۴۹ء ص ۳۱ [2] ایضاً

کے ترجمے کیئے گئے تھے ۔ افسوس ہے کہ اب یہ کتابیں دستیاب نہیں ۔ ورنہ معلوم ہوتا کہ مترجموں نے ترجمہ اور اصطلاح سازی میں کن اصولوں کو رہنما بنایا اور کس طرح کی اصطلاحیں وضع کیں ۔ تاہم اتنا ضرور ہے کہ جب دلی کالج میں وسیع پیمانہ پر ترجمہ کا سلسلہ شروع ہوا اور مغربی علوم کے لئے اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا تو ۱۸۴۰ء کے بعد وہاں ان ترجموں اور اصطلاحوں سے بھی مدد لی گئی ہوگی ۔ دلی کالج میں باضابطہ طور پر ترجمہ کے کچھ اصول وضع کئے گئے ۔ (جن کی کچھ تفصیل دوسرے حصّہ کے مقالوں میں آپ پڑھیں گے ۔) دلی کالج کے بعد اہم ادارہ جس نے اس کام کو منظم طور پر آگے بڑھایا سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی تھی ۔ اسی عہد میں مہاراجہ کشمیر کے دارلترجمہ میں بھی کچھ اہم علمی کتابوں کا ترجمہ ہوا ۔ اس کے بعد انجمن ترقی اردو نے جس کی بنیاد ۱۹۰۳ء میں پڑ چکی تھی، اردو زبان کی ترقی کے لئے ترجمہ اور اصطلاح سازی کے کام کو نمایاں اہمیت دی، اس مدت میں جو نیا تعلیمی نظام اور نصاب تعلیم ملک کے مدارس میں رائج ہوا ۔ اس کے تحت اوسط اور ثانوی سطح پر شمالی ہند اور قدیم ریاست حیدرآباد میں جدید مغربی علوم کی بے شمار کتابیں تالیف و ترجمہ ہو کر شامل نصاب ہو چکی تھیں۔

اس صورت حال میں ظاہر ہے کہ ۱۹۲۰ء میں جب حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ اور دارلترجمہ کا قیام عمل میں آیا اور یونیورسٹی کی سطح پر مغرب کے جملہ علوم و فنون کے لئے اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا

تو اس تجربہ کی کامیابی کوئی معجزہ یا رحمت آسمانی نہیں تھی بلکہ اس کی ٹھوس بنیاد تھی اور گزشتہ اسّی سال میں اُس کے لئے زمین ہموار ہوتی رہی تھی۔ دارالترجمہ کے اراکین نے ان اصولوں، اصطلاحوں اور نمونوں سے پورا فائدہ اٹھایا جو اُن کے پیشرو افراد اور اداروں کی محنت اور اختراعی قوت کا ثمرہ تھے۔ اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ مغربی علوم کے ترجمے اور اصطلاح سازی کے ذریعہ دارالترجمہ حیدرآباد نے اُردو کو دانشِ جدید سے مالامال کرنے میں جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اُنکی مثال ہندوستانی زبانوں کی تاریخ میں شاید ہی مل سکے۔ اس ادارہ کے علاوہ آزادی کے قبل انجمن ترقیٔ اردو، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد اور اُردو اکیڈمی جامعہ ملیہ نے بھی مغربی علوم اور ادب کے مستند اور معیاری ترجمے شائع کئے۔ آزادی کے بعد نیشنل بک ٹرسٹ، ساہتیہ اکیڈمی اور حال ہی میں ترقی اُردو بورڈ نے ادبی اور علمی کتابوں کے تراجم شائع کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں ترقیٔ اُردو بورڈ کے مقاصد اور منصوبے اس درجہ مہتم بالشان ہیں کہ اردو کی بقاء یا ترقی کے لئے اس کی گراں بہا سرگرمیوں کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکا ہے۔

جہاں تک مغرب کے تخلیقی اَدب کے تراجم کا تعلق ہے

اس کا سلسلہ بھی اُردو میں انیسویں صدی کے وسط سے شروع ہوجاتا ہے۔ چنانچہ گارساں دتاسی کے کم و بیش تمام سالانہ خطبات میں (جنکا آغاز دسمبر ۱۸۵۰ء سے ہوتا ہے) ایسے ناولوں، اخلاقی قصّوں، تمثیلوں اور نظموں کا ذکر ہوتا ہے جو سال بہ سال اردو میں ترجمہ ہوتے رہے۔ اسی نے اس بات کی طرف بھی اُردو والوں کی توجہ مبذول کرائی کہ بغیر حوالہ کے اور بنا اجازت کسی تصنیف کا ترجمہ کر کے شائع کرانا چوری کے مترادف ہے۔ شاعری کے ترجمہ کے سلسلہ میں اس نے یہ تجویز بھی پیش کی "اگر ایسی نظمیں منتخب کی جاتیں جن میں 'انگریزیت' کے بجائے عالمگیریت ہوتی تو زیادہ اچھا تھا۔" [۱]

اُردو میں منتخب انگریزی نظموں کا پہلا مجموعہ "جواہر منظوم" (مترجم قلق میرٹھی) ۱۸۶۴ء میں اور دوسرا مجموعہ "منتخب انگریزی نظموں کے منظوم تراجم" (مترجم بانکے بہاری لال) ۱۸۶۹ء میں شائع ہوئے۔ پہلے مجموعہ کے دیباچے میں درج ہے کہ ان منظوم تراجم پر مرزا اسد اللہ خاں دہلوی (غالباً مرزا غالب) نے نظرِ ثانی بھی کی تھی۔ اس کے بعد انجمن پنجاب لاہور کے شاعروں آزاد اور حالی نے انگریزی کی چند نظموں کو اردو کا لباس

---

[۱] خطباتِ گارساں دتاسی ص ۴۲۹ ص ۵۲۹

پہنایا۔ انیسویں صدی کے آخر میں یہ سلسلہ تیزی سے چل نکلا۔ آزاد نے اپنے ایک لکچر میں لکھا تھا کہ شاعری میں نئے انداز کے خلعت و زیور انگریزی صندوقوں میں بند ہیں جنکی کنجی ہم وطن انگریزی دانوں کے پاس ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی کنجی سے انگریزی صندوقوں کو کھول کھول کر اردو زبان کو نئے طرز کی شعری خلعتوں سے آراستہ کر دیا۔ ان میں اسمٰعیل میرٹھی، نظم طبا طبائی، شرر، نادر کاکوروی، سرور جہاں آبادی، ضامن کنتوری، اقبال، ظفر علیخاں، تلوک چند محروم، غلام بھیک نیرنگ۔ الغرض شاید ہی کوئی اہم یا غیر اہم انگریزی داں شاعر ایسا رہا ہو جس نے حسبِ توفیق انگریزی کے معروف یا غیر معروف شعرا کی دو چار نظموں کے تراجم نہ کئے ہوں۔ ان نظموں کی فہرستیں میر حسن اور ڈاکٹر حامدی کشمیری کی تصانیف میں ملتی ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابھی تک علمی ڈھنگ سے ان شعری ترجموں کی نوعیت انکے معیار و کردار اور جدید اُردو شاعری پر انکے اثرات کا مطالعہ نہیں کیا جا سکا ہے۔ محمد حسین آزاد، سرسید اور ان کے بعض رفقا نے انگریزی تمثیلچوں اور انشائیوں کے ترجمے بھی کثرت سے کئے اور اسی مدت میں انگریزی کے اخلاقی اور غیر اخلاقی اسراری اور جاسوسی ناولوں اور افسانوں کے ترجمے بھی شائع ہوتے رہے گار سال و تاسی کبھی کبھی اپنے خطبات میں کڑھتا اور دبے لفظوں میں احتجاج کرتا تھا کہ آخر اُردو والے انگریزی ادب کے

ترجمہ پر ہی کیوں تلے ہوتے ہیں؟ فرانسیسی، جرمن، روسی اور ترکی کا ادب کبھی کچھ کم ترقی یافتہ نہیں تھا۔ لیکن اُردو والوں کی کچھ حکومتی کچھ مجبوری تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کم و بیش سن ۱۹۳۰ء تک اُردو شعر و ادب وکٹورین عہد کے انگریزی ادب کے سائے تلے پلتا اور لگ بھگ اسی سانچہ میں ڈھلتا رہا۔ اس زمانے میں صرف انہی ادیبوں نے اردو شعر و ادب اور اسکی تنقید کو ایک نیا رخ، نیا قالب دینے کی کوشش کی جو کسی نہ کسی سبب سے "انگریزیت" سے دور اور یورپ کی دوسری زبانوں اور انکے ادب سے قریب رہے۔ ان میں سجاد حیدر یلدرم، عبدالرحمٰن بجنوری، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ڈاکٹر عبدالعلیم اور پروفیسر مجیب کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں (آخرالذکر روسی زبان سے واقفیت اور روسی ادب سے تعلقِ خاطر کی بنا پر) سن ۱۹۳۰ء کے بعد فرانسیسی، روسی اور بعض دوسری زبانوں کے دروازے بھی اُردو کے لئے کھل گئے۔ اب شاعری کے بجائے بلند پایہ نثری ادب کے تراجم پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ اس سلسلہ میں ترقی پسند تحریک اور بعد میں حلقہ اربابِ ذوق سے تعلق رکھنے والے ادیبوں کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جنہوں نے روسی، فرانسیسی، ترکی، اطالوی، چینی اور لاطینی امریکی ادب کے شاہکاروں سے اُردو زبان کو متعارف کرایا۔ ان میں منٹو، عزیز احمد، حامد علی خاں، شاہد احمد دہلوی، تمنائی،

محمود جالندھری، سجاد ظہیر، ابن انشاء، میراجی، قیوم نظر، مطلبی فرید آبادی، ظ۔ انصاری، اختر حسین رائے پوری، صابرہ زیدی، قرۃ العین حیدر، ڈاکٹر خلیق انجم اور انور عظیم کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ عنایت اللہ دہلوی، جلیل قدوائی، خواجہ منظور حسین، منصور احمد، نریش کمار شاد اور دوسرے بے شمار ادیبوں نے بھی ترجمہ کو ایک تخلیقی کام سمجھ کر عالمی ادب کے شاہکاروں کو اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔

جدید ہندوستانی ادیبوں میں، یوں تو ٹیگور، شرت چندر، بنکم چندر، قاضی نذر الاسلام اور چند دوسرے ممتاز ادیبوں کی تصانیف کے اردو تراجم آزادی سے پہلے ہی مقبول ہو گئے تھے۔ لیکن ہندوستانی ادب کے ترجمہ نے ایک باقاعدہ رجحان کی صورت، آزادی کے بعد ہی حاصل کی۔ حکومت نے بھی اپنے اشاعتی اداروں کے ذریعے اس رجحان کی ہمت افزائی کی۔ اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اردو میں ہندوستانی ادب کے تراجم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اردو کے طلبہ ہی نہیں اساتذہ اور ادیب بھی ہندوستانی زبانوں کے مقابلہ میں یورپی زبانوں کے ادبی رجحانات اور تحریکات سے زیادہ گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آج جب قومی اتحاد اور ذہنی یکجہتی کے لئے بے شمار تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں اس موثر اور کارگر ذریعہ کو کیوں نظر انداز کیا جا رہا ہے؟ ایسا نہیں ہے کہ مراٹھی

گجراتی، بنگالی، تامل، اڑیہ، کشمیری یا دوسری قومی زبانوں سے براہِ راست اُردو میں ترجمہ کرنے والے ادیبوں کی کمی ہو۔ ان کے سامنے مسئلہ یہی ہے کہ اگر وہ خونِ جگر صرف کرکے ترجمہ کریں تو اسے شائع کون کرے گا؟ اور کیا انھیں اپنی محنت کا کوئی صلہ مل سکے گا؟ اگر اُردو اکیڈمیاں اور دوسرے اشاعتی ادارے ہندوستانی ادب کے اُردو تراجم کی اشاعت کو ترجیحی اہمیت دیں اور اس کے لئے خاص ترغیبات پیدا کریں تو یقیناً صورتِ حال بہتر ہو سکتی ہے۔

ترجمہ کے بغیر آج کوئی زبان جدید اور ترقی پذیر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ اور ترجمہ ایک ایسا فن ہے جس پر قدرت حاصل کرنے کے لئے شوق وصلاحیت ہی نہیں مشق ومزاولت اور اصولی واقفیت بھی درکار ہے۔ اصطلاح سازی کے اصول اور طریقے، ترجمہ کے مختلف نظریئے، ترجمہ میں زبان واسلوب کے مسائل، ترجمہ کی اقسام۔۔۔۔ ان تمام پہلوؤں سے واقفیت ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی اپنی زبان میں ترجمہ کی روایت، اس کے رجحانات اور مختلف اداروں اور افراد کے ذریعہ اس کی نشو ونما کا علم بھی ضروری ہے۔ دہلی یونیورسٹی اور بعض دوسری دانشگاہوں کے اردو شعبوں نے اسی مقصد کے پیشِ نظر اُردو ترجمہ کا سندی کورس کھولا ہے۔ اور ایک علیٰحدہ پرچہ کے طور پر بھی اسے شاملِ نصاب کیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ترجمہ کے فن پر اُردو میں کوئی ایسی جامع کتاب دستیاب

نہیں جو طلبہ یا عام قارئین کی رہبری کر سکے۔ مضامین کا یہ مجموعہ کسی مستقل کتاب کا بدل تو نہیں لیکن امید ہے کہ اس سے کسی حد تک اس کمی کی تلافی ہو سکے گی اور شاید اس کے مطالعہ سے طلبہ اور اہلِ علم کو اردو ترجمہ کے سرمایہ پر تحقیق و تنقید کی ترغیب بھی ہو۔

اس مجموعہ میں شامل بیشتر مضامین ایسے ہیں جو ہماری خاص فرمائش پر ضبطِ تحریر میں آئے ہیں۔ اور ہم نے اُن ہی اہلِ نظر سے فرمائش کی ہے جن کے بارے میں ہمیں علم تھا کہ وہ اس موضوع پر نظر رکھتے ہیں یا انہوں نے اس میدان میں کچھ کام کیا ہے۔ پروفیسر آلِ احمد سرورؔ، پروفیسر محمد حسن، ڈاکٹر ظ۔ انصاری، شہباز حسین اور چند دوسرے ادیبوں کے مضامین ایسے بھی ہیں جو پہلے شائع ہو چکے ہیں اور اب ان کی اجازت سے اس مجموعہ میں شامل کئے جا رہے ہیں۔

ان مضامین کو "ترجمہ کا فن" اور "ترجمہ کی روایت" کے عنوان سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ہم ان تمام ادیبوں کے شکر گزار ہیں جنہوں نے ہماری فرمائش پر مضامین لکھنے کی زحمت گوارا کی یا اپنے مضامین شائع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ آخر میں مجھے ایک اعتراف اور کرنا ہے۔

یہ مجموعہ میں نے عزیز دوست اور ہارڈنج (ہر دیال) لائبریری کے اسسٹنٹ لائبریرین جناب بہارؔ الہ آبادی صاحب کی فرمائش اور پیہم اصرار پر ترتیب دیا ہے۔ وہ خود اہلِ قلم ہیں

اور اُردو زبان و ادب کے مسائل پر نظر رکھتے ہیں۔ اگر ان کا تعاون اور ان کے مشورے شامل نہ ہوتے اور وہ اپنی علالت کے باوجود اس کی کتابت اور طباعت کے کاموں میں ہمہ تن مصروف نہ رہتے تو شاید ابھی مدتوں یہ مسودہ اشاعت سے محروم رہتا۔ میں ان کا بھی ممنون ہوں۔

قمر رئیس
۳ مئی ۱۹۷۶ء

سی۔۱۶۶ ودیک وہار
دہلی ۳۲

وحید الدین سلیم

اصول وضع اصطلاحات

حضرات محترم! میں آپ کے حسب الحکم آج اس مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ علمی اصطلاحات جو انگریزی زبان میں ہیں، ان کے لئے اردو میں نئی اصطلاحات وضع کی جائیں، یا انھیں اصطلاحات کو بدستور قائم رکھنا چاہیے۔

جناب والا میں اس رائے کا حامی ہوں کہ یورپین زبانوں کی تمام اصطلاحات کے لیے اردو اصطلاحات وضع کرنی چاہییں۔ اس مسئلہ پر میں تیس برس سے غور کر رہا ہوں۔

میرے دلائل حسب ذیل ہیں:۔

اول یہ کہ ہم انگریزی اصطلات یا الفاظ کو اردو زبان میں صحیح طور سے نہیں لکھ سکتے۔ اس باب میں پنجاب اور بعض دیگر صوبوں میں بہت کوشش کی گئی ہے۔ مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

(دوم) یہ کہ انگریزی زبان کی اصطلاحات یا الفاظ کو اس ملک کے عام آدمی صحیح طور سے نہیں بول سکتے۔ وہ ہماری زبان اور لب و لہجہ کے لحاظ سے کرخت اور ناموزوں ہیں۔

(سوم) یہ کہ وہ الفاظِ اصطلاحی جن مادّوں سے بنائے گئے ہیں یا جن اجزاء سے مرکّب کئے گئے ہیں وہ مادّے اور وہ اجزاء اس ملک کے باشندوں کے لئے غیر مانوس ہیں اور کسی طرح گوش آشنا نہیں ہیں۔ سائی کالوجی یا نفسیات کے لحاظ سے اُن الفاظ کو یاد رکھنے میں زیادہ آسانی ہوتی ہے جن کے مادّے یا اجزاء پہلے سے مانوس یا گوش آشنا ہوں

(چہارم) یہ کہ ہم نے یونیورسٹی کے صرف چند طلباء ہی کو تعلیم دینا اپنے ذمّے نہیں لیا ہے بلکہ ہماری دلی تمنّا یہ ہے کہ علومِ جدیدہ ہمارے گھروں کے اندر داخل ہوں اور عوام کو بھی جو انگریزی زبان نہیں جانتے ان علوم تک دسترس ہو۔ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب کہ علمی اصطلاحات ہماری مادری زبان میں ہوں اور وہ ایسے مادّوں اور اجزاء سے بنائی گئی ہوں جن سے عام پڑھے لکھے آدمی پہلے سے مانوس ہوں۔

(پنجم) یہ کہ علوم جدیدہ کی تعلیم اردو زبان میں دینے سے ہمارا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اردو زبان کی ترقی اور اس کا دائرہ وسیع ہو۔ اگر ہم اردو زبان میں اصطلاحات نہ بنائیں، بلکہ انگریزی اصطلاحات بجنسہٖ اس میں داخل کریں تو اس سے زبان کی ترقی نہیں ہوگی بلکہ اس کی قدرتی خط و خال اور حسن و جمال پر پانی پھر جائے گا۔ ہر مہذب اور شائستہ زبان

ہیں ایسے الفاظ جو باہر سے آکر داخل ہوتے ہیں اور جو اس زبان کی قدرتی ساخت کے مطابق نہیں ہوتے وہ اسی لئے ناموزوں اور کرخت معلوم ہوتے ہیں اور بہ مقابلہ اُسی زبان کے اصلی الفاظ کے ہمیشہ نہایت کم ہوتے ہیں۔ اُردو زبان میں اس وقت تقریباً پچیس ہزار الفاظ شامل ہیں۔ انگریزی زبان کے علمی الفاظ اس تعداد سے بہت زیادہ ہیں۔ اگر ہم ان الفاظ کو داخل کریں گے تو ہماری زبان میں ایسا عظیم الشان انقلاب ہوگا جس کا یہ زبان کسی طرح تحمل نہیں کر سکتی۔ زبان کی ترقی کے معنی ہمیشہ یہ سمجھے گئے ہیں کہ جو نئے الفاظ زبان میں داخل ہوں وہ اُس زبان کی قدرتی ساخت اور گرامر کے مطابق بنائے گئے ہوں اور اُن کے مادّے یا اجزا حتی الامکان پہلے سے گوش آشنا اور مانوس ہوں۔

اگر کہا جائے کہ انگریزی کے الفاظ بجنسہٖ داخل نہ کئے جائیں بلکہ پہلے اردو زبان کی خراد پر چڑھائے جائیں اور ان میں تغیر و تبدل کر لیا جائے تو اُس کی نسبت بھی یہی دلیل کافی ہے کیونکہ ان الفاظ میں کیسی ہی تراش خراش کی جائے۔ اجنبیت کی بُو اُن میں ضرور باقی رہے گی اور ایسے الفاظ ہمیشہ ہر مہذب اور ترقی یافتہ زبان میں اُس زبان کے اصلی اور طبعی الفاظ کے مقابلہ میں بہت کم ہوتے ہیں۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو اس صورت میں بھی ہماری زبان میں ایسے الفاظ کی تعداد اصلی الفاظ سے بہت بڑھ جائے گی اور اس زبان کی قدرتی لطافت ملیامیٹ ہو جائے گی۔

ششم:- یہ کہ یورپ کی زبانیں ایرین ہیں اور ہماری زبان بھی ایرین ہے۔ مگر لاطینی اور یونانی زبانیں جن سے علمی اصطلاحات بنائی گئی ہے ان کو ہماری زبان سے بہت بُعد ہے۔ برخلاف اس کے یورپ کی زبانوں سے وہ بہت قریب ہیں اس لئے کہ لاطینی اور یونانی زبانوں کے ہزاروں مادّے ادل بدل کر یورپ کی اکثر زبانوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ اس بنا پر لاطینی اور یونانی زبانیں ممالک یورپ کے لئے مشترک علمی زبانیں تسلیم کی جا سکتی ہیں، مگر اردو بولنے والے ملک کے لئے وہ مشترک علمی زبانیں نہیں ہو سکتیں۔

(ہفتم) یہ کہ ہم نے اردو زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دیا ہے اور اس کے ساتھ انگریزی زبان کو لازمی رکھا ہے۔ اس طریقۂ تعلیم سے دو فائدے ہوں گے۔ پہلا فائدہ یہ ہو گا کہ ہماری یونیورسٹی کے طلبا تمام علوم کو مادری زبان میں آسانی کے ساتھ سیکھ سکیں گے اور اُن کو عوام میں جو انگریزی زبان نہیں جانتے اور جن کی تعداد بہت زیادہ ہے سہولت کے ساتھ پھیلا سکیں گے اور اس روشنی کو ہمارے گھروں کے اندر داخل کر سکیں گے۔ دوسرا فائدہ یہ ہو گا کہ انگریزی زبان جاننے کے سبب ہماری یونیورسٹی کے طلبا یورپ کی جدید تحقیقات اور معلومات پر ہمیشہ مطلع ہوتے رہیں گے۔ اُن کو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کی علمی اصطلاحیں بالمقابل معلوم ہوں گی اُن کا دلیاں ہاتھ ان کے علمی خزانوں تک پہنچ سکے گا جو یورپ کے علماء نے فراہم

کئے ہیں، اور بائیں ہاتھ سے ان خزانوں کے جواہر کو اس ملک کے عام باشندوں پر نثار کریں گے۔ غرض کہ یہ طلبا رمشرق اور مغرب کے درمیان واسطہ ہوں گے اور ایک طرف سے علمی روشنی حاصل کریں گے۔ اور دوسری طرف اس روشنی کو عوام میں پھیلائیں گے۔

اگر اس موقع پر کہا جائے کہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کی علمی اصطلاحوں سے طلبہ کے حافظہ پر بار پڑے گا تو میں کہوں گا کہ اس بار کا برداشت کرنا ناگزیر ہے اور یہ اس عظیم الشان فائدے کے مقابلہ میں بالکل ہیچ ہے جو اس طریقہ سے ہمارے ملک کو حاصل ہوگا۔ آخر ہم اب بھی اپنے طلبہ کو دو اور بعض اوقات تین زبانیں سکھاتے ہیں، مثلاً اگر وہ جانتے ہوں کہ ایک خاص قیمتی دھات کو اردو میں سونا فارسی میں زر عربی میں ذہب اور انگریزی میں گولڈ کہتے ہیں تو اس بات کی شکایت نہیں کی جاتی کہ ایک مفہوم کے لئے ان مختلف الفاظ کا جاننا اُن کے حافظہ پر بار ڈالتا ہے۔

(ہشتم) کہا جاتا ہے کہ انگریزی اصطلاحات جن معنوں کو ادا کرتی ہیں وہ معنی ہماری نئی اصطلاحات سے سمجھ میں نہیں آئیں گے، کیونکہ انگریزی اصطلاحات ایک مدت دراز کے استعمال کے بعد اپنے معنی بتانے لگی ہیں۔ نئی اصطلاحوں کو یہ بات حاصل نہیں ہوسکتی، مگر نئی اصطلاحات کے خلاف یہ اعتراض صحیح نہیں ہے۔ انگریزی اور یورپ کی دوسری زبانوں میں جو اصطلاحات موجود ہیں وہ

ہمیشہ سے نہیں پائی جاتیں۔ ہر اصطلاح ایک خاص وقت میں وضع کی گئی ہے۔ اس وقت بھی اعتراض بجنسہٖ ان اصطلاحات پر بھی ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ یورپ کی زبانوں میں اصطلاحات کا بننا رک نہیں گیا۔ ہر روز نئی اصطلاحات بنتی رہتی ہیں اور یہی اعتراض اب ان پر کیا جاسکتا ہے۔ اصلی بات یہ ہے کہ یہ کام ملک کے صیغۂ تعلیمات کا ہے کہ جو علمی الفاظ خاص معنوں کے لئے وضع کئے جاتے ہیں وہ ان الفاظ کو ان معنوں کے ساتھ رائج کرتا ہے۔ تعلیم پانے کے بعد چند ہی روز میں وہ الفاظ ہر طالب علم کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں۔ طلبا اپنی تحریر اور تقریر میں ان الفاظ کو برابر استعمال کرتے ہیں۔ پھر عام آدمی بھی ان الفاظ کو انہی معنوں میں سمجھنے لگتے ہیں۔ مثلاً پنجاب کے مدارس میں سائنس کی جو کتابیں اردو میں پڑھائی جاتی ہیں ان کے اصطلاحی الفاظ ان تمام طلبا کی زبانوں پر ہیں۔ جنہوں نے ان مدارس میں تعلیم پائی ہے۔ اس ملک کا صیغۂ تعلیمات بھی یہ کام اسی طرح انجام دے سکتا ہے جس طرح ممالک یورپ کے صیغہ ہائے تعلیمات انجام دے رہے ہیں۔ ہماری یونیورسٹی کے طلبا کی زبان اور قلم سے جب ہماری نئی اصطلاحیں نکلیں گی تو ان اصطلاحوں سے بے تکلف وہ معنی سمجھ میں آنے لگیں گے جن کے لئے وہ وضع کی گئی ہیں۔ پھر عام آدمی بھی ان کی تقلید کریں گے اور لوگوں کے گھروں میں بھی وہ اصطلاحیں جاری ہو جائیں گی یہی طریقہ

ہے جس سے اصطلاحیں اپنا مفہوم قائم کرتی ہیں ورنہ اصطلاحیں خود بخود اپنے معنی نہیں بتایا کرتیں اور لوگوں پر آسمان سے اصطلاحوں اور ان کے معنوں کے متعلق کوئی وحی نازل نہیں ہوا کرتی۔

(نہم) یورپین اصطلاحات کے حامی ان اصطلاحات کی حمایت میں ایک لطیفہ بھی بیان کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جب علوم جدیدہ کے ایجاد کرنے والے یورپ کے علماء ہیں تو جو خیالات انہوں نے ایجاد کئے ہیں یا جو معلومات انہوں نے پیدا کی ہیں ان کے نام رکھنے کا حق اُن کو اسی طرح حاصل ہے جس طرح والدین کو اپنی اولاد کے نام رکھنے کا حق ہوتا ہے اس بنا پر یورپ کی اصطلاحیں بغیر کسی تغیر و تبدل کے دوسرے ملکوں میں جاری ہونی چاہئیں۔ میں اس لطیفہ کا جواب بجز اس کے اور کچھ دینا نہیں چاہتا کہ جب کوئی یورپ کا باشندہ مسلمان ہوتا ہے تو اس کا وہ نام بدل دیا جاتا ہے جو والدین نے بچپن میں عطا کیا تھا اور ایک نیا اسلامی نام اس کو عطا کیا جاتا ہے۔

(دہم) کہا جاتا ہے کہ سب سے بڑی مشکل کیمیائی ناموں علامتوں اور ان کے فارمولوں میں ہے۔ اگر ہماری زبان میں کیمیائی نام جداگانہ رکھے جائیں تو ان کی علامتیں بھی جو ان کے ناموں کے شروع کے حرفوں کو مختصر کرنے سے مقرر کی جاتی ہیں یورپ کی کیمیائی علامتوں سے جداگانہ ہوں گی اور اس صورت میں جو فارمولے بنائے جائیں گے وہ ان فارمولوں سے الگ تھلگ ہوں گے جو یورپ کے کیمیا دانوں میں مستعمل اور

رائج ہیں۔ ایسا کرنے سے ہمارے طلبا کا رشتہ یورپ کی علمی دنیا سے باقی نہیں رہے گا اور وہ الجھن اور پریشانی میں پڑ جائیں گے اور ان کو یورپ کے کیمیائی فارمولوں کا سمجھنا جو جدید کیمیائی مرکبات کے لئے بنائے جائیں گے نہایت مشکل ہوگا میرے نزدیک یہ اشکال کچھ زیادہ اہم نہیں ہیں اور جو درجہ ان اشکال کو دیا جاتا ہے وہ اس درجہ کا مستحق نہیں ہے ہم میں سے بہت سے آدمی ہیں جو ابجد کے حرفوں کی ترتیب اور ان حرفوں کی اعدادی قیمتوں سے واقف ہیں۔ اگر ان کے سامنے کوئی تاریخ پیش کی جاتی ہے تو وہ بے تکلف اس تاریخ کے حرفوں کے اعداد اپنے ذہن میں جمع کر لیتے ہیں اور بغیر لکھنے کے وہ آپ کو زبانی طور سے وہ سنہ بتا دیتے ہیں جو اس تاریخ سے نکلتا ہے۔ ابجد کے حرفوں کی ترتیب اور ان حرفوں کی اعدادی قیمتیں تھوڑی سی مشق میں یاد ہو جاتی ہیں اور وہ ہر وقت بغیر کسی دقت کے حرفوں کو اعداد میں اور اعداد کو حرفوں میں تبدیل کر سکتے ہیں کیمیائی عناصر کے نام محدود ہیں اور ان کی علامتیں بھی محدود ہیں جو علامتیں ہم نے اپنے وضع کئے ہوئے کیمیائی ناموں کے لئے تجویز کی ہیں وہ انگریزی کیمیائی علامتوں کے ساتھ طلبا کو تھوڑی سی محنت سے یاد کرائی جا سکتی ہیں اور تھوڑی مشق اور مزاولت سے یہ بات ان کو حاصل ہو سکتی ہے کہ جب کوئی انگریزی کیمیائی فارمولہ ان کی نظر سے گذرے تو وہ اس کو اردو کیمیائی فارمولے میں تبدیل کر سکیں اور جب کوئی اردو کیمیائی فارمولہ ان کی نظر کے

سامنے ہو تو اُس کو انگریزی کیمیائی فارمولے میں تبدیل کر دیں۔ مثلاً ہیڈروجن کی انگریزی علامت H ہے جو اردو میں حفنین کی علامت ح کے ساتھ یاد کرائی جا سکتی ہے۔ اسی طرح کلورین کی انگریزی علامت CL ہے اور اُس کے مقابل اردو نام سبزین کی علامت س ہے نائٹروجن کی انگریزی علامت N ہے اس کے مقابل اردو نام شورین کی علامت ش ہے آکسیجن کی انگریزی علامت O ہے اور اس کے مقابل اردو نام مائین کی علامت م ہے۔ ایوڈین کی انگریزی علامت I ہے اور اس کے مقابل اردو نام بنفشین کی علامت ب ہے۔

گویا بمقابلہ ح بمقابلہ س بمقابلہ ش بمقابلہ م بمقابلہ ب۔ اور اسی طرح باقی علامات بالمقابل یاد کرائی جا سکتی ہیں، اور یہ تھوڑی سی محنت سے حافظہ پر نقش ہو سکتی ہیں، اور تھوڑی سی مشق سے یہ بات حاصل ہو سکتی ہے کہ فارمولوں میں ایک قسم کی علامات کو دوسری قسم کی علامات سے ہمارے طلبا تبدیل کر سکیں۔

کیمیائی فارمولوں کے لکھنے کا طریقہ ہماری زبان میں بجنسہ وہی رکھا گیا ہے جو انگریزی زبان میں ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ ہے کہ انگریزی میں میں بائیں طرف سے دائیں طرف لکھا جاتا ہے اور ہماری زبان میں دائیں طرف سے بائیں طرف اس طریقہ تعلیم سے نہ ہمارے طلبا کسی الجھن میں پڑیں گے اور نہ مغربی اصطلاحات کی انٹرنیشنلٹی (بین قومیت) کو کوئی صدمہ پہنچے گا بلکہ اس طریقہ سے بڑا فائدہ یہ ہو گا کہ کیمیائی علوم جن پر آج

کل کی صنعتوں اور حرفتوں کا مدار ہے آسان ہو کر ہمارے گھروں بے داخل
ہو جائیں گے اور عام لوگ جو انگریزی نہیں جانتے اُن کو بے تکلّف سیکھ
سکیں گے بر خلاف اس کے اگر ہم انگریزی کیمیائی مرکبات کے نام بجنسہ بنے
دیں گے اور کیمیائی عناصر کے نام اور ان کی علامات بھی وہی رہنے دیں گے
جو انگریزی میں ہیں تو ان سے کیمیائی معلومات ایک خاص طبقہ میں محدود
رہیں گی۔ جو انگریزی جانتا ہے اور ان سے اس ملک کے عام باشندے
جو انگریزی زبان سے نابلد ہیں مستفید نہیں ہو سکیں گے۔ ہماری
یونیورسٹی برخلاف ہندوستان کی دیگر یونیورسٹیوں کے اس غرض سے
قائم کی گئی ہے کہ وہ علمائے سائنس کی ایک ایسی جماعت تیار
کرے جو علوم جدیدہ کی تعلیم عام لوگوں میں پھیلائے اور ان علوم سے مستفید
ہونے کا موقع ان کے لئے بہم پہنچائے۔ اگر یہ مقصد ہماری یونیورسٹی کا تسلیم
نہ کیا جائے تو پھر ہماری یونیورسٹی اور ہندوستان کی دیگر یونیورسٹیوں میں
کوئی فرق نہیں رہتا۔ یہ کام یعنی چند ایسے طلبہ کا مہیّا کرنا جو خود تو علومِ
جدیدہ سے واقف ہوں مگر اپنے عام ہم وطنوں تک اُن کی روشنی کو
نہ پہنچا سکیں، ہندوستان کی تمام یونیورسٹیاں انجام دے رہی ہیں۔
اُن کے ہوتے اس یونیورسٹی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر یورپ کی صرف
وہ اصطلاحیں قائم رکھی جائیں جو کیمیا یا کسی خاص علم کے متعلق ہیں
اور باقی علوم کی نسبت اجازت دی جائے کہ اُن کی اصطلاحات کے
مقابل اردو اصطلاحیں وضع کر لی جائیں تو یہ اُس یکسانیت کے

خلاف ہوگا جو علوم میں درکار ہے اس صورت میں ایک طرف تو ایک علم یا چند علوم کی اصطلاحیں ہمارے یہاں انگریزی کی ہوں گی جن کے سمجھنے میں دقّت ہوگی اور جو ہماری زبانوں پر مشکل سے چڑھیں گی اور دوسری طرف علوم کی وہ اصطلاحیں ہوں گی جن کے الفاظ کے مادّے اور اجزا ہمارے لئے مانوس اور گوش آشنا ہوں گے۔ کیا ہمارے اس طریقۂ تعلیم پر "آدھے تیتر آدھے بٹیر" کی مثل صادق نہیں آئے گی؟ اگر دوسری صورت یہ اختیار کی جائے کہ تمام اصطلاحات انگریزی سے لی جائیں اور وہ بجنسہٖ اردو میں رائج کی جائیں تو وہ تمام دشواریاں پیش آئیں گی جن کو میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ کیا ان مشکلات سے بچنے کا یہی آسان طریقہ نہیں ہوگا کہ ہم اردو زبان کو ذریعہ تعلیم نہ قرار دیں بلکہ انگریزی زبان ہی میں اُن علوم کی تعلیم اپنے طلبا کو دیں۔ اس حالت میں بھی ہماری یونیورسٹی کا وجود محض بیکار ہوگا اور اس مطلب کے لئے ہندوستان کی دیگر یونیورسٹیاں کافی خیال کی جائیں گی۔

(یازدہم) جدید اصطلاحات کے برخلاف ایک اور بات بھی سُنی جاتی ہے۔ مغربی اصطلاحات کے حامی کہتے ہیں کہ کیمیا دانوں نے جو نام کیمیائی چیزوں کے رکھے ہیں انھیں ناموں سے وہ چیزیں بازار میں مل سکتی ہیں۔ اگر ان چیزوں کے نئے نام لیے جائیں تو ان کو تاجر اور دوکان دار نہیں سمجھیں گے اور تجارت میں مشکلات پیش آئیں گی

مگر یہ اعتراض بھی صحیح نہیں ہے۔ ہزاروں چیزیں اب بھی ایسی موجود ہیں جن کے نام انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں ہیں جب ہم یورپ سے وہ چیز طلب کرتے ہیں تو مطالبہ کی درخواست انگریزی زبان میں ہوتی ہے اور اس میں وہی نام استعمال کئے جاتے ہیں جو انگریزی میں رائج ہیں۔ برخلاف اس کے جب ہم اُن چیزوں کو اپنے ہم وطنوں کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں تو اُن کے وہ نام لیتے ہیں جو ہماری زبان میں ہیں۔ ہماری جدید اصطلاحات جب طلبا کے ذریعہ سے عام اور رائج ہو جائیں گی تو ہمارے تاجر اور دُکاندار بھی ان ناموں سے رفتہ رفتہ واقف ہو جائیں گے اور ان کو آسانی سے یاد کر لیں گے انگریزی نام اُن کو تجارتی ضرورت نے یاد کرائے ہیں یہی تجارتی ضرورت ان کو مجبور کرے گی کہ جو نئے نام اشیار کے ہماری زبان میں رکھے گئے ہیں ان پر وہ اطلاع حاصل کریں اور گاہکوں کو اپنی دوکان سے ناکام نہ جانے دیں۔ بازار کی یہ مشکلات بس اسی وقت تک باقی رہیں گی جب تک کہ ہمارے بنائے ہوئے نام عام اور رائج نہ ہوں، ان کے عام اور رائج ہونے کے بعد پھر کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔

(دوازدہم) بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ جاپان میں یورپ کی علمی اصطلاحوں کو جاپانی زبان میں تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اُس میں جاپانیوں کو ناکامی ہوئی ہے۔ مجھے اس واقعہ کا صحیح علم نہیں ہے اگر یہ بات صحیح ہے تو میں اس ناکامی کے معنی نہیں سمجھا اگر جاپانیوں نے

یہ کوشش کی ہو گی کہ اُن کی بنائی ہوئی اصطلاحوں کو جو انگلیس کی زبانوں میں بھی یورپ کے لوگ اختیار کریں تو اس میں ذرا شبہ نہیں ہے کہ اُن کو ضرور ناکامی ہوئی ہو گی۔ لیکن اگر انھوں نے اپنی زبان کی اصطلاحات کو اپنے ہی ہموطنوں میں پھیلانا چاہا ہو گا تو اس میں ناکام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ کام جاپان کا صیغۂ تعلیمات نہایت آسانی سے انجام دے سکتا تھا۔ اسی ذیل میں مصر اور شام کی ناکامی کا ذکر بھی کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ مصریوں اور شامیوں نے مجبور ہو کر یورپ کی علمی اصطلاحوں کو عربی زبان میں معرّب کر لیا ہے اور وہ اپنی خاص اصطلاحات اُن اصطلاحات کے مقابل قائم نہیں کر سکے۔ یہ ناکامی دوسری قسم کی ہے علمی زبان میں جہاں بہت سے مفرد مادّوں کی ضرورت پیش آتی ہے وہاں اس بات کی ضرورت ہے کہ ان مفرد مادّوں کو مرکب کر سکیں اور ان مرکّبات کی گردان کر کے اُن سے اور نئے نئے مشتقات پیدا کر سکیں۔ یہ قابلیت ایرین زبانوں میں ہے۔ شامی زبانوں میں جن میں سے ایک عربی ہے یہ لچک نہیں ہے۔ اس بنا پر مصری اور شامی یورپ کی اصطلاحات کے مقابلہ میں عربی زبان کی اصطلاحات وضع نہ کر سکے برخلاف اس کے ہماری زبان "اردو" ایرین ہے اس میں وہ تمام طریقے مفرد اور مرکب الفاظ وضع کرنے کے موجود ہیں جو یورپ کی زبانوں میں ہیں۔ اور اُس میں علمی زبان بننے کی قابلیت موجود ہے۔ اگر ہم اس لچک سے کام لیں جو قدرتی طور سے ہماری زبان میں موجود ہے تو ایک

دن ہماری زبان یورپ کی ترقی یافتہ علمی زبانوں کی ہمسری کرے گی۔ اس خاص مسئلہ پر میں نے ایک بسیط کتاب لکھی ہے جو اس وقت میرے ہاتھ میں ہے۔ اس میں اردو زبان کی قدرتی بناوٹ پر بحث کی گئی ہے وہ تمام طریقے تفصیل کے ساتھ مع مثالوں کے درج کئے گئے ہیں جو مفرد اور مرکب الفاظ وضع کرنے کے ہمارے اسلاف نے ہم کو بتائے ہیں پھر انہیں طریقوں کو پیش نظر رکھ کر مفرد اصطلاحات اور مرکب اصطلاحات بنانے کے قاعدے شرح وبسط سے بیان کئے گئے ہیں۔

اس موقع پر یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ کروڑں باشندے جو اردو زبان بولتے یا سمجھتے ہیں اُن کی نظریں آپ کی طرف اٹھی ہوئی ہیں صدیوں کے بعد ایک نادر موقع ملا ہے کہ آپ اردو زبان کو علوم جدیدہ کے لئے ذریعۂ تعلیم قرار دیں اور ایک ایسی جماعت طلبا کی تیار کریں جو ایک طرف تو انگریزی زبان جاننے کی وجہ سے یورپ کے علوم سے اور یورپ کے علما کی نئی تحقیقات سے بے تکلف مطلع ہو سکیں اور دوسری طرف اپنے ہموطنوں کو جو انگریزی زبان نہیں جانتے ان علوم کی قدیم وجدید تحقیقات سے فیض یاب کر سکیں۔ اور علم کو بادلوں سے اتار کر ہمارے گھروں کی چار دیواری میں داخل کر سکیں۔ پھر یہ موقع بھی آپ کو حاصل ہے کہ اردو زبان کی پیشانی پر علمی لحاظ سے مفلس ہونے کا جو داغ نمایاں ہے اس کو اپنے مبارک ہاتھوں سے مٹا سکیں اور اس زبان کے دائرہ کو وسیع کر کے اس کو ترقی کے اس بلند درجہ پر پہنچا سکیں جس کا حق اس کو

اپنی قدرتی بناوٹ اور طبعی لچک کی وجہ سے حاصل ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہنا چاہیئے کہ جو خواب سر سید مرحوم، نواب محسن الملک مرحوم، نواب وقار الملک مرحوم اور ہماری قوم کے دیگر بزرگوں نے دیکھا تھا اس خواب کو سچا کر دکھانا اور اس کی تعبیر کا نمایاں کرنا آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ہماری تمام قوم اس وقت گردنیں اٹھائے آپ کی طرف نہایت اشتیاق اور اضطراب سے دیکھ رہی ہے کہ آپ اس نادر موقع سے کیا کام لیتے ہیں اور ہماری قوم کے علمی مستقبل اور اردو زبان کی قسمت کی نسبت آپ کیا فیصلہ صادر فرماتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ آپ حضرات کے نام ہماری قوم کے آئندہ تاریخی صفحات پر زرّیں حروف میں لکھے جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ آئندہ نسلیں جو کسی کی رعایت نہیں کریں گی اور اپنی رائے دینے میں آزاد ہوں گی، آپ کی نسبت دوسرا فتویٰ دیں غرض کہ یہ سب کچھ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

آخر میں اگر گستاخی نہ خیال کی جائے تو میں یہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس بات کا فیصلہ کہ انگریزی زبان کی علمی اصطلاحات اردو زبان میں بجنسہٖ قائم رکھی جائیں، یا ان کے مقابل اردو اصطلاحات وضع کی جائیں، پہلے کئی بار غلبہ آرا سے ہو چکا ہے اور وہ فیصلہ یہ تھا کہ انگریزی زبان کی علمی اصطلاحات کے مقابل اردو زبان میں اصطلاحات وضع کی جائیں، اس سے علم کیمیا یا کوئی دوسرا علم مستثنیٰ نہیں کیا گیا تھا۔ اسی فیصلہ کی بنا پر اب تک کام ہوتا رہا ہے اور کام کا ایک معتدبہ حصہ انجام پا چکا ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور

تراجم اور اصطلاح سازی کے مسائل

زبان کی سہولت کے لیے تین قسمیں کی جا سکتی ہیں۔ ایک کاروباری زبان جس میں اپنا مطلب کسی طرح نکالنا ہوتا ہے۔ جس میں معنی کی ایک ہی سطح پر توجہ ہوتی ہے جس میں منطقی ترتیب بہتر لفظ یا موزوں ترین لفظ کی قید نہیں ہے یہ زبان اسم، صفت یا فعل کے سیدھے سادے استعمال سے کام چلاتی ہے۔ دوسری قسم ادبی زبان کی ہے جس میں لفظ کا تخلیقی استعمال شاعری میں اور تعبیری استعمال نثر میں ہوتا ہے۔ ادبی زبان میں ماورائے سخن بھی بات ہوتی ہے۔ زبان تشبیہہ، استعارے، علامت اور رمز و ایما کی وجہ سے گنجینۂ معنی کا طلسم ہوتی ہے یہاں "کیا کہا گیا ہے" سے زیادہ "کیسے کہا گیا ہے" پر توجہ ہوتی ہے بقول ڈرائڈن میرے یہاں الفاظ پر رنج کا ایک منظر سامنے آتا ہے کیونکہ لفظ ایک پہلودار ہیرے کی طرح بہت سی شعاعیں دیتا ہے اور ایک سے زیادہ معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں پیچیدگی، ابہام، اندیشہ ہائے دور دراز کی کافی گنجائش ہے تیسری قسم علمی زبان کی ہے جس سے ہمیں اس وقت بحث ہے۔ علمی زبان میں اظہار منطقی ہوتا ہے، حقیقی مفہوم ادا کرنے پر توجہ ہوتی ہے۔ کاروباری زبان میں سیدھے سادے خیال اور فوری مطلب کو ادا کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ علمی زبان میں پیچیدہ سے پیچیدہ خیال کو اس طرح ادا

کیا جاتا ہے کہ وہ ذہن میں روشنی کر دے۔ مہذب زبان کی یہی پہچان ہوتی ہے کہ وہ ادبی اظہار اور علمی اظہار دونوں کے لئے سرمایہ رکھتی ہو۔ کاروباری اظہار تو زبان کی ابتدائی حالت میں بھی کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتا ہے۔

مشرقی زبانوں کی ایک خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ جذباتی اظہار پر تو پوری طرح قادر ہیں مگر ذہنی اظہار کے لئے انھیں ابھی بہت ترقی کرنا ہے گویا ادبی اظہار کے علاوہ علمی معیار سے بہت ترقی کی گنجائش ہے۔ ایک زمانے میں شاعری علوم کی زبان بھی تھی مگر رفتہ رفتہ اس نے اپنے مخصوص کردار کو پہچان لیا۔ اب مغرب میں کوئی تاریخ نظم نہیں کرتا نہ منظوم جغرافیہ لکھتا ہے۔ نہ نفسیات اور معاشیات کے مسائل نظم کرتا ہے۔ شاعری فرد کے جذبے کی ترجمان بن گئی اور نثر اس کے ذہن کی۔ علمی نثر کی ترقی اسی میلان کا نتیجہ ہے اس ترقی نے شاعری کو بھی فائدہ پہنچایا ہے کیونکہ ادبی اظہار و علمی اظہار الگ راستوں پر گامزن ہونے کے باوجود در دروازوں اور پگڈنڈیوں کے ذریعے ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ مشرقی زبانوں میں علمی اظہار کی کوئی روایت نہیں ہے یا علمی زبان بہت کم ملتی ہے، خود اردو کو ہی لے لیجئے اس میں علمی نثر انیسویں صدی کے وسط سے ملنے لگی ہے۔ اور سر سید اور ان کے رفقا کے ہاتھوں اسے بڑی ترقی ہوئی۔ مگر اس میں شک نہیں کہ علمی زبان پر ادبی زبان و اسالیب کا اثر زیادہ رہا ہے۔ چنانچہ آج علمی نثر کی تعریف کرتے وقت اس کی سلاست، شگفتگی، روانی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور کبھی کبھی تو یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اس میں افسانے کی سی دلچسپی ہے۔

اس وجہ سے ضرورت ہے کہ ہم سب سے پہلے علمی نثر کی ضروریات پر کچھ غور

کرلیں کیونکہ علمی نثر کو فروغ دینا ہے اس فروغ کا مقصد صرف معلوماتی ادب کا ایک ذخیرہ مہیا کرنا ہی نہیں۔ خیال اور ذہن کو تقویت دے کر زیادہ سے زیادہ پیچیدہ مفاہیم اور نازک ترین کیفیتوں کے اظہار پر قدرت حاصل کرنا اور اس زبان کو وسعت اور جامعیت عطا کرنا ہے۔ علمی نثر کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ مشکل ہو یا آسان، بجمی لے رکھتی ہو یا سندی۔ علمی نثر علم کے مطالب کے اظہار کے لئے ہوتی ہے۔ جہاں علم کے مبادیات عام فہم زبان میں بیان کرنا ہیں وہاں وہ آسان ہو گی تو اس کے ساتھ موٹی موٹی باتوں پر اکتفا کرلے گی، جہاں وہ اس علم کے اسرار و رموز پر روشنی ڈالے گی۔ وہاں اس کا فرض اتنا ہی ہو گا کہ وہ سچ اور صرف سچ بولے اور پوری بات کہے۔ اسی لئے اصطلاحات سے اسے لازمی طور پر کام لینا پڑے گا۔ اس کا مقصد معلومات عطا کرنا ہو گا جذبات سے اپیل نہیں۔ علوم کی بہت سی قسمیں ہیں۔ انھیں سہولت کے لئے تین خانوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ قدرتی علوم جیسیں طبعی علوم اور حیاتیاتی علوم آتے ہیں۔ سماجی علوم جن میں سیاسیات، اقتصادیات نفسیات، لسانیات، جغرافیہ، تعلیم آتے ہیں۔ تاریخ کو بھلے انسانی علوم ——————

(Humanities.) —————— میں شامل کیا جاتا ہے —————— انسانی

علوم میں فلسفہ، فنونِ لطیفہ اور ادبیات آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قدرتی علوم میں سے طبعیاتی علوم میں نثر کی زبان خالص معلوماتی ہوتی ہے اور اس کا نصب العین ریاضی کی طرح قطعیت حاصل کرنا ہوتا ہے حیاتیاتی علوم میں انواع کے رشتوں کی تفصیل اور ارتقا کی منزلوں کی تشریح کے سلسلے میں بیانیہ انداز کی وہ وضاحت بھی ضروری ہے جس میں ایک خوشگوار پہلو ہو سکتا ہے۔ مگر اسے کسی طرح نمایاں نہ ہونا چاہئے۔ اجتماعی علوم کے سلسلے میں معلومات ہی کا معاملہ نہیں یہاں رشتوں کی پیچیدگی کے علاوہ اسباب و علل کے

سلسلے کو بھی ذہن میں رکھنا ہوتا ہے ۔ قوموں کی تقدیر، اسرار امم، نفسیات کی بھول بھلیاں، سماج کی پیڑھیاں، کسب زر کی داستان، مختلف خطوں کی آب وہوا کا طبائع اور نفسیات پر اثر، غرض سماجی علوم میں چونکہ صرف معلومات کا سوال نہیں بلکہ معلومات کی ترتیب بنیادی اور فروعی مسائل کی تشریح اور مختلف نظریات کے تحت ان کی اہمیت سے بحث ہوتی ہے اس لئے سماجی علوم میں نثر کا کام قدرتی علوم سے زیادہ مشکل ہو جاتا ہے پھر یہ بھی کہ قدرتی علوم میں زیادہ تر ایک نظریے کے مطابق اظہار خیال ہوتا ہے ۔ سماجی علوم کے معاملے میں نظریوں کی کثرت ہے ۔ قدرتی علوم کے سلسلے میں مکمل معروضیت ممکن ہے سماجی علوم کے سلسلے میں اس کی کوشش ضروری ہے مگر شخصی نظر یا داخلی انداز کا دخل بھی ہو ہی جاتا ہے جس کی وجہ سے جذبے کی زبان کو کچھ بار مل جاتا ہے ۔ مگر نصب العین یہاں معروضیت ہے ۔ انسانی علوم میں فلسفہ علم کی وہ شاخ ہے جہاں مجرد تصورات سے بحث ہے ، جلووں کی کثرت میں ایک وحدت دیکھنے کی سعی ہے یا دوسرے الفاظ میں ایک نظام فکر بنانے یا ایک ذہنی محور پانے کی جستجو، اس لئے فلسفے کی بنیاد منطق پر ہے اور استدلال اس کا طریقۂ کار ہے ۔ برٹرنڈ رسل نے کہا ہے کہ شوپنہار، نٹشے اور برگساں کو خالص فلسفی اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے یہاں ادبیت بھی در آئی ہے ۔ یعنی ان کی بظاہر طاقت دراصل ان کی کمزوری ہے ۔ کانٹ کے متعلق یہ بات نہیں کہی جاسکتی ۔ ادبیات کے سلسلے میں ادبی تنقید علوم کے ذیل میں آتی ہے اس لئے جدید دور میں اسے زیادہ سائنٹفک بنانے پر زور دیا گیا ہے لیکن چونکہ یہ بہرحال ادب کی ایک شاخ ہے اس لئے اور سائنسی ہوتے ہوئے بھی ادبی اظہار سے اپنا رشتہ توڑ نہیں سکتی، ہاں تاثرات کی دلدل سے اسے ضرور نکلنا ہے ۔

اس تمہید کا مقصد یہ ہے کہ ہم علوم کی زبان کی خصوصیات کو ہی ذہن میں رکھیں ،

معلومات دینے کو سب سے زیادہ اہمیت دیں، پھر منطقی ترتیب، معروضیت اور ایک غیر جانب دار زبان کو جو جذبے کی گرمی یا شخصیت کے لمس سے بڑی حد تک آزاد ہو۔ ان اصولوں کی روشنی میں ہمیں تراجم اور تصانیف کے کام کو آگے بڑھانا ہے۔

ترجمے کے کام کو اب تک تصنیف کے مقابلے میں عام طور پر حقیر سمجھا گیا ہے۔ یہ بہت غلط میلان ہے ترجمے کی اہمیت کسی طرح تخلیق سے کم نہیں۔ ترجمے میں تخلیق کو از سر نو پانا ہوتا ہے اس لئے امریکہ میں ترجمے کے لئے دوبارہ تخلیق (Recreation) کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ترجمے کے ذریعے سے ہم دوسری زبانوں کے افکار و اقدار سے آشنا ہوتے ہیں۔ ایک فاضل کے الفاظ میں مترجم کا کام صرف لسانیاتی نہیں بشریاتی (Anthropological) بھی ہے یعنی اسے صرف اصل زبان (Scurce Language) سے ہی واقفیت نہیں ہونی چاہئے، اسے اس زبان کی تہذیب اور معاشرے سے بھی آشنا ہونا چاہئے۔ اس کی دو مثالیں دینا ضروری ہیں تاکہ بات واضح ہو جائے۔ دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ کے لئے روم کی تاریخ کے ترجمے میں ——— (Papal Bulls) کا ترجمہ پاپائی سانڈ کیا گیا تھا۔ اردو کے ایک ممتاز ادیب نے اپنی کتاب میں شکسپیر کے ایک ڈرامے (As you Like it) سے ژاک کی ایک تقریر کا حوالہ دیا۔ اس میں لفظ Humour کا ترجمہ مزاح کیا گیا تھا۔ حالانکہ یہاں طبی اصطلاح خلط مراد ہے۔

مغرب کی رومانی تحریک میں مشرقی ادب کے تراجم کا بڑا اثر ہے جدیدیت کی تحریک میں چین اور جاپان کی شاعری کے تراجم کا بھی دخل ہے۔ ہندوستان کی نشاۃ الثانیہ مغربی ادب کے تراجم براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہماری علمی نثر اور جدید نظم دونوں

مغربی تراجم کے سہارے آگے بڑھے ہیں اس لئے ترجمے کی اہمیت کسی طرح تخلیق یا تصنیف سے کم نہیں یہ تخلیق کے لئے بھی نئے زمین و آسمان دیتا ہے اور علمی موضوعات پر تصانیف کے لئے بھی ذہنی غذا مہیا کرتا ہے یہاں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ علمی کتابوں کے ترجمے میں آزاد ترجمے یا اصل خیال کو اپنے الفاظ میں بیان کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہاں وہی بات ہے کہ خوب ہو ورنہ مقدس صحیفے کو ہاتھ نہ لگائیے یہاں صرف لفظی ترجمے اور مطابق اصل ترجمے یعنی (Literal and Faithful) پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ لفظی ترجمے میں لسانیات کی رو سے ایک متنی اظہار کو دوسرے متبادل متنی اظہار میں منتقل کرنا ہوتا ہے لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ترجمہ صرف لسانیاتی عمل نہیں لشریاتی عمل بھی ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ مطابق اصل کو ترجیح ہونی چاہئے کیونکہ ہر زبان کی صرفی و نحوی خصوصیات علیحدہ ہوتی ہیں خصوصاً انگریزی ترجمے میں تو لفظی ترجمہ مضحکہ خیز ہوتا ہے! اسی لئے مطابق اصل کے معنی یہ ہوتے کہ اصل زبان کے متن کو ترجمے کی زبان کے ایسے الفاظ میں ڈھالا جائے جو ترجمے کی زبان کی جی نی اس (GENIUS) کے مطابق ہوں مگر اصل زبان کے مفہوم کو زیادہ ظاہر کرنے پر قادر ہوں یوں تو ایلیٹ نے یہ بھی کہا ہے کہ "کسی زبان کی شاعری کا ترجمہ دوسری زبان میں ناممکن ہے۔" مگر ترجمے ہوتے ہیں اور ان کے اثرات بھی پڑے ہیں۔ ترجمے کو جوتوٹ نے ایک مفاہمہ کہا ہے۔ یہ مفاہمہ بہر حال کبھی زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ کبھی کم۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ ترجمہ نہیں ہو سکتا یا ترجمہ نہیں کرنا چاہئے۔ جہاں تک ادب العالیہ یا علمی سرمایے کے ترجمے کا سوال ہے۔ اس سلسلے کی افادیت میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں مطابق اصل ترجمے پر زور دیا جا سکتا ہے۔ اس ترجمے کے لئے چند شرائط ہیں۔ مترجم اس موضوع سے واقفیت رکھتا ہو اور اپنی زبان کے سرمایے

پر بھرپور نظر کے علاوہ اصل زبان سے بھی اچھی طرح واقف ہو اگر وہ موضوع سے واقف ہے اور اصل زبان سے بھی بڑی حد تک آشنا ہے مگر اپنی زبان کے سرمایے پر اس کی نظر نہیں ہے تو وہ جابجا ٹھوکریں کھائے گا۔ اس کی زبان اکھڑی اکھڑی ہو گی۔ اور اس کا ترجمہ پڑھنا ایسا ہو گا جیسا ناہموار راستے سے گزرنا۔ اگر وہ اپنی زبان پر عبور رکھتا ہے مگر اصل زبان سے اس کی واقفیت محدود ہے تو ظاہر ہے اور بھی خطرناک صورت پیدا ہو جائے گی، پھر علوم کے تراجم میں زبان یا زبانیں جاننے سے بھی مقدم اس علم سے واقفیت ہے اس لئے بھول کر بھی صرف زبان پر یا زبانوں پر عبور کی وجہ سے ترجمے کا کام کسی کو نہ دینا چاہئے۔ موضوع سے واقفیت بنیادی شرائط ہے۔ اس کے بعد اصل زبان سے اور پھر اپنی زبان سے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈیٹ رایٹ (امریکہ) کی Mass Translation Project میں یہ طریقہ بتایا گیا ہے۔

Transiator- Quality Control-Tecnnieal Editor- Language Editor,

مترجم معیار کا نگراں، ٹکنیکل ایڈیٹر زبان کا ایڈیٹر۔ اس لئے میری رائے میں ترقی اردو بورڈ کو خالص علمی کتابوں کے ترجمے میں پہلے تو موضوع کے ماہر کا انتخاب کرنا چاہئے اس کے بعد ترجمے کے معیار کو پرکھنے کے لئے ایک دوسرے ماہر کو کتاب دکھانا چاہئے جسے تراجم کا بھی تجربہ ہو اس کے بعد ٹکنیکل ایڈیٹر سے مدد لینا چاہئے جو نہ صرف یہ دیکھے کہ مواد کی ترتیب، اعداد و شمار چارٹ وغیرہ درست ہیں۔ آخر میں زبان کے ماہر کی نظر بھی ضروری ہے تاکہ ترجمہ زبان کی بچی نی اسی، کے مطابق ہو اور الفاظ کی نشست اور جملوں کی ساخت اجنبی نہ معلوم ہو۔ علمی کتابوں کے ترجمے کے لئے اردو میں اچھے نمونے موجود ہیں۔ مرزا ہادی رسوا، عبدالباری

خلیفہ عبدالحکیم، عبدالماجد سالک، فلسفۂ جذبات اور مکالمات پر کلنے والے مولانا عبدالماجد، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، سید ہاشمی فرید آبادی، عزیز احمد اختر رائے پوری امتیاز علی تاج، لطیف الدین احمد، مبارزالدین رفعت، رحم علی الہاشمی نے قابل قدر ترجمے کیے ہیں۔ پھر بھی انھیں حرف آخر سمجھنا غلط ہوگا۔ ترجمے کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ اصل میں کمی بیشی نہ کی جائے۔ یورپ میں ایک بین قومی جماعت ہے جس کا نام FIT ہے یعنی "انٹرنیشنل فیڈریشن آف ٹرانسلیٹرس" اس نے مترجموں کا ایک چارٹر مرتب کیا ہے اس کی ایک دفعہ میں کہا گیا ہے کہ "مشکل فقروں کو مختصر کرنا یا انھیں خارج کر دینا غیر اخلاقی بات ہے" اس کے چند اور اصول قابل ذکر ہیں۔ ایک تو اصل زبان کے بجائے کسی درمیانی زبان کے ذریعے سے ترجمہ ایک ایسا مفاہمہ ہے جو غیر تسلی بخش ہے۔ دوسرے "نظم کا نثر میں ترجمہ فن پارہ کہلانے کا مستحق نہیں ۔۔۔ تیسرے "اسٹائل اور فارم کے معاملے میں عملی طریقہ کار کو اپنانا چاہئے مثلاً اصل زبان میں اگر کوئی ذو معنی لفظ ہے تو اس کا لفظی ترجمہ مناسب نہیں۔ یہاں اسی سے ملتا جلتا ترجمے کی زبان کا لفظ ہونا چاہئے جس میں یہی رعایت ہو ۔۔۔۔

اب میں چند مشہور ترجموں سے مثالیں دے کر یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ان کو نظر انداز کرنے سے کیا خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

ارسطو کی کتاب "فنِ شاعری" (Poetics) یا "بوطیقا" مغربی تنقید کا صحیفۂ اول کہی جا سکتی ہے۔ آج تک مغربی تنقید میں اس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرے پر بحث ہوتی ہے۔ اور اسی سے برابر نئے معانی اور مطالب نکالے جاتے ہیں یہ ان بنیادی کتابوں میں سے ہے جس کا ترجمہ دنیا کی قریب قریب ہر زبان میں

موجود ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ عزیز احمد نے ۱۹۴۱ء میں کیا تھا۔ عزیز احمد کا ترجمہ عام طور پر اچھا ترجمہ سمجھا جاتا ہے مگر ارسطو کی ٹریجڈی کا ترجمہ ملاحظہ کر کے آپ خود فیصلہ کیجیے۔ پہلے انگریزی ترجمہ ملاحظہ کیجیے پھر عزیز احمد کا ترجمہ پھر اس پر تنقید اور آخر میں میرا ترجمہ

"Tragedy, then, is an imitation of an action that is serious, complete, and of a certain magnitude; in language embellished with each kind of artistic ornament, the several kinds being found in separate parts of the play; in the form of action, not of narrative, through pity and fear, effectings the proper purgation of these emotions"

BUTCHER

"ٹریجڈی نقل ہے کسی ایسے عمل کی جو اہم اور مکمل اور ایک مناسب عظمت (طوالت) رکھتا ہو جو مزین زبان میں لکھی گئی ہو۔ جس سے حظ حاصل ہوتا ہو لیکن مختلف حصوں میں مختلف ذریعوں سے جو درد مندی اور دہشت کے ذریعے اثر کر کے ایسے ہیجانات کی صحت واصلاح کرے"

اردو میں اوقاف کا استعمال کم ہی ہوتا ہے۔ عزیز احمد نے صرف ایک "کاما" اور "وقفے" کا استعمال کیا ہے۔ حالانکہ انگریزی میں "کاما" اور "کولن" کا استعمال ہے۔ جملہ ایک ہی ہے۔ عزیز احمد نے ایک جملے کا ترجمہ چار جملوں میں کیا ہے اور بعض ضروری الفاظ چھوڑ دیئے ہیں۔ بعض الفاظ کے ترجمے سے بھی میں متفق نہیں ہوں ——

" Serious " کا ترجمہ " اہم " کے بجائے " سنجیدہ " ہونا چاہئے تھا۔
" Magnitude " کے لئے اردو میں سامنے کا لفظ " حجم " موجود ہے
اس کے لئے مناسب عظمت اور پھر " قوسین " میں " طوالت " لکھنا غیر ضروری تھا
مزین زبان کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ جس سے حظ حاصل ہو ــــــــــ
" In the form of action not of narrative " کا ٹکڑا جو بہت اہم ہے
چھوڑ دیا گیا ہے پھر " Katharsis " یا " Purgation " کے لئے ایک
لفظ کے بجائے دو لفظ " صحت و اصلاح " ہیں اس لئے میرے نزدیک نہ تو اس شکل میں
مطابق اصل ترجمہ ہے نہ لفظی ترجمہ بلکہ ادھورا اور ناقص ترجمہ ہے اس سے اصل کی
روح مجروح ہوتی ہے۔ میرے نزدیک انگریزی عبارت کا ترجمہ کچھ اس قسم کا ہونا چاہیے

" بس ٹریجڈی ایک ایسے عمل کی نقالی ہے جو سنجیدہ، مکمل اور مناسب
حجم کا ہو، جس کی زبان ہر قسم کی نئی آرائش سے مزین ہو اور (آرائش)
کی) یہ قسمیں کھیل کے مختلف حصوں میں پائی جاتی ہوں۔ یہ عمل کے روپ
میں ہو نہ کہ بیانیہ کے، اور رحم اور خوف کے ذریعے سے جذبات
کا تنقیہ کرے "

تنقیہ کے علاوہ ایک اور لفظ بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ " تزکیہ " فرق یہ ہے
کہ تنقیہ طب کی اصطلاح ہے اور تزکیہ تصوف کی۔ تنقیہ میں فاسد مادے کے خارج
ہونے اور پھر جسم کے نظام کے صحت پانے کا مفہوم موجود ہے۔ تزکیہ میں رفعت اور پاکی
کا مفہوم ہے۔ صحت و اصلاح سے وہ مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ جو میرے نزدیک ــــ
" Katharsis " رکھتا ہے۔

بہر حال یہ تو واضح ہو ہی گیا کہ بنیادی کتابوں کے متن کا ترجمہ قطعی طور پر مطابق اصل ہونا چاہئے۔ اس میں تبدیلی کی گنجائش ہے نہ اضافے کی نہ کسی لفظ یا فقرے کو حذف کرنے کی، اس لئے اردو میں "فنِ شاعری" کے ایک اور ترجمے کی ضرورت ہے۔ اور اس کے لئے عنوان "بوطیقا" جیسے ثقیل عربی لفظ کی بجائے صرف "فنِ شاعری" یا "شعریات" لکھنا کافی ہوگا۔ جمیل جالبی نے ایلیٹ کے کچھ مضامین کا ترجمہ کیا ہے جس کی عام طور پر تعریف کی گئی ہے۔ ایلیٹ کے مضمون Tradition & Individual Talent کے ایک اقتباس اور جالبی کے ترجمے پر غور کیجئے۔ دیکھیں آپ کے پلے کیا پڑتا ہے۔

'I am alive to a usual objection to what is clearly part of my programme for the metier of poetry. The objection is that the doctrine requires a ridiculous amount of erudition (Pedantry), a claim which can be rejected by appeal to the lives of poets in any pantheon. It will even be affirmed that much learning deadens of perverts poetic sensibility'.

"میں اس عام اعتراض سے واقف ہوں جو شاعری کے پیشے کے سلسلے میں میرے پروگرام کا ایک حصہ ہے اعتراض یہ ہے کہ نظریے کے لئے مضحکہ خیز حد تک تبحر علمی اور اصول پرستی کی ضرورت پیش ہے جو ایک ایسا دعویٰ ہے جسے شاعروں کے حالاتِ زندگی پر نظر ڈالنے ہی سے

ردکیا جاسکتا ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلے گا کہ زیادہ علمیت شاعرانہ احساس وادراک کو کند کردیتی ہے یا روک دیتی ہے"۔ ۴۳-۱۴۲

پہلے جملے کا ترجمہ بالکل غلط ہے۔ ترجمہ یہ ہونا چاہئے "میں اس عام اعتراض سے واقف ہوں جو شاعری کے پیشے کے سلسلے میں میرے پروگرام کے ایک حصے پر کیا جاتا ہے" اب دوسرا جملہ لیجئے: "اعتراض یہ ہے کہ نظریے کے لئے مضحکہ خیز حد تک تبحر علمی (اور اصول پرستی) کی ضرورت پڑتی ہے! درحقیقت ایک ایسا دعویٰ ہے جسے شعرا کے حالات زندگی پر نظر ڈالنے سے رد کیا جاسکتا ہے"۔ یہاں نظریہ سے پہلے لفظ "اس" ضروری ہے، پھر یہ جملہ اچھی اردو کا جملہ نہیں ہے۔ نیز اس میں " pantheon " کا ترجمہ سرے سے کیا ہی نہیں گیا۔ میرے نزدیک اس جملے کا ترجمہ یہ ہونا چاہئے "اعتراض یہ ہے کہ میرے نظریے کے مطابق مضحکہ خیز حد تک تبحر علمی (بلکہ فضیلت مآبی) درکار ہے یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جو کسی مقدس سلسلے کے شعرا کے حالات زندگی کی روشنی میں رد کیا جاسکتا ہے بلکہ (معترض) اس پر بھی زور دیں گے کہ زیادہ علمیت، شعری حسیت کو مردہ کردیتی ہے یا مسخ کردیتی ہے" ادبی تنقید کا ترجمہ اگرچہ آسان نہیں مگر فلسفے کا ترجمہ بہر حال بہت مشکل ہے اردو میں افلاطون کی "ریاست" کا وہ ترجمہ جو ڈاکٹر ذاکر حسین نے کیا ہے۔ عابد حسین کا کانٹ کی "تنقید عقل محض" کا ترجمہ خلیفہ عبدالحکیم، مرزا ہادی رسوا اور مولانا عبدالباری کے ترجمے مجموعی طور پر اچھے ترجمے ہیں۔ اگرچہ "عقل محض" کے مقابلے میں میرے نزدیک "عقل خالص" شاید بہتر ہوتا۔ ظفر حسین نے "انواع فلسفہ" کے نام سے " Types of philosophy " کا بہت اچھا ترجمہ کیا ہے سماجی علوم میں قابل قدر ترجمے روسو کے "معاہدۂ عمرانی" کا ترجمہ ڈاکٹر محمود حسین کا کیا ہوا

کینس کا روزگار شرح " سود و زر" ابو سالم کا کیا ہوا۔ ولیم جیمس کی مشہور کتاب " نفسیات و دار وات النسانی" کا ترجمہ خلیفہ عبد الحکیم کا کیا ہوا۔ ایسے ترجمے کیے جا سکتے ہیں پھر بھی سماجی علوم میں بہت سی بنیادی کتابوں کا ترجمہ ہونا باقی ہے ہمارے دستور کا جو ترجمہ اجمل خاں، محمد مجیب اور ہارون خان شروانی نے کیا ہے وہ نہ صرف اردو میں انگریزی کی روح کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہے بلکہ اس کی خوبی یہ ہے کہ ترجمہ معلوم نہیں ہوتا۔ تمہید ملاحظہ ہو۔

"ہم ہند کے لوگوں نے پوری سنجیدگی کے ساتھ فیصلہ کیا ہے کہ ہند کو ایک پورے اختیار والی عوامی جمہوریہ بنائیں اور اس کا بندوبست کریں کہ اس کے ہر شہری کو انصاف ملے۔ سماجی، معاشی اور سیاسی آزادی ملے، خیال، بیان، عقیدے، مذہب اور عبادت کی برابری ملے۔ حیثیت اور موقعوں میں۔

اور ہم نے طے کیا ہے کہ شہریوں کے درمیان اس طرح بھائی چارہ پھیلائیں کہ فرد کا وقار اور قوم کی ایکتا محفوظ رہے۔"

جہاں تک تصنیف و تالیف کا سوال ہے اس کے مسائل ترجمے کے مسائل سے خاصے مختلف ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تصنیف کے کئی درجے ہوتے ہیں۔ ایک ابتدائی درجہ عام فہم انداز میں کسی مسئلے کے مبادیات کو بیان کرنے کا ہے۔ مثلاً سیاسیات یا نفسیات پر کوئی ابتدائی کتاب لکھی جائے جو بی اے کے طالب علموں کے لئے ہو۔ اس میں نصاب کی ضرورت کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ طلباء کی عمر اور استعداد اور ان کی زبان پر قدرت کو بھی دیکھنا ہوگا۔ موضوع کے مناسب معیار کو دیکھنا ہوگا ــــــ

______ تاکہ اس ابتدائی منزل پر کوئی غلط نظریہ ذہنوں میں رائج نہ ہو جائے۔

یہاں اصطلاحات کی تعداد زیادہ نہ ہوگی مگر یہ ضروری ہوگا کہ یہ اصطلاحات مستند ہوں۔ بی اے کی منزل کے بعد ایم اے کی منزل کے لئے کتابیں لکھوانے کا سوال ہوتا ہے یہاں کتاب کا معیار خالص علمی ہوگا۔ زبان کے عام فہم ہونے پر اصرار نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ کتابیں اس مضمون میں مہارت حاصل کرنے کے لئے پڑھی جائیں گی۔ اس منزل پر موضوع پر جدید ترین معلومات ضروری ہوں گی۔ ہر مضمون کے لئے تراجم اور تصانیف میں ایک خاص تناسب ہونا چاہئے۔ تراجم کی اہمیت مسلم مگر تصانیف بی اے کی منزل پر زیادہ اہم ہیں۔ اس لئے اگر کسی مضمون پر چار کتابوں کا ترجمہ کر دیا گیا ہے تو کم سے کم چار تصانیف بھی ہونی چاہئیں۔ اگر کوئی ماہر فن اپنی نظر اور تجربے کی بنا پر سیاسیات یا اقتصادیات پر کوئی کتاب لکھے تو ہمارے طلبا اس مضمون سے زیادہ آشنا ہوں گے۔ ترجمے کے ذریعے اتنا ابلاغ نہیں ہوتا جتنا تصنیف کے ذریعہ ہوتا ہے۔ سماجی علوم میں ویسے ہی ہندوستانی ماحول اور مشرقی فضا کو دیکھتے ہوئے تصانیف کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ مقامی مثالوں کے ذریعے بات کو زیادہ اچھی طرح ذہن نشین کرایا جاسکتا ہے ترجمہ بہر حال پٹری پر چلنے کے مترادف ہے اور طالب علم اس پٹری سے اکتا بھی سکتا ہے تصنیف میں زیادہ آزادی ہے اور اس کے ذریعے سے زیادہ سے زیادہ وسیع فضا کی سیر کی جاسکتی ہے۔

اب مجھے اصطلاح سازی کے اصولوں کے متعلق کچھ کہنا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں چاہئے کہ وحید الدین سلیم کی وضع اصطلاحات کو خاص طور سے نظر میں رکھیں جو لوگ آنکھ بند کر کے انگریزی کی اصطلاحات بجنسہٖ لینا چاہتے ہیں ان کے متعلق وحید الدین سلیم کی

رائے یہ ہے۔

"انگریزی زبان میں علمی الفاظ کی اس قدر کثرت ہے کہ اگر ان سب الفاظ کو ہم بگاڑ کر جاہلوں کی زبانی خراد پر چڑھا کر اپنی زبان میں داخل کرلیں تو ہماری زبان کا قدرتی حسن و جمال اور اس کے خط و خال کی قدرتی خوبیاں سب خاک میں مل جائیں گی۔ اجنبی زبان کے الفاظ کی کیسی ہی تراش خراش کیوں نہ کی جائے ان میں اجنبیت کی بو اس قدر باقی رہتی ہے کہ اہل زبان ان سے مانوس نہیں ہوتے۔ ہماری زبان میں موجودہ اصل الفاظ کی تعداد ہی بمقابلہ مہذب زبانوں کے کم ہے۔ اگر انگریزی زبان کے تمام علمی الفاظ توڑ مروڑ کر اس میں بھر دیئے جائیں تو ان کی تعداد اصل سے بھی زیادہ ہو جائیگی اور ہماری زبان کی لچک اور نزاکت سب ملیا میٹ ہو جائے گی اور ہم ایسی زبان بولنے اور لکھنے پر مجبور ہوں گے۔ جس کے الفاظ کا کوئی جزو گوش آشنا اور مانوس نہ ہوگا۔ برخلاف اس کے اگر ہم انگریزی زبان کے علمی الفاظ کے مقابلے میں ایسے الفاظ وضع کریں جن کے اجزا پہلے سے گوش آشنا اور مانوس ہوں تو اس سے نہ تو زبان کی سلاست اور لوچ میں کوئی فرق آئے گا اور نہ ہم اپنی زبان میں کسی ناگوار مداخلت کے مرتکب ہوں گے۔"

(وضع اصطلاحات)

میں اس نظریے سے مجموعی طور پر اتفاق کرتا ہوں، ہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس کے باوجود بعض ایسے الفاظ کے لئے جو بالکل نئے ہیں اور جن کا مفہوم کسی طرح سے

پر کرنے الفاظ سے ادا نہیں ہو سکتا، ایک وجہ انگریزی سے الفاظ لینے میں کوئی حرج نہیں ان کی تعداد اتنی ہونی چاہیے کہ مجموعی طور پر زبان کی جی نی اس مجروح نہ ہو۔ یہاں میں نے لفظ مزاج یا بناوٹ استعمال نہیں کیا کیونکہ میرے نزدیک جی نی اس میں انفرادیت کا جو پہلو ہے وہ مزاج یا بناوٹ سے ظاہر نہیں ہوتا پھر لفظ جی نی اس ہمارے صوتی نظام سے ہم آہنگ ہے اس لئے ایسے الفاظ لینے میں کوئی حرج نہیں۔ ویسے بھی آئیڈیلزم، مارکسزم، بیلٹ، ایڈی پس کمپلکس (Oedipu Complex)، ایٹم، میزائل، ٹریبونل، آمارنی، شیڈیول کو بجنسہ لے لینا بہتر ہوگا۔ ان کا ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ لفظ اخباروں میں استعمال ہونے لگے ہیں۔

پھر بھی اصطلاح سازی کے لئے ہر جدید زبان کو کسی کلاسیکل زبان کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگرچہ وحیدالدین سلیم نے اس پر زور دیا تھا کہ اردو کے آریائی مزاج کا خیال رکھا جائے گا مگر جامعہ عثمانیہ کی اصطلاحوں میں طباطبائی کے اثر سے عربی سے ضرورت سے زیادہ فائدہ اٹھایا گیا۔ چند سال ہوئے کابل میں ترجمے پر ایک سیمنار ہوا تھا جس میں ایران افغانستان، تاجکستان، ہندوستان اور پاکستان کے نمائندے شریک ہوئے۔ میں اس سیمینار میں موجود تھا۔ ایران کے نمائندوں نے بتایا کہ ان کے یہاں عربی کی اصطلاحوں کے بجائے اب فارسی کی اصطلاحیں برتنے کا رواج ہے۔ انھوں نے اس کے علاوہ فرانسیسی کے اثر کی وجہ سے بہت سی فرانسیسی اصطلاحوں کو مفرس کر لیا ہے ——— ظاہر ہے کہ تہنید کا یہ عمل ہمارے یہاں بھی جاری ہے اور جاری رہنا چاہیے مگر کچھ الفاظ پہلے فارسی سے پھر عربی سے پھر انگریزی سے لینے ہی پڑیں گے۔

اردو چونکہ ایک جدید ہندوستانی زبان ہے اور اس کی بنیاد کھڑی بولی ہے جو شورسینی اپ بھرنش سے نکلی ہے اس لئے اس کا تعلق اپ بھرنش کے ذریعے سنسکرت سے سیدھے سنسکرت کا رشتہ فارسی سے مسلم ہے۔ کیوں کہ دونوں زبانیں انڈو ایرین خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اس لئے اگرچہ ہم اردو کی جی نی اس کو دیکھتے ہوئے سنسکرت کی اصطلاحوں سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے پھر بھی فارسی کی اصطلاحوں پر زیادہ توجہ کر کے سنسکرت سے قریب رہ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم (Sub-Conscious Conscious,Unconscious) کے لئے شعور، تحت الشعور اور لاشعور کی اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں۔ ان کی جگہ فارسی کی اصطلاحیں آگہی، زیر آگہی اور ناآگہی بے تکلف استعمال کر سکتے ہیں۔ اس لئے میرے نزدیک اصطلاح سازی کے لئے ہمارا اصول یہ ہوگا کہ موجودہ اصطلاحوں میں سے جو ہمارے آریائی مزاج کے مطابق ہیں وہ بجنسہ رہنے دی جائیں۔ نئی اصطلاحیں فارسی کی مدد سے بنائی جائیں اور جہاں انگریزی کی اصطلاح لینی ناگزیر ہو ——— وہاں انگریزی کی اصطلاح تھوڑے سے تصرف کے ساتھ اختیار کر لی جائے۔ اس سلسلے میں ہمیں ایک اصول کو چھوڑنا پڑے گا۔ جس پر اب تک ہمارے علما اور خواص سختی سے عمل پیرا رہے ہیں یعنی فارسی اور ہندی الفاظ کی ترکیب سے احتراز یا ہندی اور عربی نئے مرکب الفاظ بنانے سے پرہیز۔ ہماری زبان میں جب لب سڑک، فوق البھڑک، چھٹی سال تماہی۔ جیسے الفاظ موجود ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم حسب ضرورت اسی اصول پر اپنی اصطلاحیں نہ بنائیں۔ دراصل انشا نے دریائے لطافت میں اردو زبان کی خود مختاری کا جو اعلان کیا تھا۔ اس سے پورا فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔ انشا نے کہا تھا کہ جو لفظ عربی یا فارسی کا اردو زبان میں مستعمل ہو گیا وہ اب اردو کا لفظ ہے اور اسے اردو کے

قاعدے سے برتنا چاہئے۔ اس اصول پر عمل کرنے سے ہماری بہت سی مشکلات دور ہو سکتی ہیں۔

میں چند مثالوں سے اپنی بات واضح کرنا چاہتا ہوں۔ ہم "Nature" کے لئے "فطرت"، "Natural" کے لئے "فطری" "Naturalism" کے لئے "فطرت پرستی" کی اصطلاحوں سے کام لیتے ہیں لیکن ——— "Supernatural" کے لئے "مافوق الفطرت" کہتے ہیں۔ حالانکہ "فوق فطری" کافی ہوگا۔ اسی طرح "International" کیلئے بین الاقوامی کے بجائے "بین قومی" لکھنا زیادہ مناسب ہوگا۔ نشاۃ الثانیہ کے لئے "نئی بیداری" مناسب ہوگا۔ ہم نے مذہب میں "صلواۃ" کے بجائے "نماز" کو اختیار کر لیا لیکن بہت سی اصطلاحیں عربی کی نہیں چھوڑ سکتے، حالانکہ فارسی کی اصطلاحیں یا ہندی کی وہ اصطلاحیں جو ہمارے صوتی نظام سے متصادم نہ ہوں ہمارے لئے زیادہ قابل قبول ہونی چاہئیں۔

اس سلسلے میں ایک بات اور قابل غور ہے۔ انگریزی میں لفظ نیشن سے نیشنلائز اور آئیڈیل سے آئیڈلائز بنایا گیا ہے اس نہج پر ہمیں "قومیانا" اور "آدرشیانا" لکھنا چاہئے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ "Idealization" کے لئے "آدرشیانے" کا عمل اور ——— "Nationalization" کے لئے "قومیانے" کا عمل لکھنا پڑے گا۔ قدیم اردو میں "خرچ" سے "خرچنا" استعمال ہوتا تھا۔ وحید الدین سلیم نے اس اصول پر برقانا کی حمایت کی تھی۔ اس طرح بہت سے فعل بنائے جا سکتے ہیں۔ گو اس میں شک نہیں کہ ہر جگہ یہ اصول کام نہیں دے گا۔ انگریزی میں بھی نہیں دیتا۔

اصطلاح سازی بہرحال ضروری ہے۔ نئے خیالات کے لئے نئے الفاظ لینے ہونگے ہاں حالی کے بنائے ہوئے اصول کے مطابق اس معاملے میں احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ نئے الفاظ نئے ذہن کی تشکیل کرتے ہیں۔ اردو کو جدید ذہن سے ہم آہنگ کرنے کے لئے جدید اصطلاحیں بنائے بغیر چارہ نہیں۔ مگر کوئی جدید چیز بالکل جدید نہیں ہوتی۔ یہ کسی پرانی اور بھولی بسری روایت کی تجدید، توسیع یا ترمیم ہوتی ہے اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے سارے خزانے کو کھنگالیں، پیشہ وروں کے اصطلاحات سے مدد لیں اور نئی چیزوں، نئے خیالات، نئے لفظوں کو حسب ضرورت اختیار کرلیں۔ یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ یہ کتابیں کون پڑھے گا۔ طالب علم تو اردو جانتے ہیں نہ ہندی نہ انگریزی ایک طرف ہمیں اس پر اصرار کرنا چاہئے کہ جن کی مادری زبان اردو ہے۔ وہ ثانوی تعلیم اردو کے ذریعے سے حاصل کریں تاکہ انکی بنیاد مضبوط ہو۔ دوسری طرف ہمیں ان کو افسانہ و افسوں اور جذبات کے عشرستاں کے بجائے فکر و نظر کی رفعتوں کی طرف مائل کرنا ہوگا تاکہ وہ جدید ذہن پیدا کرسکیں اور اس جدید ذہن کی مدد سے موجودہ دور کی پرپیچ اور نت نئے روپ بدلنے والی زندگی کے فرائض سے عہدہ برآ ہوسکیں۔ تراجم اور تصانیف کے کام میں یہی آدرش ہونا چاہئے۔ اس آدرش تک پہنچنے میں دیر لگے گی مگر تاریخ بتاتی ہے کہ اچھے راستے وہی ہوتے ہیں۔ جو سب سے لمبے ہوتے ہیں کیونکہ انھیں میں خلوص، ریاض اور خونِ جگر کی مکمل نقش گری ہوسکتی ہے۔

پروفیسر محمد حسن

ترجمہ : نوعیت اور مقصد

ضرورت اکثر برائیوں کو اچھائیوں میں بدل دیتی ہے۔ ایسی ہی ایک برائی ترجمہ بھی ہے TRANSLATOR کو TRAITOR اور مترجم کو گندم نما جو فروش کہا گیا ہے۔ ترجمہ اگر اصل کا کام دینے لگے تو ترجمہ کیوں کہلائے لازمی طور پر اصل سے کمتر ہوگا۔ اور جو کمتر ہو وہ برائیوں میں کیوں نہ گنا جائے۔ مگر ضرورت کہتی ہے کہ عالمگیر آگہی کا نور اور سرور ایک زبان کے دامن میں تو سمٹنے سے رہا۔ جب تک ایک زبان کے بولنے والے دوسری زبانوں کے علم و آگہی۔ جذبے اور شعور فکر و احساس ٹکنیک اور سائنس تک پہنچنا چاہیں گے ترجمے کا سہارا لیں گے۔ خواہ یہ سہارا کیسا ہی ناتمام اور ناقص کیوں نہ ہو۔ بنیادی طور پر ترجمہ لسانی اور تہذیبی مفاہمہ ہے جو نہ اصل کی لذت کو پوری طرح پا سکتا ہے نہ اس سے مکمل طور پر محرومی کو قبول کرتا ہے۔

مفاہموں کی طرح ترجمے بھی ہر سطح کے ہوتے ہیں۔ کچھ سب کچھ گنوا بیٹھے ہیں اور اصل کا شائد سچا مگر ناقابل فہم عکس بن جاتے ہیں۔ کچھ ایسے برہم اور سرکش ہوتے ہیں کہ اصل پر غالب آجاتے ہیں۔ اور ترجمے کے دائرے سے نکل بھاگتے ہیں صحیح اور حقیقی ترجمے کی نوعیت لازمی طور پر اس کے بنیادی مقاصد پر منحصر ہے اور بنیادی مقاصد کا دارومدار موضوع اور تفس

مضمون پر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آج جب دنیا کی طنابیں کھینچ رہی ہیں اور علم عالمگیر سطح پر ایک اکائی بنتا جا رہا ہے کوئی زبان بھی ترجمے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، کہ جب تک نئے خیال کا خون اور نئی آگہی کا نور رگ و پے میں سرایت نہ کرے زندگی دشوار ہے۔ یہی نہیں بلکہ آج کی دنیا میں زبانوں کی مقبولیت پھیلاؤ اور اہمیت کا دارومدار بڑی حد تک ان کے مفید ہونے پر ہے۔ اور افادیت کا پیمانہ یہ ہے کہ کوئی زبان اپنے زمانے کے علمی سرمایے اور ادبی ذخیرے کو کس حد تک اپنے پڑھنے والوں تک پہنچانے کی اہل ہے اردو زبان کی خوش بختی ہے کہ اس نے ترجموں کی روایت کو ابتدا ہی سے اپنایا اپنے دریچے باہر سے آنے والی ہواؤں کے لئے کھولے اور بین الاقوامی کلچر کے نقوش سے اپنی محفل کو آباد کیا اس دور تک آتے آتے وہ پرانی روایت بھی ناکافی ہوگئی اور نئی دنیا کے تہذیبی سیاق و سباق نے برق رفتاری کے ساتھ ترجمے کے کام کو پھیلانے کو ناگزیر بنا دیا۔ لیکن سفر شروع کرنے سے پہلے منزل کا تعین لازمی ہے۔

بنیادی طور پر کسی ترجمے کے تین مقاصد ممکن ہیں پہلا معلوماتی دوسرا تہذیبی تیسرا جمالیاتی۔ الفاظ مختلف قسم کی اقدار کی ترسیل کرتے ہیں پھر ترسیل کی مختلف سطحیں ہیں یہ سب سے اوپری اور کسی قدر آسان سطح معلوماتی ہے۔ مترجم کا بنیادی مقصد نئی زبان کی وساطت سے معلومات کی ترسیل ہے یہاں ترجمہ جتنا اصل سے قریب ہوگا معلومات کی ترسیل کا حق اتنا ہی بہتر طور پر ادا ہو سکے گا۔ اس ضمن میں سائنسی علوم کے ترجمے آئیں گے یہاں ترجمے کی کامیابی اس پر منحصر ہوگی کہ کتنے شفاف طور پر اصل کی معلومات ترجمے کے ذریعے دوسری لسانی برادری کے سامنے آئیں۔ سب سے اہم مسئلہ اصطلاحات علمیہ کا ہے جن کا ترجمہ اول تو ہمیشہ ممکن نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی

ہے تو کچھ اور مفہوم ادا کرنے لگتا ہے اردو اور ہندی کے علما اس بات پر متفق ہیں کہ جہاں تک ہو سکے علمی اصطلاحات کے ترجمے کے لئے علی الترتیب فارسی عربی اور سنسکرت کی طرف رجوع کئے بغیر چارہ نہیں ہے لیکن اس اتفاق رائے کے باوجود مسئلہ اتنا آسان نہیں۔ عربی اور سنسکرت اکثر مقبول عام یا عام فہم اصطلاحات دینے سے قاصر ہوتی ہیں۔ دراصل ہم نے ابھی تک عام بول چال کی اس ہندوستانی زبان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ جو صدیوں سے رائج ہے۔ جس نے خود نہ جانے کتنی نئی اصطلاحات کو جنم دیا ہے۔ بول چال کے عام الفاظ سے سینکڑوں مشتقات ممکن ہیں جن کی ترسیل عربی اور سنسکرت الفاظ کے مقابلے میں آسان ہے معلوماتی ترجموں میں شاید سب سے آسان ——— علوم طبعی کے ترجمے ہیں PHYSICAL SCIENCES اور سب سے مشکل فلسفیانہ کتابوں کے۔ آخر فلسفہ بھی تو معلومات فراہم کرتا ہے۔ اشیا کی نہیں ان کے بارے میں تصورات کی اور یہ تصورات ایسے تہ بہ تہ اور پیچیدہ ہوتے ہیں کہ زبان ساتھ نہیں دے پاتی۔ ہر اصطلاح کی تعریف کے الفاظ نپے تلے ہونا ضروری ہیں اور پھر ہر لفظ کے معنی کا تعین لازمی ہے۔ اس لئے جب کسی فلسفیانہ کتاب کا ترجمہ رواں اور شستہ ہو تو اکثر صورتوں میں یہ سمجھنا چاہئے کہ مترجم نے اصل مصنف سے بہت زیادہ شوخی برتی ہے۔ اس لحاظ سے روانی اور شستگی ہمیشہ اور ہر ترجمے کے اعلیٰ ہونے کا معیار نہیں ہے بہر صورت معلوماتی ترجموں کا واضح مقصد معلومات کی ترسیل ہے اور یہی ان کی کامیابی کا معیار ہے۔

دوسری سطح ہے تہذیبی۔ جہاں ایک تہذیب کے تصورات دوسری تہذیب کے پیکر میں ڈھالنے ہوتے ہیں اصل میں مترجم کا کام ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ

رکھنا نہیں ہے ایک تہذیبی معنویت کو دوسری تہذیبی معنویت میں ڈھالنا ہے تہذیبی اقدار کو جنم دیتی ہے۔ اور اقدار سے بنتی اور سنورتی ہے۔ اور انہیں کے بل بوتے پر پوری لسانی آبادی کا ردعمل متعین ہوتا ہے۔ ممکن ہے ایک تہذیب میں ایک مخصوص لفظ تصورات کا آئینہ خانہ ہو لیکن وہی تصور جب دوسری زبان کے لفظ میں ادا ہو تو دوسرے تہذیبی سیاق میں مہمل یا بے معنی ہو جائے۔ اس طرح ترجمہ تصورات کی تہذیبی آباد کاری ہے ULTURAL REHABILITATION اس ضمن میں خاص طور پر ناول اور افسانوں کے ترجمے آتے ہیں۔ شاعری کے برخلاف ناول اور افسانہ اشیاء اور ماحول کے بیان سے بے تعلق نہیں ہو سکتے۔ اور اشیاء اور ماحول پر تہذیب کی مہر بہت نمایاں ہوتی ہے۔

تیسری سطح جمالیاتی ہے اور غالباً سب سے زیادہ دشوار ہے۔ جمالیاتی انبساط خود نہایت پیچیدہ عمل ہے دوسرے یہ عمل الفاظ کے سطحی معنوں کے بجائے ان کے متنوع متعلقات کے ذریعے ادا ہوتا ہے۔ الفاظ صرف معلومات یا محض تصورات پیش نہیں کرتے بلکہ ایک خاص فضا اور کیفیت چھوڑتے گذر جاتے ہیں۔ سنسکرت کے ماہرین شعریات نے معنی کی سات نوعیتیں قرار دی ہیں جن میں معلومات کی ترسیل، طنز، تضاد، محاورہ، علامتی اظہار، کنایہ، کیفیت سبھی شامل ہیں۔ ایک زبان کے ایسے ہمہ جہت لفظ کو دوسری زبان اور دوسری تہذیب کے سیاق و سباق میں بٹھانا مشکل ہوتا ہے۔ اسی لئے شاعری کا ترجمہ سب سے زیادہ دشوار ہے۔

ترجموں کی ان تینوں نوعیتوں پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ان کے مقاصد اور ان کی نوعیتیں جداگانہ ہیں۔ پہلے میں معلومات اہم ہیں اس لئے قطعیت اور صراحت

پر زور ہے لفظ پر معنی کی گرفت گہری ہے اس کی شخصیت معنی سے ماورائی کیفیت تک نہیں۔ انداز بیان جتنا شفاف۔ ترجمہ لفظی ترجمہ سے جتنا قریب اور معلومات جتنی بھرپور شکل میں منتقل ہونگی ترجمہ اسی قدر کامیاب ہوگا۔ تہذیبی نوآبادکاری کے ترجموں میں تہذیبی معنویت جس قدر خوبی کے ساتھ منتقل ہوگی اسی قدر اس کی اہمیت میں اضافہ ہوگا اسی لئے SHIPLEY کا خیال غلط نہیں کہ ہر ترجمہ (adaptation) ترتیب تو ہوتا ہے جمالیاتی سطح کے ترجموں میں کیفیت بنیادی جوہر ہے البتہ اس کیفیت کو اصل کے کیف سے ہم آہنگ اور نئے تہذیبی سیاق سے مربوط ہونا چاہیے کیونکہ ایک تہذیبی تصور کو مترجم دوسری تہذیب کے لئے بامعنی اور اہم بناتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اکثر تلخیص سے بھی کام لیتا ہے یا بعض الفاظ کے اضافے بھی کرتا ہے۔ انتہا یہ کہ قرآن کے ترجمے میں بھی جہاں اصل سے مطابقت سب سے زیادہ اہم قرار دی گئی ہے۔ شاہ ولی اللہ اپنے فارسی ترجمہ قرآن کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> "سائر تراجم از دو حالت خالی نیست یا ترک کردہ اند قصص متعلقہ بر قرآن مطلقاً یا التأ۔ جمیع آن نمودہ اند دریں ترجمہ راہ متوسط اختیار نمودہ شد لیس جائیکہ معنی آیت موقوف است بر قصۂ تقیہ ضرورت دو سہ کلمہ ازاں انتخاب کردہ آوردہ شد و جائے معنی آیت موقوف بر قصّہ نبود ترک نمودہ۔"

یعنی یہاں قرآنی قصوں کے صرف ضروری اجزا لئے گئے ہیں ترجمے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> "ترجمہ ہائے قدیم از دو حالت خالی نیستند یا ترجمہ تحت اللفظی باشد

یا ترجمہ حاصل المعنی و در ہر یکے وجوہ خلل بسیار می آید و ایں ترجمہ جامع است ہر دو طریق و ہر خللے راز آں خلل ہا علاجے مقرر کردہ شد و ایں سخن دراز ست در رسالہ قواعد مترجم بیان کردہ ایم۔

ایں ترجمہ بوجہے واقع شدہ است کہ شناسندۂ نحو از آں اعراب قرآن و تعیین محذوف و مرجع ضمیر و محل لفظی کہ در عبارت مقدم و موخر کردہ شدہ است می تواند دانست و آں کہ شناسندہ نحو نیست از اصل غرض محروم نماند۔"

انھیں نزاکتوں کی بنا پر مولانا عبدالقادر نے جب ۱۲۰۵ھ میں اردو ترجمہ مکمل کیا تو اس پر زور دیا کہ استاد کی مدد سے پڑھا جائے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"اب کئی باتیں یاد رکھئے اول۔ کہ اس جگہ مترجم لفظ ضرور نہیں کہ ترکیب ہندی ترکیب عربی سے بہت بعید ہے اگر بعینہ وہ ترکیب رہے تو مفہوم نہ ہوں دوسرے یہ کہ اس میں زبان ریختہ نہیں بولے بلکہ ہندی متعارف عوام کو بے تکلف دریافت ہو تیسرے یہ کہ ہر چند ہندوستانیوں کو معنی قرآن آسان ہوئے لیکن ابھی استاد سے سند کرنا لازم ہے۔ اول معنی قرآن بغیر سند کے معتبر نہیں دوسرے ربط کلام ماقبل اور مابعد سے پہچاننا اور قطع کلام سے بچنا بغیر استاد کے نہیں آتا چنانچہ قرآن زبان عربی ہے اور عرب بھی محتاج استاد تھے۔"

ظاہر ہے کہ مترجم کے لئے ناتمامی اور نارسائی کا احساس لازم ہے اسی لئے کہ دیچے نے مترجم کے لئے جو دو راستے متعین کئے وہ FAITHFUL UGLINESS وفادارانہ بدصورتی یا FAITHLESS BEAUTY غیر وفادارانہ حسن کے تھے اور دونوں

ہی ناقابل قبول، مترجم کا عذر صرف یہ ہو سکتا ہے کہ جتنی عظیم تصنیف ہو گی ترجمے میں وہ اتنی ہی کم مسخ ہو گی اور اصل کا لطف کسی نہ کسی حد تک ضرور قائم رہے گا کیونکہ تصنیف کا حسن الفاظ کے صوتی آہنگ سے کہیں زیادہ تصورات اور علامتوں کے حسن رنگینی اور ان میں مضمر بصیرت پر ہے۔ ہیسلے نے اس کی مثال میں بائیبل کی GENESIS اور ڈانٹے کی DIVINE COMEDY کو پیش کیا ہے جن کا حسن ترجمے میں بھی قائم رہتا ہے اور لکھتا ہے۔

"Count d'arssy needs perfection of attire,

a hero like lincaln, remains heroic in ill

fitting clotnes.

"کاونٹ ڈورنسے کے لئے اعلیٰ ترین لباس ضروری ہے مگر لنکن جیسے ہیرو بے ڈھنگے لباس میں بھی ہیرو ہی رہتے ہیں"

یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں اعلیٰ ترین تخلیقی فن کاروں نے ترجمے کئے ہیں جرمنی میں گوئٹے، شلر، ہرڈر انگلستان میں چاسر ملٹن۔ ڈرائیڈن۔ پوپ فیلڈنگ کولرج اور کارلائل اور آسکر وائلڈ۔ فرانس میں بودلیر عہد جدید میں پروست، رومان رولاں سنٹیانا، آندرے ژید تک یہ سلسلہ جاری رہا ہے۔ اعلیٰ ترین تخلیقی صلاحیتیں ترجمے کے تینوں مقاصد کو کسی نہ کسی حد تک یک جا کر سکتی ہیں اور یہی اعلیٰ ترجمے کا معیار ہے۔ معلوماتی تہذیبی اور جمالیاتی مقاصد ایک ساتھ حاصل ہو سکتے ہیں گو ظاہر ہے کہ کہیں ایک پر زیادہ زور دیا جائے گا کہیں دوسرے پر۔

لہٰذا ہر مترجم کے سامنے تین سوالات بنیادی ہوتے ہیں :

۱- ترجمہ کس مقصد سے کیا جارہا ہے معلوماتی مقاصد پیش نظر ہیں یا تہذیبی اور جمالیاتی۔

۲- کس کے لئے کیا جارہا ہے تاکہ مترجم اپنے مخصوص تہذیبی گروہ کو پیش نظر رکھ کر ان کے ردعمل اور دائرہ تفہیم کے مطابق اصل کو ترجمے کی شکل میں پیش کرے۔

۳- کس قسم کی تحریر کا ترجمہ منظور ہے، ناول، افسانہ اور ڈرامہ مختلف قسم کے ترجمے کے متقاضی ہیں سائنسی ترجموں کا اسلوب کچھ اور ہے اور نظموں کے ترجمے کا کچھ اور ان تمام نزاکتوں اور لطافتوں کو پیش نظر رکھنا مترجم کا کام ہے۔

آج کے دور کو EXPLOSION OF KNOWLEDGE علمی دھماکے کا دور کہا جاتا ہے کہ ایک دھماکے کے ساتھ علم پوری دنیا میں پھوٹ پڑا ہے ماہرین اور ماہر فن SPECIALISTS کے باوجود مجموعی طور پر علم کی سطح ماضی سے کہیں زیادہ بلند ہو گئی ہے ایسی دنیا میں اردو والوں کیلئے ترجمہ محض ایک چیلنج نہیں زندگی اور موت کا سوال ہے۔ امریکا میں ایک نعرہ عام ہوگیا تھا PUBLISH OR PERISH اردو کے لئے آج بنیادی سوال ہے Translate or Perish - اگر علمی آگہی اور عالمی بصیرت کو کم سے کم وقت میں اور زیادہ سے زیادہ اردو میں منتقل نہیں کیا گیا تو ہم عالمی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جائیں گے اور اردو ایک غیر مفید، قدیم اور مردہ زبان ہو جائے گی۔ اردو میں ترجمہ کی پوری روایت گواہ ہے کہ وہ اس چیلنج کو قبول کر سکتی ہے اور اس سے عہدہ برآ بھی ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر ظ۔ انصاری

ترجمے کے بنیادی مسائل

ترجمے دنیا کی تمام زبانوں میں ہوتے ہیں جو لکھی اور بولی جاتی ہیں۔ مگر کسی قابل ذکر مصنف نے کوئی واضح کتاب یا ایسی مفصل تصنیف یا تالیف نہیں چھوڑی جو ترجمے کے بنیادی مسائل کو، ساری دشواریوں اور سہولتوں کو سامنے رکھ کر ان کا حل بتا سکے۔ اور جس سے ترجمہ کرنے والے کو آگے چل کر اپنی ڈگر صاف نظر آئے اپنی حدود اور اپنی ذمہ داریوں کا علم ہو اور جسے وہ اپنی ترتیب کے لئے استعمال کر سکیں۔

زیادہ حیرت اس وقت ہوتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لغت، صرف و نحو، معانی و بیان اور اصطلاحات پر ہر زمانے میں کافی توجہ کی گئی — اور لسانیات کے ایک سے ایک لائق صاحب قلم نے الفاظ و لغات کو ایک ایک پہلو سے پرکھا۔ انھیں زیادہ مکمل اور مفید بنانے کی کوشش کی مگر ترجموں پر صرف رائے زنی کر کے سوالوں اور اصولوں کو ترجمہ کرنے والے کے ضمیر اور اس کی صلاحیت پر چھوڑ دیا۔ جو لوگ زبانوں اور ادبوں پر حادی تھے وہ بھی محض اپنی کاوشوں کو نشان راہ کے طور پر چھوڑ کر چلے گئے۔ ڈاکٹر کیمبل اور الگزنڈر ٹیلر جنھوں نے اس مسئلے

پر اٹھارویں صدی کے وسط میں دو اہم مضمون لکھے ہیں ان کا بیان ہے کہ لاطینی، عبرانی یونانی، فرانسیسی اور انگریزی جیسی وسیع اور دولت مند زبانوں میں بھی اس موضوع پر کوئی کتاب یا مستقل تصنیف نظر نہیں آتی۔

ترجمہ کے مسائل پر کوئی بنیادی اصول وضع نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ خود انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے مانے ہوتے مترجم ڈرائڈن کے بیان کے مطابق بہت کم ترجمے ہیں جو قابل برداشت ہیں کیونکہ ترجمہ کرنے کے لئے جس درجے کی ذہانت، سنجیدگی علم اور مشق کی ضرورت ہے وہ بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے اور ترجمہ کرنے کے معاملے میں ہر شخص بے لگام ہے۔ جیسا اور جس کے جی میں آتا ہے ترجمہ کر ڈالتا ہے۔

ترجموں کی اہمیت | نئی زبانیں قدیم زبانوں کی انگلی تھام کر چلنا سیکھتی ہیں، اور قدیم و جدید زبانیں اپنی ہم عصر زیادہ دولت مند زبانوں کا سہارا لیتی ہیں یہ عمل تاریخ تمدن کے ایک باب کی طرح ہمیشہ سے جاری ہے اور ترجمہ ہمارا سب سے اہم ذریعہ ہے جس کی بدولت یہ عمل آج تک جاری ہے چراغ سے چراغ جلتا ہے اور کڑی سے کڑی ملتی جاتی ہے۔

ترجمے ہی کے ذریعے ایک مخصوص ملک، ایک جغرافیائی علاقے اور ایک خاص قوم کی تحقیقات، اس کے علوم و فنون تمام انسانیت کی ملکیت بنتے ہیں اس لحاظ سے ترجمہ کی ذمہ داری کم از کم اتنی اہم ہے جتنی کسی کیمیاوی یا معدنی قوت کو ایک روپ سے دوسرے روپ میں ڈھالنے کی ہوتی ہے۔ تیل، کوئلے اور سونے کی کانیں جب تک زمین کے سینے میں دبی رہیں اس وقت تک وہ قومی دولت نہیں سمجھی جاتیں۔ لیکن جب اس ذخیرے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا

کیا جانے لگے۔ تو یہی عمل دولت کی پیداوار سمجھا جاتا ہے اور یہ دولت تمام عالم انسانی کی مجموعی دولت میں اضافہ کردیتی ہے۔

سقراط "دی مقراطیس" اور افلاطون کی دو ہزار سال سے زیادہ پرانی کاوشیں روما اور یونان کے قدیم کھنڈروں میں دب دبا کر رہ گئی تھیں۔ اگر عربی زبان کے ذی علم مترجم انھیں وہاں سے نکال کر یورپ اور ایشیا کی آخری سرحدوں تک کھلی ہوائیں نہ لے گئے ہوتے۔ بوعلی سینا، ابن رشد، ابونصر فارابی کے کارنامے یروشلم، غرناطہ اور بغداد کے محاصرے میں دم توڑ چکے ہوتے اگر بعد کی لاطینی زبانوں نے انھیں اپنے یہاں منتقل کرکے تاریخ فلسفے کے اگلے ورق کے لئے محفوظ نہ کرلیا ہوتا۔

ترجمہ بجائے خود ایک مستقل فن ہے اور اس علم یا فن میں اضافہ بھی ہے جس کی تصنیف کا ترجمہ کیا جائے۔ لیکن اسی کے ساتھ ترجمے کی بدولت اور اس کی خاطر اکثر اضافے کئے گئے ہیں۔ ہر زبان میں ترجموں کے ذریعے نئے الفاظ و اصطلاحات محاوروں اور کہاوتوں کا اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ جو اول اول اکھڑے معلوم ہوتے ہیں رفتہ رفتہ زبانوں پر رواں ہونے لگتے ہیں۔ کہیں اصل تصنیف کے الفاظ و عبارت کو اس کے خاص لہجے کو ترجمے میں برقرار رکھنے کی کوشش میں یہ اضافہ خود بخود ہو جاتا ہے اور اسی طرح ترجمے کی راہ سے اس زبان کی لغت اور طرز ادا میں نئے شگوفے پھوٹتے ہیں، نئے استعارے نمودار ہو جاتے ہیں جس زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

ترجمے کے ذریعے علم انسانی میں اضافہ کرنے والوں کا قافلہ بڑا شاندار ہے اور بہت طویل ہے اس میں بڑے بڑے حلقے ہیں۔ اگلے سرے پر بوعلی سینا، درمیان

میں والیتر موجود ہیں تو پچھلے سرے پر ڈاکٹر ذاکر حسین اور پیسترناک۔ عرب و عجم کے علما نے یونانی، ہندستانی فلسفہ، طب، ہیئت و نجوم اور داستانوں کا عربی میں ترجمہ کر کے ان پر اپنی معلومات کے حاشیے بڑھا کر علمی دنیا سے خراج پایا۔ لاطینی و رومی کے ذریعے شرق کو اور سنسکرت کے تراجم کے ذریعے مغرب کو اپنے زمانے تک کی تحقیقات سے باخبر کر دیا۔ پھر زمانے نے کروٹ لی —— والیتر نے شکسپیر کا ترجمہ کر کے فرانسیسی زبان کے ذخیرے میں اور پیسترناک نے روسی زبان کے ادب میں بیش بہا اضافے کئے، خود اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ علمائے مستشرقین نے مشرق کے کلاسیکی ادب اور علمی کتابوں کو مغرب سے روشناس کرایا۔ اس دو طرفہ عمل نے مشرق و مغرب کی طنابیں کھینچ دیں، باہمی خیر خبر کی گنگا دونوں سمتوں میں بہنے لگی۔

ترجمے کی اس اہمیت کو ہر زمانے میں تسلیم کیا گیا ہے۔ جاگیر داری حکومتوں کے طویل زمانے میں ہم جا بجا دیکھتے ہیں کہ دوسری زبانوں سے مختلف علوم و فنون کے ترجمے کرنے کے لئے بڑے پیمانے پر انتظامات کئے جاتے تھے چن چن کر علوم و فنون اور زبانوں کے علما بلائے جاتے تھے زیادہ سے زیادہ ترجموں کی اشاعت کا سرکاری سطح پر انتظام کیا جاتا تھا۔ ترجموں کے کمیاب مخطوطے شاہانہ تحفوں اور ہدیوں میں بھیجے جاتے تھے۔ اشوک اعظم کے پاٹلی پتر، بنی عباس کے بغداد میں بنو فاطمہ کے قاہرہ اور سکندریہ میں، عہد اکبری کے آگرہ میں اور بالآخر نظام کے حیدرآباد میں دارالترجمہ ملتے ہیں پھر ان مقامات سے جو ترجمے نکلے ان کا اثر خود ان زبانوں کی ساخت پر پڑا۔ جن میں وہ ترجمے کئے گئے تھے نہایت قریبی مثال کے لئے یہ کہنا کافی ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے ترجموں کے ذریعے دور دراز کی

زبانوں نے ایک دوسرے سے مل کر سنگم بنائے ہیں چھوٹے دھاروں کے پاٹ چوڑے کئے ہیں اور ان سے زیادہ گہرائی اور روانی پیدا کی ہے۔

اردو تو ایک باقاعدہ زبان بنی ہی ترجموں کی بدولت، ورنہ جب تک وہ کھڑی بولی کے روپ میں تھی اسے کسی بڑے قلمکار نے ادبی تصنیف کے قابل نہ سمجھا۔ بولی سے زبان تک کا طویل فاصلہ ایک صدی کے اندر طے کر لینے میں ترجموں کا بڑا ہاتھ ہے۔ کہیں یہ ترجمے کتابی صورت میں ہوئے اور کہیں محض خیال، استعارے اور اصطلاحوں کی صورت میں۔ تاریخ دہرانے کی یہاں گنجائش نہیں۔ بہر حال یہ مسلّم ہے کہ عربی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی کے علاوہ بھاشاؤں کے ترجمے اور ترجمانی کا اردو زبان کی تعمیر اور تربیت میں بڑا دخل ہے۔

لیکن چونکہ ہماری زبان کو منظّم علمی و لسانی کام کا ایک پرسکون زمانہ نصیب نہیں ہوا۔ اور با اقتدار طبقے کی سرپرستی میں پروان چڑھنے کی عمر طبیعی اسے نہیں ملی۔ اس لئے ترجموں میں خاص طور سے غیر ذمہ داری برتی گئی ہے۔ کہیں کہیں غیر زبانوں کا دخل، دخل بے جا بھی ہو گیا ہے۔ اور ایسے ترجمے ہوئے ہیں جو زبان کو عوام سے قریب لانے کی بجائے لے اور دور لے جاتے ہیں، ترجموں کو ناقابلِ فہم بنا دیتے ہیں۔

احتساب بڑی اہم چیز ہے۔ خاص طور سے زبان و ادب کے معاملے میں۔ کیونکہ یہ وہ میدان ہے جہاں بے اعتدالی کرنے پر کوئی قانونی گرفت نہیں ہوتی۔ ادب کے لئے سو طریقے احتساب کے مقرر ہیں۔ علم معانی، علم بیان، عروض یہ سب پیمانے ہیں اور ان پیمانوں سے ناپ تول کر نثر و نظم کو دیکھا جاتا ہے۔ پھر تنقید کے

ذریعے احتساب ہوتا ہے اور اس کے بعد خود تنقیدی اصول ہیں جو تنقید کا بھی احتساب کرتے ہیں۔ لیکن ترجمہ کا اگر کامیاب ہو تو بجائے خود تخلیقی ادب کا حصہ بن جاتا ہے اس کے احتساب کے کا کوئی اصول وضع نہیں کیا گیا ، اور نہ ایسے پیمانے بنا کر ترجمہ کرنے والوں کے سامنے رکھے گئے جو احتساب کے کام آسکیں۔

یہی وجہ ہے کہ دوسری زبانوں سے قطع نظر خاص طور ہماری زبان میں ایسے ترجموں کی کوئی کمی نہیں جو زبان و ادب میں اضافہ کرنے کے بجائے اسے اور نقصان پہنچاتے ہیں لب ولہجہ پر برا اثر ڈالتے ہیں اصل تصنیف کی طرف رغبت پیدا کرنے کے بجائے اس سے نفرت دلاتے ہیں اور اردو کے مزاج کو راس نہیں آتے۔

زبان کا مزاج

ہر زبان کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے ۔ یہ مزاج بالخصوص ترجمہ کے معاملے میں بہت اہم چیز ہے یہاں میں اس تفصیل میں نہیں پڑوں گا کہ یہ مزاج کیونکر بنتا ہے لیکن مزاج کے لفظ سے غلط فہمی دور کرنے کے لئے اتنا کافی ہے کہ زبان تقریباً ویسی ہی حقیقت ہے جیسے کسی قبیلے یا کسی خاص قوم کا مزاج (جسے ذرا بدل کر قومی تہذیبی روایت بھی کہتے ہیں) یہ مزاج تاریخی ، جغرافیائی ، سماجی اور معاشی اخلاط سے بنتا ہے اور کسی ایک خلط کی کمی بیشی اسی مزاج پر اثر انداز ہوتی ہے۔

پھر جس طرح ایک قوم کے مشترکہ مزاج کے اندر رہتے ہوئے کوئی خاندان یا فرد اپنا الگ مزاج بھی رکھتا ہے اسی طرح ہر زبان کے اندر الگ الگ زبانیں بھی ہوتی ہیں ۔ مشترکہ زبان پورے ایک سماج کی ہوتی ہے اور تاریخ کے ایک دور کی ہوتی ہے لیکن اسی ایک مشترکہ قومی زبان کے اندر الگ الگ لہجے ہوتے ہیں ۔ الگ الگ موضوعات کے جداگانہ حلقوں یا گروہوں کے لہجے ، خطوں کی بولیاں

طبقوں یا ایک ہی طبقے کی جداگانہ پرتوں کے رہن سہن اور حالات زندگی کے مطابق ان کی اپنی اصطلاحیں اور محاورے قبیلوں اور فرقوں کی تاریخی روایات کے مطابق تلمیحیں، تشبیہیں اور استعارے اور پھر ان سب کے بعد ایک مخصوص سماجی دور کی اصطلاحیں، ان سے ایک زبان کے اندر کئی زبانیں پیدا ہوتی ہیں، اور اس وقت تک قائم رہتی ہیں جب تک سماج متفرق رہتا ہے[1]۔

زبان کے مزاج کو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے دو مثالیں کافی ہوں گی۔

فارسی زبان ایک ایشیائی زبان ہے جس کا تعلق آریائی زبانوں کے خاندان سے ہے۔ پہلوی زبان کے قدیم ترین جاگیرداری عہد کی اعلیٰ تہذیب کے بنیادی عناصر اس میں شامل ہوئے۔ بعد میں کیانی خاندان کی زبردست ایشیائی سلطنت کے شان و شکوہ نے نفوذ کیا۔ اور اپنی عظمت اور خوش حالی کے نشان چھوڑے۔ مرکزی ایران کی زرخیز وادی کی آب و ہوا نے اسے لوچ بخشا۔ عربوں کے غلبے نے اس میں عربی الفاظ و اصطلاحات کی کثرت اور سطوت پیدا کی۔ منگول تاتار حملوں نے اور بعد میں طوائف الملوکی نے اس میں سوز و گداز کی کیفیت اور انفعالی اثرات پیدا کئے۔ قاچاری عہد میں انگریزی اور فرانسیسی تہذیب کے اثرات داخل ہوئے

---

[1] "متفرق" کا لفظ یہاں تشریح طلب ہے۔ محنت اور دولت کی تقسیم سے اس کا تعلق ہے۔ جہاں جس سماج میں جس قدر ہمواری بڑھتی جائے گی تفریق کم ہوتی جائیگی۔ مثال کے طور پر مردانہ اور زنانہ انتخابِ الفاظ اس سماج میں روز بروز گھٹتا جاتا ہے۔ جس سماج میں مرد و زن صنعت و حرفت میں دوش بدوش کام کرتے ہیں۔ — ظ۔ا۔

اور اب قومی آزادی کا عام شعور اور جمہوری تحریک اسے اپنے رخ پر ڈھال رہی ہے
فارسی زبان و ادب کو پچھلے ڈھائی ہزار برس میں کئی قوموں سے سابقہ پڑا ہے اور کئی زبانوں کے اثرات اس پر حاوی یا منتشر ہوتے رہے ہیں لیکن ان میں پائدار اثرات وہی نکلے اور وہی زیادہ سے زیادہ مقبول رہے جو اس زبان کے مزاج کو راس آئے اور جو اوپر سے تھوپے گئے تھے بیرونی دباؤ ہٹ جانے کے بعد وہ اثرات بھی زائل ہو گئے آج عربی زبان کی ان مشکل اصطلاحوں کا گذر فارسی میں نہیں ہے۔

جن کے لئے خود فارسی زبان کے الفاظ پہلے سے موجود تھے یا آسانی سے زبان پر رواں ہو سکتے تھے۔ البتہ کوشش کے باوجود ان عربی لفظوں اور اصطلاحوں کو زبان سے خارج نہیں کیا جا سکا جنہیں فارسی نے اپنا جزو بدن بنا لیا تھا۔
اسی اعتبار سے ایران پر فرانس کے مقابلے میں برطانیہ اور روس کا زیادہ اثر رہا لیکن دو سو برس برطانوی اثر کے باوجود فارسی زبان کا مزاج انگریزی کو اتنا قبول نہیں کر سکا جتنا اس نے فرانسیسی کو قبول کیا۔ جس طرح حروف تہجی اور آوازوں کی ادائیگی میں اپنی بہن سنسکرت کے ٹ۔ ڈ۔ اور ڑ کو قبول نہ کر سکی۔ اسی طرح اس نے انگریزی کی اصطلاحوں محاوروں اور الفاظ کے مقابلے میں فرانسیسی کو زیادہ قریب پایا اور اس کو اپنے اندر کھپایا ایک حرف ژ کا نہیں بلکہ مزاجی ہم آہنگی کا نتیجہ ہے کہ جدید ترین فارسی میں ہمیں فرانسیسی بلکہ روسی کے بھی درجنوں الفاظ ملتے ہیں اور فارسی زبان و ادب کا مغربی ادب سے جو رشتہ قائم ہوا ہے وہ فرانسیسی کے ذریعے سے ہوا ہے۔
اب جو لوگ فارسی میں انگریزی، روسی یا اردو زبان سے ترجمہ کرنا چاہیں۔

انھیں صرف لغت کا نہیں بلکہ فارسی زبان کی پچھلی تاریخ کا اس کے ارتقا کا اور اس کے مزاج کا بھی پورا احساس ہونا چاہئے تاکہ ان کا ترجمہ فارسی زبان وادب کو کچھ دے سکے اور اس کا جزو بدن بن سکے ۔

مصری اخبارات بلکہ ناولوں تک میں اس قسم کے محاورے ملنے لگے ہیں ـــــ

لَعِبَ بِدَورٍ خَطِیرٍ [1] ـــــ یہ محاورہ عربی زبان کے لئے بالکل اجنبی معلوم ہوتا ہے ۔ تحقیق کرنے سے پتہ چلا کہ یہ محاورہ صرف لکھا جاتا ہے، بولا نہیں جاتا کم از کم گفتگو کی سلیس زبان میں اس کا رواج نہیں ۔ انگریزی سے جو ترجمے عربی میں ہوئے ان میں ترجمہ کرنے والوں نے یہ پوری ترکیب یونہی اٹھا کر رکھ لی اب ترجموں میں یہ جوں کی توں لکھ دی جاتی ہے لیکن عربی زبان کے مزاج میں حل نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے کیونکہ عربی زبان میں یہی مفہوم ادا کرنے کے لئے دوسری گنجائشیں موجود ہیں ۔ ان گنجائشوں سے کام لیا جاتا تو انگریزی محاورے کا یہ مفہوم عربی زبان میں اضافہ کرتا اور اسی کا ایک حصہ بن جاتا ۔ لیکن اب یہ محض کورانہ تقلید کا ایک نمونہ یا حصہ ہے اور بیان کے بھدے پن میں اضافہ کرتا ہے ۔

یہ ایسی بات ہے جیسے ہمارے ترجمہ کرنے والے عموماً "It is going to be" کو لکھتے ہیں "یہ ہونے جا رہا ہے" حالانکہ اردو کی عام گفتگو میں اس کے لئے "یہ ہونے والا ہے ۔" موجود ہے ۔ کسی شعر میں "ہونے والا ہے" کی جگہ "ہونے جا رہا ہے" رکھ کر دیکھا جائے یا مثلاً "وطن کی فکر کر ناداں

---

[1] عربی میں یہ بالکل ایسا ہے جیسے ہم اپنی زبان میں کہیں "وہ ایک بڑے گھیرے سے کھیلا" جو ترجمہ ہے انگریزی کے He played great role کا ۔ اور مفہوم اس کا یہ ہے کہ اس نے زبردست خدمات انجام دیں ۔

مصیبت آنے والی ہے" کو "مصیبت آنے جارہی ہے" لکھئے تو معلوم ہوگا کہ منہ کا مزا خراب ہو گیا۔ یوں اگر دیکھئے تو "ہونے جارہا ہے کا مفہوم سوائے اس کے کچھ نہیں جو "ہونے والا ہے" کا مفہوم ہے لیکن "ہونے والا" دراصل ہماری زبان کے مزاج کو راس آچکا ہے اور اس کا ایک حصہ ہے۔ یہی حال "میں دلچسپی لینے" اور "میں یقین رکھنے" کا ہے جو لفظی ترجمہ ہے Taking Interest in- اور ــــــ Have faith in کا۔ حالانکہ ہمارے ہاں پہلے سے موجود تھا۔ "سے دلچسپی ہونا"، "پر ایمان لانا" "پر یقین کرنا" اور یہی بہتر بھی ہے۔

یہ محض ایک لفظ کی تبدیلی کا حال ہے۔ پورے پورے جملوں کی ساخت اور اصطلاحوں کے استعمال میں زبان کے مزاج کا اور زیادہ خیال رکھنا پڑتا ہے ورنہ وہ اوپری معلوم ہوتے ہیں اور کسی طرح کھپتے نہیں۔

ایک زبان میں کئی کئی زبانیں یہیں وہ نکتہ قابل غور ہے کہ ایک زبان کے اندر کئی زبانیں ہوتی ہیں، اور یہ زبانیں صرف طبقوں یا فرقوں یا ملتوں یا قبیلوں کے علیحدہ علیحدہ ہونے پر منحصر نہیں بلکہ ایک ایک فرد کے کردار اور ماحول کے مطابق ان میں اختلاف ہو سکتا ہے ایک ہی طبقے یا ایک ہی قومیت کے مختلف افراد ایک جگہ بیٹھے ہیں۔ ایک شخص چودھری یا صاحب اثر ہے اور دوسرا ایک عام آدمی۔ تیسرا وہ شخص جس کی بات بات میں مزاح اور چاشنی ہے بے تکلیلا پن ہے۔ چوتھا عالم فاضل قسم کی طبیعت رکھتا ہے۔ اور پانچواں خانہ زاد ملازم ہے کسی ناول میں ان کی ضیافت کا تذکرہ آجاتا ہے۔ وہ سب اپنی اپنی بات کہتے ہیں۔ اور ان کا ترجمہ کرنا مقصود ہے تو ظاہر ہے کہ صاحب نظر ادیب یا مصنف نے اپنی زبان

یں وہاں جو جملے ان پانچوں کی زبان سے ادا کئے ہوں گے وہ پانچ الگ الگ جھلکیاں رکھتے ہوں گے ۔ ہوسکتا ہے کہ بظاہر ان پانچ قسم کی گفتگوؤں کے الفاظ میں نمایاں فرق نہ ہو لیکن ان الفاظ کا پس منظر ان کے الفاظ کا لہجہ ان کی ادائیگی اور تلفظ اور پھر جملوں کی ساخت ایسی ہو گی جو ہلکے سے اشارے میں ہر ایک فرد کے اپنے مزاج اور اپنی سماجی حیثیت کا پتہ دے گی ۔ یوں نہ ہو تو ترجمے میں اصل کی تصویر دھندلا جائے ۔

اگر ترجمہ کرنے والا ایک زبان کے اندر کئی زبانوں کے راز سے ناواقف ہے تو وہ لفظ بہ لفظ لغوی ترجمہ کرتا چلا جائے گا اور وہ جو مفہوم اور اشارے ان الفاظ کی پشت سے جھانک رہے ہیں ترجمے میں غائب ہو جائیں گے ۔ اردو کے اکثر ترجمے میں نے ایسے دیکھے ہیں جن میں یہ نقص ناقابل برداشت حد تک پایا جاتا ہے ۔ نام لینا ضروری نہیں لیکن جن لوگوں نے ناولوں کے قلم برداشتہ اور سب سے زیادہ ترجمے کئے ہیں ان کے یہاں یہ خامی خصوصیت سے پائی جاتی ہے اور ترجمے کے وقار کو گرا دیتی ہے ۔

زبان کے اندر زبان کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ زبان ایک ہی ہے لیکن مختلف پیشوں ، طبقوں اور مختلف زمانوں میں الفاظ و محاورات کا استعمال اور ان کی ادائگی بدلتی رہتی ہے ۔ بائبل (انجیل) کے کئی مستند انگریزی ترجمے ہوئے ہیں اور یہ ترجمے ۔ لاطینی ، یونانی ، عبرانی اور انگریزی کے بڑے بڑے ماہرین نے مل کر کئے ہیں ۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ آسان انگریزی استعمال کرنے کے باوجود ان میں خاص خیال اس بات کا رکھا گیا ہے کہ کلام ربانی کی شان باقی رہے اور

آج تک برابر اسی کی پابندی ہو رہی ہے - پروٹسٹنٹ تحریک جو بائبل کو علاقائی یا لوئے دیسی زبان میں منتقل کرنے پر کفر کے فتووں کا سامنا کر رہی تھی اس نے بھی بائبل کا ترجمہ کرتے وقت اس نکتے کو ملحوظ رکھا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ جب عام انگریزی میں کسی کیریکٹر کی زبان سے ایسا جملہ ادا کرنا ہوتا ہے جس میں کلام ربانی کی سی شان ہو تو اسے انجیل کے انداز بیان سے ملا دیا جاتا ہے اگر کوئی شخص اس طرح حتمی یا آخری بات کرتا ہے گویا وہ ہر راز سے ہر معاملے سے آشنا واقف ہے کہ اس سے زیادہ یا جز ہونا ممکن نہیں - یا کوئی شخص اپنی گفتگو اور اپنے احکام میں مذہبی تقدس کی چاشنی یا اس کا سا رنگ ابھارنا چاہتا ہے - تو اس کی زبان سے ایسے جملے نکلے جاتے ہیں جو سادہ انگریزی میں ہونے کے باوجود اپنے گرد تقدس کا ہالہ رکھتے ہیں - اور انجیل کے جملوں، استعاروں، کہاوتوں اور روایتوں سے مشابہت پیدا کر لیتے ہیں - اب اگر کوئی شخص انگریزی سے ان کا ترجمہ کرے تو اسے یہ بات پیش نظر رکھنی ہوگی کہ کہاں سے اصل عبارت کا انداز انجیل کی زبان سے مشابہت رکھتا ہے اور جہاں سے جملوں میں یہ صورت پیدا ہوئی ہے - وہیں سے ترجمے کی عبارت میں بھی تبدیلی کرنی ہوگی - اور جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے اسی زبان میں بھی اسی لب ولہجہ کے مقدس پر شکوہ، پر تکلف الفاظ و محاورات تلاش کرنے ہوں گے - جن سے کلام ربانی کی جھلک ملے - مثلاً ایک شخص جو تشی ہے وہ کسی کا ہاتھ دیکھ رہا ہے اور اپنے معمول کو بتاتا ہے کہ یا تو تم فلاں فلاں پر ایمان لاؤ - ورنہ or less ye forever be condemned اب اگر ایمان کی بجائے انگریزی لفظ "Confidence" کا ترجمہ یقین بھروسہ یا اعتماد لکھ دیا گیا اور

اس کے بعد والے جملے کا ترجمہ سیدھا سادہ کر دیا گیا کہ "ورنہ تم ہمیشہ مصیبت میں رہو گے" یا "ہمیشہ تم دھتکارے جاؤ گے" تو اصل عبارت کی غرض اور فضا غارت ہو جائے گی۔ کیونکہ انگریزی کا جملہ خاص انجیل کی عبارت کا حصہ ہے اور اسے ترجمے میں ایسے آنا چاہئے جیسے کوئی مقدس برگزیدہ ہستی ارشاد فرما رہی ہے اور ربانی احکام پہنچا رہی ہے۔ اس جملے کا بہتر ترجمہ یہ ہوگا "ورنہ ابد تک معتوب رہو گے۔"

اسی طرح زبان کے اندر کئی زبانیں ہوتی ہیں مثلاً ایک زبان جدید ہے ایک قدیم ہے اور دونوں ایک ہی زبان کا حصہ ہیں۔ فرق صرف زمانے کا ہوتا ہے۔ میر انیس کی زبان آج بھی سند مانی جاتی ہے لیکن وہ گفتگو میں جو زبان بولتے ہوں گے۔ اور آج کی گفتگو کی زبان میں فرق نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ مثلاً وہ اپنے یہاں مجلس میں آنے والوں کی تواضع کرتے ہوئے کہا کرتے تھے "صاحبو جاگہ ادھر ہے" اب اگر اس زمانے کے شرفائے لکھنؤ کے جیسے کسی کردار کی گفتگو کا ترجمہ کرنا ہو تو یہ نہیں "حضرات ادھر تشریف رکھئے" نہیں بلکہ وہی لکھنا چاہئے "صاحبو جاگہ ادھر ہے" تبھی ترجمے میں اصل عبارت کی چاشنی پیدا ہوگی۔ قدیم وضع کے کرداروں کی زبان میں اور جدید انداز کی بات چیت اور گفتگو میں جو فرق ہمارے یہاں ہے ترجمے میں بھی اسکا لحاظ رکھنا پڑیگا ایک زبان کے اندر کئی زبانوں کی تیسری صورت یہ ہے کہ بود و باش اور معاشی حالات کا بھی زبان سے گہرا تعلق ہے۔ ایک شخص جس کا پیشہ کاشتکاری ہے چوپال میں تقریر کرنے کھڑا ہوگا تو چاہے اس کا موضوع بھی گرام سدھار سے متعلق کیوں نہ ہو لیکن اس کی زبان میں اور شہر سے آئے ہوئے گرام سدھار افسر کی زبان میں فرق ضرور ہوگا۔ دونوں کی اگر اصطلاحیں بھی ایک مان لی جائیں

تب بھی جملوں کی ساخت میں پیچیدگی کے سبب انٹرپریٹر کا ترجمے میں ان الگ دھاریوں کا بھی خیال رکھنا چاہئے اول تو اصل عبارت ہی اس فرق کو ظاہر کردے گی۔ تاہم ممکن ہے یہ فرق بظاہر نہیں بلکہ زیادہ غور کرنے سے ہاتھ آئے تو ایسے موقعوں پر زیادہ غور کرنے اور دونوں کی تقریر کو الگ الگ الفاظ اور جملوں سے واضح کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ کچھ لوگ آسانی اور اختصار کے خیال سے یا بے پروائی سے اسی فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ گرام سدھار کا افسر تقریر کرنے کھڑا ہوتا ہے وہ بھی انھیں مسائل کو چھیڑتا ہے۔ زبان کی قواعد اور الفاظ کی صحیح ادائیگی کا اتنا ہی خیال رکھتا ہے اور ایک عام کھیت مزدور یا نیم خواندہ کسان بھی انہی الفاظ، عبارتوں اور جملوں کو بے تکلفی سے ادا کرتا ہے۔ اگر ایسا کیا گیا تو ترجمے میں مصنوعی پن (یہ لفظ میں نے تصنع کی جگہ لکھا ہے) پیدا ہو جائے گا۔ کیونکہ اصل زندگی میں ایسا نہیں ہوا کرتا۔

مثال لیتے ہیں: ایک معمولی کسان اجنبی شکاری کو اپنا مہمان بناتا ہے اور اس سے کہتا ہے "تشریف لے چلئے۔ نان شبینہ تناول فرمالیجیے" تو یہ اصل عبارت ——

(Come in and have your dinner)

کا صحیح ترجمہ ہوتے ہوئے بھی غلط ہے کیونکہ ایک زبان کے اندر کئی زبانیں ہیں۔ دیکھنا ہوگا کہ ڈنر کا لفظ ایک معمولی کسان کی زبان سے ادا ہوگا۔ تو اردو میں کیا ہوگا اور کسی پڑھے لکھے جاگیردار کی زبان سے ادا ہو تو کیا ہوگا۔ رات کے کھانے کی طرف کسی کو متوجہ کرنے کے لئے کئی قسم کے جملے موجود ہیں اور یہ کئی قسم کے لوگ الگ الگ بولتے ہیں۔ ہمارے یہاں کے غریب کھیت مزدور کے یہاں رات کا

کھانا میز پر نہیں چنا جاتا - لیکن برطانیہ کے دیہاتی کاشت کار سے یہ توقع کی جا سکتی ہے اور ہمارے جاگیردار ور کھاتے پیتے زمیندار گھرانوں میں "دستر خوان چنا جا چکا ہے" یا "تھال لگ گیا ہے" یا "ماحضر تیار ہے" یا "نان شبینہ حاضر ہے" - ایسے جملے ہیں جو مختلف معاشرت کے لوگوں میں علاحدہ علاحدہ بولے جاتے ہیں - ان کئی زبانوں کا امتیاز سمجھنا اور انھیں حسب موقع ترجے میں استعمال کرنا بے حد ضروری ہے ورنہ اصل کا سارا مزا کرکرا ہو جائے گا - ایسا ہی "کرکرا پن" وہاں پیدا ہوا ہے. جہاں روس کے شاعر اعظم "پوشکن" کے ایک مشہور افسانے کا عنوان انگریزی میں "اسٹیشن ماسٹر" دیا گیا - اور اردو میں جوں کا توں لے لیا گیا - روس میں وہ کردار اس چوکی کے غریب، تباہ حال اور بے بس، تھکے ہارے منشی کی نمائندگی کرتا ہے. جو ریلوں کا دسیع جال بچھنے سے پہلے کسی گاؤں یا کارواں سرائے کے ناکے پر بدلی کے گھوڑے مہیا کیا کرتا تھا. کوئی افسر اسے ڈانٹتا ہے - کوئی مالدار بیوپاری اسے ذلیل کرتا ہے. کسی کو اچھے گھوڑے درکار ہیں اور وہ مہیا نہیں کر سکتا - آخر ایک جوان افسر چالاکی سے اس کی بیٹی اغوا کر کے چل دیتا ہے - یہ آدمی شروع ۱۹ویں صدی کے روس میں تو تھا، انگلستان میں نہیں تھا، وہاں اسٹیشن ماسٹر تھا — (ریلوے اسٹیشن کا بڑا افسر) ہندستان کا اسٹیشن ماسٹر تو اس سے بھی دو ہاتھ آگے خوشحال، بااثر اور افسرانہ شان کا آدمی ہوتا تھا - اب اگر "پوشکن" کے اس کردار کو ہم، انگریزی کی تقلید میں اسٹیشن ماسٹر لکھ دیں تو افسانے کی روح فنا ہو جائے گی - وہ ہمارے یہاں ڈاک چوکی کا منشی ہے اور یہی نام دیا جانا چاہئے تھا -

یہاں ایک نقل کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔

قرآن کا ترجمہ مختلف مفسرین نے کیا ہے۔ ان میں سب سے آسان اور روزمرہ کا ترجمہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کا سمجھا جاتا ہے۔ موصوف شستہ اور بامحاورہ زبان لکھنے میں اپنی مثال آپ تھے۔ "امہات الامۃ" لکھتے وقت بھی اسی صفت کو برت گئے اور برے پھنسے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راتوں رات مکہ سے باہر تشریف لے جانے کا تذکرہ یوں کیا کہ "وہ راتوں رات سٹک گئے"۔ یہ "سٹک" کا لفظ اگرچہ عوام کی بول چال میں استعمال ہوتا ہے لیکن پیغمبر کی شان میں یہی لفظ ایک گستاخی سمجھا گیا۔ اور اسی طرح کے الفاظ کی بنا پر ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمے کے خلاف عام جلوسوں میں تجویزیں پاس ہوئیں اور بہت شور مچا۔

"سٹک گئے" یا "سرک گئے" یا "کھسک گئے" کی جگہ "نکل گئے" یا "باہر تشریف لے گئے" یا "چلے گئے" یا "روپوش" ہو گئے" بھی استعمال ہو سکتا تھا۔ اور ان میں آخری لفظ اگرچہ اتنا عام فہم نہیں تھا پھر بھی اس شخصیت اور خاص حالات کے بارے میں یہی لفظ زیادہ مناسب رہتا۔

نقل اور آرٹ ترجمہ بھی اسی طرح اصل کی ایک نقل ہے جیسے جیسے رقص یا مصوری یا اداکاری، جیسے میں بدن کے لوچ سے، مصوری میں موقلم سے، اداکاری میں جسم اور آواز کی حرکات و سکنات سے اصل خیال کا ہو بہو ترجمہ کرنا پڑتا ہے اور ترجمے میں زبان دانی کی صلاحیت سے یہی کام لیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت کی کوئی نقالی مکمل نہیں ہو سکتی، جب تک اس نقل کرنے والے کا جذبہ

اندرون" شامل نہ ہو۔ وہ اداکاری بے روح ہوگی جو اصل کردار کو اپنے اندر جذب کرکے اور خوب رچا کر پھر سے ایک نئے وجود کو جنم نہیں دیتی جس میں اصلیت اپنی تمام خصوصیتوں کے ساتھ ابھر کر سامنے آئے اور نقل کا یا نقل کرنے والے کا اپنا وجود نظروں سے اوجھل ہو جائے۔

عربی داستانوں میں ایک واقعہ نقل ہوا ہے کہ ایک شخص کی تصویر کو بے مثل قرار دیا گیا اور وہ تصویر شاہی دربار کے دروازے پر لٹکا دی گئی کہ اگر کسی کو اس کے بے مثل ہونے میں شبہ ہو تو وہ دلیل پیش کرے۔ تصویر یوں تھی کہ ایک انسانی ہاتھ میں انگور کا خوشہ ہے ——— کچھ انگور پکے ہیں کچھ کچے، تصویر کا آویزاں ہونا تھا کہ طوطوں اور چڑیوں نے اس پر ٹھونگیں مارنی شروع کر دیں لوگوں نے اسے مصوّری کا کمال جانا کہ جانور بھی دھوکا کھا گئے اور سچ مچ کا انگور سمجھے لیکن ایک شخص دربار میں حاضر ہوا اور اس نے مصوّر کے کمال کو چیلنج کر دیا اس نے کہا کہ انگور کے خوشے تو واقعی انگور نظر آتے ہیں لیکن انسانی ہاتھ کی مصوّری میں ضرور کوئی نقص رہ گیا ہے ورنہ چڑیوں کی مجال نہ ہوتی کہ وہ اس پر ٹھونگیں ماریں یعنی تصویر کے ایک حصّے پر مصوّر کی توجہ اتنی زیادہ رہی کہ دوسرا حصہ نظر انداز ہو گیا اور نقل اتارنے میں فرق آگیا۔ یہ دلیل مان لی گئی، اور تصویر اتار دی گئی۔

نقل وہی بے عیب اور اعلیٰ ہے جو اصل کے ہر گوشے اور ہر پہلو کو من و عن نظر کے سامنے کر دے اور وہ بھی اس طرح کہ جو امکانات اصل میں موجود ہیں لیکن بظاہر نظر نہیں آتے وہ بھی نظر آنے لگیں۔

ترجمہ کرنے والے کو اصل کی نقل میں ایک مصنف اور اداکار کی طرح مصنف کے ساتھ ہلاک ہونا پڑتا ہے اس کے ساتھ تالیاں بجانا، قہقہے لگانا اور کراہنا پڑتا ہے۔ اور یہ سب کرلینے کے باوجود یوں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھانا پڑتا ہے جیسے طوطا اڈان پر چلتا ہے، تب جاکر ترجمہ ایک آرٹ بنتا ہے اور تخلیقی درجہ حاصل کرنے کے قریب پہنچتا ہے۔

مگر

دوسرے فنونِ لطیفہ میں اور اس ترجمے میں جو آرٹ اور تخلیق کا درجہ رکھتا ہے ایک بنیادی فرق بھی ہے۔

شاعری اور مصوری میں مبالغہ ایک حسن ہے۔ حقیقت کو لفظوں اور تصویروں میں اصل سے بڑھا چڑھا کر پیش کرنا اور جس پہلو پر دیکھنے یا سننے کی توجہ مرکوز کرتی ہے اسے خوب ابھار دینا یا اسے اصلیت سے بالکل مختلف شکل اس طرح رکھنا .... کہ اصل تصویر یا اصل واقعے پر نظر جانے کی بجائے اس کے امکانات اس کے اثرات، اس کی تاثیر پر نظر جائے، یا ایسا باریک نقاب ڈال دینا کہ مخصوص گوشوں کی حقیقت بے نقاب ہو جائے۔ جو بات اصل کی محض نقل نہیں ہو سکتی تھی وہ آرٹ کی اس تخلیق میں حاصل ہو جاتی ہے کہ اس میں اصل کو اپنے اندر جذب کر کے ایک نئے وجود کو یا نئی تصویر یا واقع کو جنم دینا ہوتا ہے جو اصل سے تعلق بھی رکھتا ہے ــــ اور بے تعلق بھی۔ فنی تخلیق کے اس مقصد کی خاطر ہر ایک فنکار کو اپنے اپنے میدان میں کافی آزادیاں ملی ہوئی ہیں۔ وہ ”ناز و غمزہ“ کی بجائے ”دشنہ و خنجر“ کہہ سکتا ہے اور علم و دانش کے مفہوم کے لئے الّو کی محض دو گول آنکھیں

بنا سکتا ہے۔ ذرات کو آفتاب سے اور ممولے کو شاہین سے بھڑا سکتا ہے۔ لیکن ترجمہ کرنے والے کو اصل کی نقل اور اصل کے سارے امکانات پیش کرنے کے لئے یہ تمام آزادیاں میسر نہیں ہوتیں۔ وہ اپنی طرف سے نہ مبالغہ کر سکتا ہے نہ الفاظ کی رنگ آمیزی۔ اس کا فرض "کج دارومریز" ہے کہ دودھ کا بھرا پیالہ چھلکنے نہ پائے۔

یہ فرض ادا ہونے کے معنی ہیں کہ ترجمہ محض ایک بے روح نقالی نہیں رہ گیا بلکہ اصل کی ایسی نقل بن گیا جو اصل کے سارے امکانات بے کم و بیش اپنے اندر رکھتی ہے۔ لیکن یہ ہو کیوں کر؟

اس کے لئے ضروری ہے کہ ترجمے میں اصل کا پورا خیال اور مفہوم، اسی لہجے یا نرمی، اسی سختی یا درشتی۔ اسی جاذبیت یا دلکشی اور اسی بے کیفی یا بے رنگی کے ساتھ اسی احتیاط کے ساتھ آئے اور ویسا ہی معیار زبان و بیان کا بھی ہو۔

خیال و مفہوم اور اس کا جامہ

دراصل ترجمے کا بنیادی منشا ہی اصل کے خیال اور مفہوم کی ادائیگی ہے اور اسی منشا کو پورا کرنے کے لئے زبان اور بیان کا پورا پورا علم اور مکمل اندازہ ضروری ہوتا ہے۔

اس کی کم از کم تین شرطیں ہیں :-

۱۔ جس زبان سے ترجمہ کیا جا رہا ہے اس زبان کی لغت سے، اصطلاحات اور محاروں سے، کسی قدر ادبیات سے اور تھوڑی بہت تاریخ سے واقفیت اور نکھرا ہوا ذوق ضروری ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جس زبان کی تصنیف کا ترجمہ کرنا

ہے اس زبان پر بھی ترجمہ کرنے والے کو ماہرانہ عبور حاصل ہو، یا وہ اصل عبارت یا اصل تصنیف والی زبان میں خود بھی اسی طرح بے تکلف اور بے تکان لکھ سکتا یا بول سکتا ہو۔ بلکہ اس زبان کا صرف کتابی علم کافی ہے۔ اگر کتابی علم بھی نہ ہوا تو خیال کی نزاکتیں ہاتھ سے نکل جائیں گی۔ اصل عبارت کی نوک پلک پر ترجمہ کرنے والے کا دھیان نہیں جائے گا۔ اور وہ اسے ترجمے میں منتقل کرنے کی وجہ سے غافل رہے گا۔

اصل تصنیف یا اصل عبارت کی زبان کا علم صرف کتابی نہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہو تو اور اچھا ہے۔ جتنا زیادہ ہو اتنا ہی اچھا۔ لیکن کم از کم اتنا ضرور ہو کہ اصل عبارت سے سیاق و سباق کو سمجھ سکے۔ یہ پا سکے کہ فلاں قسم کا لفظ نظر انداز کر کے فلاں مصنّف نے یہ لفظ خاص اس مقصد سے رکھا ہے۔ یہ مقصد اگر سمجھ میں آجاتا ہے تو پھر اس زبان میں جس میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ اس مقصد کو کسی ہم پلّہ لفظ سے پورا کیا جا سکے گا ورنہ نہیں۔

لفظ اور لغت ہم پلّہ لفظ کے سلسلے میں ایک نکتہ بے حد اہم ہے وہ یہ کہ کسی ایک زبان کے الفاظ کے ہم پلّہ لفظ دوسری زبان میں بہت کم ہوتے ہیں ممکن ہے کچھ سات فیصدی سے زیادہ نہ ہوتے ہوں وہ بھی اسما اور افعال میں یکر دو الفاظ جو ہم روزمرہ بولتے اور لکھتے ہیں۔ اور جو عام لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوتے ہیں۔ اگر غور کیجئے تو ان کے مرادف لفظ بالکل اسی قدر و قامت، اسی مفہوم اسی کیفیت اور اسی چاشنی کے لفظ انگریزی جیسی وسیع اور مالا مال زبان میں نہیں ملیں گے۔ مثلاً عیب، ہنر، سلیقہ، رچاؤ، چاشنی، الاؤ، شور، جوڑ توڑ، آنکھ

کا پانی، آڑ، یہ سب معمولی استعمال کے لفظ ہیں اور لغت میں ان سب کے ہم معنی الفاظ بھی دیے ہوتے ہیں مگر بعض خاص پہلو لیے سینکڑوں الفاظ میں جو ان کے ہم معنی انگریزی لفظوں میں نہیں ہوں گے۔ اور اسی طرح ہم معنی انگریزی لفظوں کے اور پہلو ایسے ہوں گے جو ان ہندوستانی لفظوں سے سروکار نہیں رکھتے۔ اس لیے ہر ایک ہم معنی الفاظ لازمی طور سے ہم پلہ لفظ نہیں ہوتا - یہ نہ تو اردو کی کوتاہی کا ثبوت ہے نہ انگریزی کی وسعت کا مثلاً چاٹ، چٹخارا، چسکا اور ٹھرک قریب قریب ہم معنی لفظ ہیں، لیکن ہر ایک میں کتنی برابر فرق پڑتا ہے - کمپرومائز (Compromise) عام استعمال کا ایک انگریزی لفظ ہے جسے ہم اپنے روزمرہ میں شمار کرنے لگے ہیں - لیکن انگریزی میں اس کا مفہوم سمجھوتے کے علاوہ بھی ہے یعنی ... پر آنچ آنے دینا یا جوکھم، لغت سے مدد لے کر بھی ہم اس کا کوئی ہم پلہ یا برابر کا لفظ نہیں چن سکتے - چناں چہ جس طرح یہ حقیقت ہے کہ دنیا کی کوئی زبان دوسری زبان کی لغت پیش نظر رکھ کر نہیں بنائی گئی اسی طرح یہ بھی واقعہ ہے کہ ہر زبان کے بیانیہ الفاظ، محاورات، روزمرہ اور صفات (اسی نہیں) خود وہیں کے سماجی حالات، تاریخی دور یا تہذیبی ارتقا سے پیدا ہو جاتے ہیں یا ان کے معنی میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے - دو یا کئی زبانوں کے لفظ کا ہم معنی ہونا مگر ہم پلہ نہ ہونا ایک طرف تو یہ جتاتا ہے کہ لفظ کے مفہوم کو لفظ سے ادا کرنا اکثر اوقات غلط ہے اور دوسری طرف کوئی یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتا کہ ایک خاص مفہوم جسے ایک ترقی یافتہ زبان میں یوں ادا کیا گیا ہے - وہ دوسری ترقی یافتہ زبان میں کسی طرح ادا کیا ہی نہیں جا سکتا ہر ایک ترقی یافتہ زبان میں نازک سے نازک مفہوم ادا کیا جا سکتا ہے

پھر وہ کیا شے ہے جو نازک سے نازک مفہوم کو ادا کر سکتی ہے؟ وہ ہے ترتیبِ الفاظ اسی بات کو ایک جملے میں کہا جا سکتا ہے کہ اہمیت لفظ کی نہیں ہوتی اہمیت لفظوں کے تال میل کی ہوتی ہے، یہاں بھی فرد بے جماعت یوسف بے کارواں ہے۔ جو منصب کسی لفظ کو جملے یا عبارت میں حاصل ہے۔ وہی منصب اس کے معنی اور اس کی حیثیت طے کرتا ہے۔ لفظ کا ہم پلہ ہونا ترجمے کی خوبی نہیں بلکہ ترجمے کی خوبی ہے الفاظ کی ترتیب اور اس ترتیب سے پیدا ہونے والے خاص مفہوم کا ہم پلہ ہونا اس لئے ترجموں کو لفظوں کے تال میل، ان کی تبدیش اور جملے کے مفہوم کی کسوٹی پر ہی پرکھا جا سکتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو آوازوں کے اتار چڑھاؤ یا کھٹکے کی کیفیت بھی ترجمے میں اہمیت رکھتی ہے۔ مثلاً سعادت حسن منٹو کا مشہور افسانہ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" ایک دیوانے کی بڑ ہے۔ مگر با معنی بڑ ——— اپنی آواز کی بدولت وہ پنجاب کے بٹوارے کے خلاف ایک ہولناک چیخ بن گئی۔ کسی بھی زبان میں اس کا ترجمہ کیا جائے تو "مونگ کی دال" اور "گالیوں" کے الفاظ کا ترجمہ نہیں ——— ان لفظوں کی صوتی کیفیت کا بعینہٖ کسی صورت سے ریکارڈ کرنا لازم ہوگا۔

یہیں سے پتہ چلتا ہے کہ کیوں لیجے ترجموں کو لغت سے صحیح یا عمدہ ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اول تو عام طور سے لغتوں کی ترتیب ان غیر ملکیوں کے ہاتھوں ہوتی ہے جو دونوں یا تینوں زبانوں میں کوئی ایک مادری زبان رکھتے تھے اور دوسری یا تیسری سے محض کتابی۔ مگر گہری واقفیت۔ مادری زبان اور علمی زبان کی آگاہی میں یوں بھی بڑا بل ہے۔ اردو اور انگریزی کے الفاظ سے متعلق جتنے درجنوں لغت ہمارے پاس موجود ہیں ان میں مولوی عبدالحق اور پلاٹس (PLATTS) کا لغت سب سے

مستند سمجھے گئے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کو ان دونوں لغات سے اکثر واسطہ پڑتا ہے وہ بے ایمانی سے بارہا دوچار ہوئے ہوں گے۔

لغت کا کام اگر ترجمے میں مدد دینا ہے تو ایک زبان سے دوسری یا تیسری زبان کا کوئی ایسا لغت مکمل اور مستند اور بے عیب نہیں ہو سکتا جسے صرف ہم زبان لوگوں نے مل کر تیار کر دیا ہو۔ مثلاً اگر روسی اردو یا اردو روسی ترجمہ کرنا ہو تو صرف اسی لغت کا تکیہ کرنا چاہئے جسے دونوں اہل زبان فریقوں نے باہمی کوشش سے ترتیب دیا ہو۔ اور یوں کبھی ایک سے زیادہ زبانوں کا لغت اسی صورت سے ترتیب دیا جانا چاہئے۔

مختصر یہ کہ لغت کام تو دیتا ہے مگر کم۔ جو چیز لغت سے زیادہ کارآمد ہے وہ ہے اس زبان کے ادب کا وسیع اور عام مطالعہ جس سے ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر میرے سامنے اردو کا ایک تازہ ترین ترجمہ رکھا ہوا ہے جس کا موضوع سیاسی بحث ہے۔ اس کے مترجم خود ایک سیاسی سوجھ بوجھ کے آدمی ہیں اپنی زبان پر انھیں کافی قدرت حاصل ہے اور وہ اپنی زبان میں بے عیب لکھ اور بول سکتے ہیں لیکن ترجمے میں کئی گوشے خالی پڑے ہیں۔ اصل کتاب روسی زبان میں لکھی گئی ہے۔ وہاں سے انگریزی میں ترجمہ ہوئی۔ انگریزی سے اردو میں لائی گئی ——— انگریزی عبارت میں ایک جگہ لکھا ہے کہ یہ آئین چھوٹی بڑی قوموں کے (Equilibirium) پر قائم ہے اب اگر لغت کھول کر دیکھا جائے تو "آکوی لی بریم" کے معنی ملیں گے۔ "توازن" "غیر جانبدارانہ حالت" وغیرہ۔ ذی علم ترجمہ کرنے والے نے یہی لفظ وہاں اٹھا کر رکھ دیا ہے۔ حالاں کہ اگر مفہوم محض توازن یا غیر جانب داری ہوتا تو Balance یا

لکھا جا سکتا تھا۔ اصل مصنف State of neutrality
نے ان الفاظ کو رد کر کے خصوصیت سے Equilibirium
لکھا تو اس کے پورے مفہوم میں کچھ اور بھی شامل ہے۔ کیا شامل ہے؟ یہ بات پوری عبارت سے اور اس لفظ کے سارے امکانات کو جاننے سے یہی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں غیر جانب داری اور توازن کے ساتھ برادرانہ تعلقات اور ہم آہنگی کا مفہوم بھی پوشیدہ ہے۔ چنانچہ ایسے موقعے پر "اکوی لی بریم" کا ترجمہ اگر جذبِ باہم[1] اور ہم آہنگی کیا جائے تو ترجمہ مصنف کے مفہوم کو پوری طرح ادا کر سکے گا۔

۲۔ دوسری شرط یہ ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کرنا ہے۔ اس پر ماہرانہ عبور حاصل ہو۔ تصنیف کی زبان سے کہیں زیادہ قدرت اس زبان میں ہونی چاہئے جس میں ترجمہ کرنا مقصود ہے یہاں تک کہ اس زبان میں خود لکھنے کی اچھی خاصی مشق اور اس زبان کا پہلودار علم ہونا چاہئے۔ پہلودار علم سے مراد یہ ہے کہ اس کے ماخذ کا جہاں جہاں سے وہ سیراب ہوتی ہے۔ ان سرچشموں کا، اس کے نشیب و فراز کا علم ہو، الفاظ کہاں سے آئے، کیوں کر آئے، ان کے لغوی معنے کیا تھے۔ اصطلاحی معنی کیا ہو گئے اور کیا کیا ہو سکتے ہیں۔ ان کے روزمرہ اور محاورے کیونکر بنے، انھیں مختلف موقعوں پر کیسے کیسے استعمال کیا گیا۔ اور آئندہ کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ان میں مختلف اوقات میں کیا تبدیلیاں ہوئیں اور

---

[1] ظاہر ہے کہ یہ لفظ ہمیں علامہ اقبال کے ادب سے مل جاتا ہے۔
" جذبِ باہم جو نہیں محفلِ انجم بھی نہیں "

ان تبدیلیوں کی بنیاد پر اور کیا تبدیلیاں ممکن ہیں۔ ان کی مدد سے اور نئے سانچے کیسے بن سکتے ہیں۔ ایک ہی لفظ کتنے مفہوم اپنے دامن میں سمار رکھتا ہے۔ اور ایک ہی مفہوم کو جب مختلف نسبتوں سے ادا کیا جائے تو اس کے لئے کتنے کتنے مختلف وزن کے الفاظ موجود ہیں۔

ارتقائی عمل

یہ باتیں جاننے کے لئے عمر نوح کی ضرورت نہیں اور نہ یہ کہ پہلے ایک زبان کو آخری تہ تک کھنگال ڈالنے اور غوطے لگانے سے فراغت حاصل کر لی جائے تب جاکے آدمی ترجمے کے لئے قلم اٹھائے۔

کسی زبان کا اس درجہ علم ہونا دراصل ایک ارتقائی عمل ہے۔ یہ دھیرے دھیرے ہوتا رہتا ہے اور اگر توجہ رکھی جائے تو ترجمے کے دوران ہی یہ عمل جاری رہتا ہے۔ خود ترجمہ اس سلسلے میں تربیت گاہ بن جاتا ہے۔ لیکن اگر اس توجہ کو غیر ضروری سمجھ کر ڈال دیا جاتا ہے تو کبھی نہیں اٹھتا۔ لوگوں کی عمریں گزر گئیں ترجمے کرتے کرتے لیکن اب تک اس قابل نہیں ہوئے کہ جس زبان میں روزانہ ترجمہ کرتے ہیں اسی زبان کے الفاظ، محاورات، ترکیبوں، استعاروں اور تلمیحوں کا پورا مفہوم سمجھ سکیں، خود لکھنا تو درکنار۔

اس ارتقائی عمل کی پہلی منزل یہ ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کرتا ہے اس زبان کے ادب سے بنیادی واقفیت ہو اور دروجاری رہے جتنا ممکن ہو قدیم اور جدید ادب کا مطالعہ بڑھایا جائے۔ ادب ایسا وسیع میدان ہے کہ اس میں مختلف موضوعات کسی نہ کسی سمت سے آہی نکلتے ہیں اور اس طرح مختلف موضوعات اور شعبوں سے مثلاً معاشیات تاریخ، فلسفہ، عمرانیات، جغرافیہ، مذہبیات، سیاسیات وغیرہ کی اصطلاحوں اور ترکیبوں سے جان پہچان۔

بڑھتی ہے، بیان کی نئی نئی صورتیں، نئے نئے اسلوب معلوم ہوتے ہیں اور پھر آسانی ہو جاتی ہے کہ پڑھنے والے کا رجحان جدھر زیادہ ہو وہ اسی طرف رخ کرے اور اسی موضوع کی کتابوں کا اور مباحث کا مطالعہ اختیار کر لے جب یہ صورت ہو جاتی ہے تو اس خاص شعبے یا موضوع کی کتابوں کا ترجمہ آسان نظر آنے لگتا ہے۔ اور پھر جب اس موضوع پر مستقل تصانیف یا مضامین کا ترجمہ کوئی کرنے بیٹھے تو اسے یہ تو نظر رکھنا چاہئے کہ جن جن الفاظ کی خاص طور سے اس کو ضرورت پڑتی ہے یا جن سے پہلا واسطہ پڑتا ہے اگر ان کے مترادفات رواں نہیں ہوتے ہیں تو بنا بنا ساتھ ان کی تخلیق کرتا جائے، ان کی ایک فہرست تیار کر لے جس پر بار بار رنڈا پھیرتا رہے تو خود ہی اگلی منزلیں آسان ہوتی چلی جائیں گی۔ ورنہ روزمرہ استعمال کے لفظوں کی طرف سے بھی غفلت برتنے کی عادت ہو جائے گی۔ یہ عادت ترجمے کے کام پر بڑا اثر ڈالتی ہے اور ادنیٰ غلطیوں سے بھرے ہوئے کڈھب ترجمے ہونے لگتے ہیں۔ مثلاً ابھی چند روز ہوئے کئی زبانوں سے باخبر ایک ترجمہ کرنے والے نے ٹیگور کے ڈرامے "اچلیاتن" کا ترجمہ لکھا ہے "لڑکھڑاتا ہوا گھر" ظاہر ہے کہ یہ بے پروائی کا نتیجہ ہے۔ یہ بے پروائی مستقل ہو جائے تو نادانی اور بے خبری بن جاتی ہے۔ "اچلیاتن" بنگالی لفظ ہے جس کے معنی ہیں وہ گھر جس کی دیواریں بوسیدہ ہو چکی ہوں، چھت بیٹھ چکی ہو۔ اگرچہ بظاہر درو دیوار سے محروم نہ ہوا ہو لیکن جلد ہی کھنڈر بننے والا ہو۔ لہذا اچلیاتن کا ترجمہ اگر ایک نئی ترکیب یا دو لفظوں میں کرنا تھا تو اسے "ڈھیتا ہوا گھر" یا "گرتا مکان" کہہ سکتے تھے ـــــ "لڑکھڑاتا وہ ہے جو چلتا ہے۔ لڑکھڑانا، ڈگمگانا، ڈانواں ڈول ہونا اور ڈھینا یا بیٹھنا

اپنے ساتھ الگ الگ نسبتیں رکھتے ہیں۔ کسی لفظ کی نسبت شرابی اور مدہوش سے ہے کسی کی نسبت کمزور اور ناتواں سے ہے کسی لفظ کی جوڑ ٹھیک بیٹھتی ہے۔ کشتی یا جہاز کے ساتھ اور کسی کا رشتہ مکان یا دیوار سے ہے یہ الگ الگ نسبتیں ترجمہ کرتے وقت ذہن میں رہنی ضروری ہیں شاعر کہتا ہے۔

گر یہی ہے اس گلستاں کی ہوا
شاخِ گل اک روز جھونکا کھائے گی

'جھونک کھانا' اور 'جھونکا کھانا' دونوں ہم معنی فعل مرکب ہیں۔ شعر میں گلستاں اور شاخ گل کی نسبت سے جھونکا کہا گیا۔ اب ہم کسی ناز پروردہ نوجوان کو بگڑتا دیکھ کر بھی کہہ سکتے ہیں کہ "اک روز جھونکا کھائے گا" دگی۔ ترجمے میں اس فعل کے استعمال سے پہلے داہنے بائیں اس کی نسبتیں دیکھ لی جائیں کہ کس نے کس کو خطاب کر کے کہا ورنہ ایک خوبصورت استعارہ عبارت کا کوبڑ بن جائے گا۔ یہ مشق بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اگر لوگوں کی بولی پر، ادب کی رنگارنگی پر، زبان وبیان کے لکھنے والوں پر صاحب طرز ادیبوں کے طرز ادا پر اور اپنے کام کی ذمہ داری پر نظر رکھی جاتے۔ ورنہ بالکل ممکن ہے کہ ترجمہ کرنے میں مترجم قدم قدم پر خود بخود لڑکھڑاتا رہے۔

یہیں سے ایک سوال کا حل اور ملتا ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے ممکن ہے اس میں اصل عبارت جیسے ٹکے بندھے الفاظ یا مستقل اصطلاحیں اور محاورات یا ترکیبیں موجود نہ ہوں۔ اگر زبان کا دامن ایسے اجزا سے خالی ہے تو ترجمہ کرنے والے کی ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے یہ ذمہ داری ادا ہو جائے تو ترجمے کا مقام بلند ہو جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ترجمہ کرنے والے کی صلاحیت بھی بڑھتی

ہے۔ یہ ذمہ داری ہے اس بات کی کہ پرانی ترکیبوں کی مدد سے نئی ترکیبیں اور پرانے الفاظ کے سہارے سے نئے نئے الفاظ تراشے جائیں۔

مثال کے طور پر ۱۹۴۴ء کے اختتام پر انگریزی اخبارات میں ایک لفظ استعمال ہونا شروع ہوا ہے (War monger) نہ اس کا ترجمہ "جنگجو" صحیح ہو سکتا ہے نہ "لڑائی پھیلانے والا" دونوں لفظوں کا مفہوم War monger کے سوا بھی ہے۔ لیکن وہ لوگ جو "وار مونگر" کے مفہوم سے تو واقف تھے مگر اپنے یہاں کے "وار مونگروں" کے روزمرہ اور محاورے سے ناواقف، وہ اسے کبھی آدھے آدھے جملوں میں اور کبھی غلط سلط لفظوں میں ادا کرتے رہے۔ ہندی اور گجراتی زبانوں میں وہ "جنگ خور" اور "یدھ خور" رہ گیا (یہ "خور" کی ترکیب کہاں سے آئی بجائے خود دلچسپ بات ہے) لیکن اردو میں ایک بار میں نے اسے "جنگ باز" لکھنے کی جرأت کی۔ یہ ترکیب ہماری زبان کے لئے بالکل نئی تھی مگر بے جوڑ یا اجنبی نہیں تھی۔ اس کے پیچھے جتنی گندی عادتوں کی "بازیاں" ہیں۔ سب کی غلاظت چھپی ہوئی تھی۔ اور مفہوم قطعاً وہی جو "وار مونگر" کا ہے۔ چنانچہ یہ لفظ چل پڑا۔ اسی طرح اردو زبان میں ترجمے کے ذریعے ہزاروں لفظ آئے اور کھپے ہیں، دوسری زبانوں کے اسموں نے افعال کا بھی ذخیرہ بڑھایا ہے "شرمانا" سے لیکر "فلمانا"، "تبولنا" "برتانا اور "قومیانا" تک کی اصطلاحات اس ضمن میں آتی ہیں۔

اسی طرح کی ایک اور مثال ہے۔ عربی میں ایک ترکیب ہے "مُعرضیٰ الی الشاقۃ" یا "شائق الصعب" یعنی وہ شخص جو مصائب اور مشکلات

کی طرف لپکتا ہو۔ اتنے بڑے مفہوم کے لئے اگر اردو سے واقفیت ہو تو غالب
کی استعمال کی ہوئی محض ایک ترکیب کافی ہے: "دشوار[1]" یا "مشکل پسند[2]" اب
اس سے ہٹ کر وہ شخص جس کی پسندیدگی حاصل کرنا بہت مشکل ہو یا وہ جس
کا ذوق نظر اتنا بلند اور اتنا انوکھا ہو کہ کہیں ٹھہرتا نہ ہو یا جس کی پسند یا نگاہ انتخاب
میں بڑی مشکل سے کوئی چیز جچتی ہو (Fastidious) یا
Squesmish اس کے لئے عموماً اب تک ایک ترکیب
"تنک مزاج" یا "نازک مزاج" استعمال ہوتی رہی ہے۔ لیکن اس ترکیب
میں وہ خوبی اور جامعیت نہیں جو دشوار پسند میں ہے اب اگر اردو ادب کا رچا
ہوا ذوق ہے اور الفاظ کی ساخت اور ترکیبوں کی بناوٹ پر نظر ہے تو ترجمہ
کرنے والا ایسے موقع کے لئے "پسند دشوار[3]" کا لفظ ایجاد کرے گا اور ایسے ڈھب
استعمال کرے گا کہ مفہوم بھی واضح ہو جائے اور زبان میں ایک اچھی ترکیب
کا اضافہ ہو جو خود اسی کے ادبی لہجے کی دین ہے پھر اسی ترکیب "پسند دشوار"
سے "پسند دشواری" صفت بنائی جا سکتی ہے۔

مگر ترجمے کی اس شرط کو پورا کرنے کے لئے پھر میں دہراؤں گا کہ اس زبان

---

[1] ہے نو آموز فنا ہمتِ دشوار پسند — سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آسان نکلا

[2] شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا — تماشائے بہ یک کف بردنِ صد دل پسند آیا

[3] یہ لفظ ایسے کردار کے لئے استعمال ہوگا جس کا تذکرہ حالی کے اس شعر میں آیا ہے۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں — اب ٹھہرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں

کا گہرا علم اور اچھا سلجھا ہوا ذوق رکھنا ضروری ہے جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔

۳۔ تیسری شرط خیال اور مفہوم کی پوری ادائیگی کی یہ ہے کہ جس موضوع کی اصل ہے اس موضوع سے مناسب حد تک واقفیت ہو۔ کیونکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی اصطلاح یا ایک ہی ترکیب یا ایک ہی لفظ ادب میں کچھ اور معنی رکھتا ہے۔ معاشیات میں اس کے معنی کچھ اور ہو جاتے ہیں اور نفسیات میں اس کا الگ مستقل مفہوم ہے اور تاریخ میں وہ محض لغت کے ایک عام لفظ کی طرح استعمال ہوتا ہے۔ اب اگر ترجمہ کرنے والے کو یہ معلوم نہیں کہ فلاں فلاں ترکیب اس موضوع کی خاص اصطلاحیں ہیں اور ان کا اس شعبے یا اس علم میں الگ ایک مفہوم ہے تو وہ لغت کی مدد سے ترجمہ کر دے گا اور عبارت کا سارا مفہوم غارت ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ اگر خود اس سے کہا جائے کہ تم اپنا ترجمہ پڑھ کر اس کا مطلب سمجھاؤ تو وہ نہیں سمجھا سکے گا۔ مثال کے طور پر Surplus Value کی ترکیب میں (Surplus) اور (Value) الگ الگ دونوں الفاظ انگریزی میں عام استعمال ہوتے ہیں اور اگر کسی عام عبارت میں آئیں تو پہلے کا ترجمہ "فالتو" یا "فاضل" یا "ضرورت سے زیادہ" لکھ دینا مناسب ہوگا! اور دوسرے کا "قدر و قیمت، درجہ حیثیت، وقعت" وغیرہ ہوتا ہے۔ لیکن اب اگر یہی الفاظ پولیٹیکل اکانومی سیاسی معاشیات کی کسی کتاب میں آئے ہیں اور مترجم معاشیات سے بالکل بے بہرہ ہے تو ان کی اصطلاحی اہمیت پر اس کی نظر نہیں جائے گی۔ اور وہ ترجمے میں "فالتو حیثیت" یا "ضرورت سے زیادہ وقعت" لکھ جائے گا۔ حالانکہ یہ اصطلاح مارکسی نظریۂ معاشیات کی لغت جگر ہے۔ اور اب اردو میں اس کیلئے

"قدرِ زائد" لکھا جاتا ہے (ایک جملے میں اس کا مفہوم یہ کہ پیداوار میں لگی ہوئی محنت کی وہ قدر (ویلیو) جس کا معاوضہ مار لیا جاتا ہے۔

اردو زبان کے کسی پروفیسر نے ایک تنقیدی کتاب پر انگریزی میں مضمون لکھا۔ اردو کی اس تنقیدی کتاب میں جابجا ادبی تنقید کی اصطلاحیں مثلاً واقعیت نگاری اور حقیقت نگاری استعمال ہوئی تھیں۔ انھوں نے ترجمہ کرتے وقت دونوں اصطلاحوں کا صرف لغوی مفہوم ٹٹول کر دونوں کو ہم معنی سمجھا اور ان کے لئے اپنے انگریزی تبصرے میں Fact finding اور Fact writing کی ترکیبیں استعمال کر ڈالیں جو دراصل کسی سرکاری رپورٹ یا کسی کالج کی ریسرچ سوسائٹی کے معاملات میں استعمال ہونا چاہئے تھی۔ "حقیقت نگاری" اور "واقعیت نگاری" کا فرق تو ترجمے کی عبارت سے غائب ہوا ہی تھا اب یہ دونوں جو تنقیدی اصطلاحیں اور ادبی رجحان رہے ہیں۔ ان کا مفہوم بھی رخصت ہوگیا۔ کیوں کہ "فیکٹ فائنڈنگ" کو (Realism) اور (Naturalism) سے دور کی بھی نسبت نہیں۔ اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے والے پروفیسر انگریزی پر اچھا خاصا عبور رکھتے ہیں، اردو کی تعلیم دیتے ہیں، لسانیات کی سائنس سے مناسب حد تک واقف ہیں۔ پھر بھی جس موضوع کی اصل عبارت تھی۔ چونکہ وہ اس موضوع سے غافل تھے۔ بھٹک گئے۔

یہ تو بہت معمولی مثالیں ہیں۔ ترجموں کے معاملے میں اصل تصنیف کے موضوع سے بےخبری نے بڑے عبرت ناک نتیجے پیش کئے ہیں اور ان موضوعات پر اپنی زبانوں میں اضافہ کرنے کی بجائے ان کی طرف سے بیزاری پھیلائی۔

ایک شخص ادب سے عموماً واقف ہے اور فلسفہ نہیں جانتا یا فلسفے کے موٹے موٹے اصولوں سے بے خبر ہے تو وہ برٹرنڈ رسل کی کتاب کا ترجمہ کرتے وقت برٹرنڈ رسل کی صورت تو مسخ کرے گا ہی لیکن خود اس زبان میں فلسفے کے مضامین سے لوگوں کو نفرت دلائے گا جس زبان میں ترجمہ کر رہا ہے۔ ایک شخص سیاست کے میدان کا کھلاڑی ہے لیکن ادب کی چاشنی سے بہت کم واسطہ رکھتا ہے تو وہ میخائل شولوخوف کے ناول "ڈان بہتا رہا" کی ادبی نزاکتوں پر پانی پھیر دے گا یا جہاں ترجمے میں اٹکاؤ آئے گا۔ وہاں سے چھلانگ لگا جائے گا۔

جو لوگ کسی خاص موضوع کی کتاب یا مضمون سے گہری دلچسپی یا اس کے متعلق بنیادی معلومات نہ رکھتے ہوں، انھیں صرف زبان دانی کے بل پر اس موضوع کے ترجمے سے نہیں کھیلنا چاہئے۔ اور اگر وہ کسی وجہ سے ایسے موضوعات کی تصانیف کا ترجمہ کرنے پر مجبور ہو جائیں تو انھیں ایک ایک لفظ خوب ٹھونک بجا کر دیکھ لینا چاہئے کہ کہیں ان الفاظ و تراکیب سے اس موضوع کا کوئی خاص رشتہ تو نہیں ہے۔ اگر ہے تو پھر اس موضوع کے لغت یا ماہرین سے مشورہ لے لینا چاہئے۔ بہتر یہی ہے کہ مختلف ترجمہ کرنے والے اپنی دلچسپی اور اپنی لگن کے مضامین چھانٹ لیں اور اسی قسم کی تصانیف یا مضامین کا ترجمہ اپنے لئے مخصوص کر لیں۔ اس میں ترجمہ کرنے والے کا بھی فائدہ ہے۔ ترجمے پڑھنے والوں کو بھی سہولت ہے اور جس کا ترجمہ کیا جائے گا اسے بھی سود و زیاں کا اندیشہ نہیں رہتا۔

ل یہ مفروضہ نہیں سامنے کی مثالیں ہیں۔

ایک اور نکتہ | یہیں سے ایک نکتہ اور پیدا ہوتا ہے کہ موضوع اور اصل عبارت کے مضمون سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اگر عبارت معاشیات کی ہے تو معاشیات کی چند اصطلاحیں جان لی جائیں یا اگر ادبی موضوع ہے تو پہلے سے تھوڑی بہت ادبی سوجھ بوجھ پیدا کی جائے۔ بلکہ اصل موضوع سے واقفیت کے معنی کچھ اور بھی ہیں۔ اس کے یہ بھی معنی ہیں کہ اگر کسی صاحبِ طرز ادیب یا مخصوص رجحان اور خاص ذہنیت کے مصنف کی تصنیف کا ترجمہ کرنا ہے تو اس ادیب یا مصنف کے طرزِ فکر سے رجحان اور ذہنیت سے آگاہی ہو۔ ضروری نہیں کہ پہلے سے اس کی تمام تصانیف کا ورد کیا جائے بلکہ یہ کافی ہے کہ اس کی سوانح عمری یا زندگی کے خاص خاص حالات اور اس کے طرزِ بیان کے متعلق دوسروں کی رائیں معلوم کرلی جائیں۔ یہ بھی اگر ممکن نہ ہو یا بہت مشکل ہو تو آسان صورت یا کم از کم شرط یہ ہے کہ جس تصنیف کا ترجمہ کرنا ہے اسے خوب غور سے ایک بار اول تا آخر پڑھ لیا جائے۔ اور اگر ویسی ہی دو ایک تصانیف اور ہاتھ آسکیں تو ان کا بھی مطالعہ کرلیا جائے اور اگر زیرِ ترجمہ تصنیف پر دوسروں کی رائیں تبصرے یا تنقیدیں یا تعارف مل سکیں تو ان پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ اس کے بعد ترجمہ شروع کیا جائے۔

بعض ذمہ دار لوگ بھی اس شرط کی اہمیت کو نہیں مانتے۔ نتیجہ یہ کہ وہ اصل تصنیف کے ان اشاروں، کنایوں اور نکتوں کو نظر انداز کر جاتے ہیں جن سے پوری تصنیف کا لطف یا اہمیت قائم ہے۔

برنارڈ شا کا ایک شہرۂ آفاق ڈراما ہے "Man and Superman"

اس ڈرامے کا ترجمہ ہوا ہے "نکتہ چین ہے غم دل۔۔۔" کے نام سے۔ مترجم اس سے پہلے کئی اچھے ترجمے کر چکے ہیں اور انھیں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر عبور بھی ہوگا لیکن ڈرامے کے اصل موضوع کو پہلے سے جاننے اور خوب ذہن نشین کر لینے کو شاید اہمیت نہیں دیتے اور اصل موضوع کو ذہن نشین کر لینے کے سلسلے میں جو پہلو نکلتا ہے کہ مصنف کے طرز بیان رجحان اور ذہنیت سے واقفیت حاصل کر لی جائے اسے اپنے اکثر ہمعصروں کی طرح انھوں نے بھی بالکل نظر انداز کیا ہے۔ چنانچہ جب وہ شا کے اس زبردست ڈرامے کا ترجمہ کرنے بیٹھتے ہیں تو پڑھنے والوں کی آسانی کی خاطر انگریزی ناموں کو بدل کر ان کی جگہ ہندوستانی اور وہ بھی متوسط طبقے کے مسلم نام رکھ دیتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اصل اور ترجمے کے پورے ماحول اور تاثر میں اتنا فرق ہو گیا ہے جتنا اس انگریز میں ہو سکتا تھا۔ جو لندن چھوڑ کر نظام شاہی حیدرآباد میں چلا آتا اور درمیانی درجے کے کھاتے پیتے مسلم گھرانے کی معاشرت اختیار کر لیتا۔

برنارڈ شا خود آئرلینڈ کا باشندہ ہے۔ آئرلینڈ اور انگلینڈ میں رقابت اور چشمک بہت پرانی ہے۔ لہٰذا اس کا آئرش ہونا کہیں نہ کہیں شوشہ چھوڑتا ہے۔ کبھی وہ انگریز کی زبان سے آئرش کے خلاف کوئی احمقانہ حملہ کہلواتا ہے کہیں کسی آئرش کی زبان سے انگریز پر حملہ کستا ہے۔ کہیں آئرش کی برتری دکھاتا ہے اور کہیں ان کے بود و باش اور مزاج پر طنز کر دیتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص شا کے اس ڈرامے کا ترجمہ کرتے وقت انگریز ناموں کی جگہ ہندوستانی مسلمان نام رکھ دے تو لامحالہ اسے شہروں کے نام، فرنیچر کے نام اور دوسری ضروریات کے نام بھی بدلنے پڑیں گے "پڈنگ" کو کھیر بنانا ہوگا

اور (Pork) کو معلوم نہیں کیا کرنا ہوگا - اور جب یہ صورت ہوگی تو ظاہر ہے کہ انگلش کو ہندوستانی اور آئرش کو مصری یا قبطی یا چینی لکھنا پڑے گا - مثلاً اگر شا نے جملہ یوں لکھا ہے کہ "جی ہاں یہ آئرش لوگ ہوتے ہی ہیں بہت ضدی" اور یہ جملہ انگریز کہہ رہا ہے تو انگریز کی جگہ ہندستانی اور آئرش کی جگہ تبتی لکھ کر ترجمے کی جو تباہی ہوگی، ہر خوش مذاق آدمی اس کا اندازہ کرسکتا ہے - مجھے نہیں معلوم کہ شا کو سمجھنے کے لئے ایسا ترجمہ کتنا مفید ہوسکتا ہے۔
ترجمے کا یہ نقص پیدا اسی لئے ہوتا ہے کہ ترجمے کرنے والے کا اصل موضوع سے باخبر ہونا اور پھر اصل عبارت کے مصنف کے رجحان، مزاج اور طرز بیان کے نکتے معلوم کرنا کچھ ایسا ضروری نہیں سمجھا جاتا - حالانکہ یہ بھی تقریباً اتنا ہی اہم ہے جتنا اس زبان کا علم ہونا جس سے ترجمہ کیا جا رہا ہے -

اس لحاظ سے دیکھئے تو اردو زبان کے بعض پیش رو ترجمہ کرنے والے ہماری مبارکباد کے مستحق اور تقلید کے قابل ہیں جن میں آخری دور عنایت اللہ دہلوی، ڈاکٹر عبدالحق، قاضی عبدالغفار، اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر عابد حسین اور ڈاکٹر ذاکر حسین سے ہوتا ہوا عزیز احمد اور حسن عسکری تک پہنچا ہے -

ترجمے کی بندشیں ترجمے میں اصل کے خیال اور مفہوم کو پوری طرح ادا کرنے کے سلسلے میں جن شرائط کا ذکر آیا ہے اگر وہ تمام پوری ہوں تب بھی ترجمہ کرنے والے کو جگہ جگہ بعض اور سوالوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے -

مثلاً ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے اور یہ کافی اہم سوال ہے کہ جہاں اصل عبارت کا مفہوم صاف نہ ہو اور خود اصل کی عبارت ذرا الجھی ہوئی ہو یا اس طرح

لکھی گئی ہو کہ ایک کی بجائے کئی معنی نکلتے ہوں وہاں اپنے پڑھنے والوں تک بات پہنچانے کے لئے ترجمہ کرنے والے کا کیا فرض ہے ؟

کیا اسے حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی طرف سے اضافہ کر کے مطلب واضح کر دے یا وہ جو کئی مفہوم نکلتے ہیں، ان سب کو ویسے کے ویسے ہی لکھ دے ؟ یا ترجمے میں بھی عبارت کو اتنا ہی گنجلک اور کثیر المعانی رہنے دے ؟ یا سامنے کا ترجمہ دے کر حاشیے میں اس کے اور پہلوؤں یا اضافوں سے پڑھنے والوں کو باخبر کر دے[1]۔

یہ تمام شکلیں ترجمہ کرنے والوں نے اپنے اپنے طور آزمائی ہیں اور ان میں سے کوئی ایک صورت مسئلے کا آخری حل نہیں ہے۔

ایسی صورتوں کا حل بڑی حد تک اس موضوع کے اس حصے پر مصنّف کی قوتِ بیان پر اور مصنف کے منشا پر منحصر ہے۔

(۱) ممکن ہے عبارت کا اصل مفہوم اس لئے صاف نہ ہو کہ مصنّف کی قدرتِ بیان کے کارن وہ الجھا رہ گیا ۔ اگر مصنف کو قدرت ہوتی یا اسے معلوم ہوتا کہ فلاں جگہ اس کی عبارت گنجلک ہے تو وہ اسے زیادہ وضاحت اور سلاست کے ساتھ بیان کرتا ۔ اگر یہ صورت نظر آئے تو ترجمہ کرنے والے کی

---

[1] منطق، فلسفہ اور معانی و بیان کی پرانی کتابوں کے جو عربی سے فارسی میں ترجمے کئے گئے، ان میں یہ آخری صورت اختیار کی گئی ہے، لبعض اوقات اصل عبارت و دگنے چگنے ہو گئے ہیں۔ مرزا عسکری نے ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اردو کا ترجمہ کرتے وقت نہایت محتاط اور مختصر حاشیے بڑھائے ہیں۔ (ظ۔ا)

قابلیت اس میں ہے کہ ترجمے میں اپنی طرف سے کچھ الفاظ کا اضافہ یا انداز بیان میں کچھ تبدیلی کرکے انھیں ایسے لکھے کہ عبارت سلجھ جائے۔

(۲) ممکن ہے اس مقام پر عبارت کو گنجلک رکھنے کا کوئی خاص مقصد ہو۔ بعض موقعوں پر یہی بات ضروری ہوتی ہے۔ خاص طور سے شاعری میں ایسے مقامات آتے ہیں جہاں نکتے کو سلجھانا ضروری نہیں ہوتا۔ آرٹ میں بعض جگہ تاریک گوشے اصل مقصود کو نمایاں کرنے کی نیت سے رکھے جاتے ہیں یا بعض جگہ ہلکے سے پردے کسی غیر ادبی مجبوری کی وجہ سے ڈال دیئے جاتے ہیں کہ صاف بات کہی جائے تو کہیں اسے پڑھنے والے کی سوجھ بوجھ برداشت نہ کر سکے یا حکومتِ وقت برداشت نہ کرے یا مذہبی یا اخلاقی ادارے چراغ پا ہو جائیں یا بیان کے حسن میں فرق آجائے، مزا جاتا رہے۔ شاید ایسی کسی وجہ سے اصل مصنّف نے اپنی عبارت کو ڈھکا چھپا رہنے دیا ہو۔ ایسے مقامات کا اور مصنّف کے اس مقصد کا اندازہ لگا لینا ترجمہ کرنے والے کی نکتہ دانی اور اچھی صلاحیت پر منحصر ہے۔ اگر وہ اسے پالیتا ہے کہ یہاں عبارت کو اور زیادہ واضح کر دینے اور عام فہم بنا دینے سے اصل عبارت کی وہ ادائے حجاب جاتی رہے گی۔ جو مصنّف کا منشا یا ہنر ہے تو اسے مصنّف کی منشا کی پابندی کرنی چاہیئے اور عبارت کو جوں کا توں اپنی زبان میں منتقل کرنا چاہیئے۔ جیسے دلہن کو ایک ڈولی سے دوسری ڈولی میں پہنچاتے ہیں اور اگر ایسا نہ ہوا تو ترجمہ ترجمہ نہ رہے گا بلکہ اصل عبارت کی تفسیر بن جائے گا۔ ترجمہ اور تفسیر میں جو بنیادی فرق ہے۔ وہ ظاہر ہے۔ تفسیر مصنّف کے منشا کو اپنے طور پر کھول کر بیان کرنا ہوتا ہے بمفسّر

کو مترجم کے مقابلے میں آزادی میسر ہے۔ اسی سبب سے مفسر کے ساتھ اختلاف کی گنجائش مترجم کے بہ نسبت زیادہ رہتی ہے۔

خیام کی رباعیات کا منظوم انگریزی ترجمہ کرنے میں فٹز جیرلڈ سے اکثر یہی کمال سرزد ہوا ہے کہ وہ مترجم سے زیادہ مفسر نظر آتا ہے اور خیام کی شاعری (کا ترجمہ کرنے؟) کی آڑ میں وہ اپنی افتادِ طبع اور اپنے شاعرانہ جوہر کا لوہا منوالیتا ہے۔

(۳) اب اگر مترجم دیکھتا ہے کہ اصل عبارت میں فلاں حصہ ایسا ہے کہ اس کے کئی معانی نکل رہے ہیں یا نکل سکتے ہیں تو اسے سوچنا ہوگا کہ مصنف خود اس مقام پر کئی معانی پیدا کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک رنگ میں کئی ہلکے ہلکے رنگوں کی آمیزش رکھنا چاہتا تھا۔ یا اس کے ذہن میں اپنا ایک مفہوم تھا اور وہ لفظ یا جملہ ایسا لکھ گیا جس سے بہ یک وقت کئی شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ اور بیان کی یک رنگی یا وضاحت میں حائل ہوتی یا اسے بڑھاتی ہیں۔ یہاں پھر مصنف کے منشا کی پابندی کرنی ہوگی۔ اگر پہلی صورت ہے تو اسے زبان میں ترجمے کے لئے ویسا ہی لفظ ویسا ہی محاورہ ڈھونڈنا ہوگا جو کئی کئی معانی کی طرف اشارہ کرتا ہو۔ اور اگر دوسری صورت ہے تو اسے اصل عبارت کی حدود سے آگے بڑھ کر ایسا لفظ تراشنا ہوگا جو چاہے لفظی ترجمہ ہو یا نہ ہو لیکن اس ایک مفہوم کے لئے

سب سے زیادہ جامع اور مانع وہی ٹھہرے اسے اپنے ترجمے میں اصل کی عبارت یا جملے سے باقی تمام مفہوموں کو مٹانا ہوگا اور صرف ایک کو آگے بڑھانا ہوگا۔ ممکن ہے بعض لوگ اس پر اعتراض کریں اور اسے ترجمہ کرنے والے کی دیانت داری کے خلاف سمجھیں لیکن ترجمے کی دیانتداری کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ مترجم بے غرض ہو کر اصل کے لفظ کی جگہ لفظ لکھتا چلا جائے اور مکھی پر مکھی مارتا رہے۔

جن لوگوں نے مکھی پر مکھی مارنے کو ترجمے کی دیانت داری سمجھا ہے ان کی مثال ایک ایسے روکھے سخت گیر آدمی سے دی جا سکتی ہے جس نے بہتر کردار بنانے کی خاطر کچھ اصول بنائے ہوں اور وہ اصولوں کا ایسا پابند ہو چکا ہو کہ ان کی انسانیت دوستی کے عام تقاضوں کو ٹھکراتا چلے۔ ظاہر ہے کہ ایسی اصول پرستی نیکی کے لباس میں ایک مردم بیزار بدی۔ بجائے اس کے کہ ذریعہ تو مقصد کی جگہ قبضہ لے اور مقصد ذریعے کی نفی کرے۔

ترجمے میں مصنف کے الفاظ دوسری زبان میں منتقل کرنا دراصل ذریعہ ہے، مقصد نہیں۔ مقصد تو مفہوم اور لطف بیان کی ادائیگی ہے۔ اگر الفاظ کو دوسری زبان میں منتقل کرنے سے وہ مفہوم پوری طرح ادا نہیں ہوتا یا اسی وصف کے ساتھ ادا نہیں ہوتا تو کٹر لوگوں کا ہر ایک الزام سہہ کر اصل کے الفاظ ان کی تقدیم و تاخیر، ان کے جوڑ اور جملوں کی ساخت کو بدل کر یہ مقصد پورا کرنا ہوگا۔ یہی ترجمے کا مقصود ہے۔ اور اسی مقصود کی تعمیل خاص اس فن کی دیانتداری ہے۔

مثال کے طور پر کارل مارکس کی تصنیف Das Capital

(کی جلد اول و دوم) جب جرمن زبان میں تیار ہو گئی تو اس کے چند سال بعد فرانیسی، جرمن، انگریزی زبانوں کے ماہر اور معاشیات کے فاضل T. Ray نے اسے فرانیسی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ فرنچ ترجمہ مکمل ہو چکا تو مارکس نے اس پر نظر ڈالی یہاں مارکس نے اس ترجمے کے متعلق لکھا ہے۔

"اس نے خوب جی لگا کر احتیاط کے ساتھ اپنا فرض پورا کیا لیکن احتیاط اور توجہ میں اتنی شدت برتی کہ جو ترجمہ تیار ہوا وہ حد سے زیادہ لفظ بلفظ ہو گیا۔"

حد سے زیادہ لفظ بہ لفظ (Too Literal) ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مارکس نے اسے قبول نہیں کیا، خود جم کر نظر ثانی کی اور اصل سے ہٹ کر اپنی ہی عبارت کے ترجمے میں جگہ جگہ کاٹ چھانٹ کر دی۔

بین السطور کا معاملہ ترجمہ کرنے والے کو لازمی طور سے اصل عبارت کے الفاظ ہی کو نہیں بلکہ اس کے بین السطور کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے اور بین السطور (جو منظوم الفاظ کے درمیان پوشیدہ ہوتا ہے۔) کو راہ گیر کی ٹارچ کے بطور استعمال کرنا چاہیے کہ جہاں ضرورت پڑی بٹن دبا کر روشنی حاصل کر لی۔

ہو سکتا ہے کہ ترجمہ کرنے والے کا اپنا بھی ایک طرز بیان ہو۔ ممکن ہے اوریجنل مصنف ہونے کے رشتے سے وہ اپنا ایک طرز ادا بنا چکا ہو۔ وہ طرز ادا کافی پختہ ہو چکا ہو۔ ایسی صورت میں جب وہ ترجمہ کرنے بیٹھے گا۔ اور اصل عبارت کے بین السطور پر بھی نظر رکھے گا، تو ممکن ہے کہ وہ مصنف کے منشا کی تو پابندی کرتا چلے لیکن طرز بیان اپنا ڈال دے۔ یا مترجم کی ہستی ترجمے کی عبارت پر حاوی ہو جائے۔ یہ ترجمے کا

وہ عیب ہوگا جس کا کوئی سدھار نہیں کوئی توڑ نہیں۔ اس سے نقصان یہ ہے کہ ترجمے پر اصل مصنف سے زیادہ مترجم پر توجہ رہے گی۔ اور اصل مصنف کا طرز بیان جو ترجمے میں جوں کا توں منتقل ہونا چاہیئے تھا، ختم ہو جائے گا۔ یہ ایک طرح کی منجھائی یا پالش ہے جو ترجمے کو مقبولیت بخشنے کے باوجود اصل مصنف کا آدھا وجود اور پورا وصف مٹی میں ملا دیتی ہے۔ پختہ کار اہل قلم کو خصوصاً ادھر سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔

ترجمہ کی تین راہیں ہیں۔ ایک لفظی ترجمہ، دوسرا آزاد ترجمہ اور تیسرا ان دونوں کے درمیان کا ترجمہ۔ اس تیسرے یا اعتدال کے ترجمے کو ہم تخلیقی ترجمہ بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ جب ترجمے کی تمام شرائط پوری ہوتی ہیں تو وہ صرف تقلید بالکل نہیں رہ جاتا۔ بلکہ اس میں ایک فنی حسن ابھرتا ہے ـــــــ وہ اصل کو پوری طرح ہضم کر کے اسے نئے وجود کے ساتھ زیب و زینت بخشنے کے برابر ہے۔ اور اسی طرح بجائے خود تخلیق کے ہم وزن شمار ہونے کے قابل ہے۔

ترجمے کی ذمہ داری کے سلسلے میں سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ ترجمہ کرنے والا اپنے وجود، خیال، جذبے اور اپنے قلم کو اصل مصنف کے سپرد کر دے اور یہ سوچے کہ اگر فلاں بات، فلاں جملہ، تصنیف، عبارت یا محاورہ مصنف کو خود ہماری اسی زبان میں لکھنا ہوتا تو وہ کس طرح لکھتا۔ اپنی بساط بھر یہ بھی تصور قائم ہو کہ وہ یوں لکھتا: بس ویسے ہی لکھ دینا چاہیئے۔

اگر ترجمہ اس حیثیت سے کامیاب ہے تو ہر حیثیت سے کامیاب ہے اور لفظ بہ لفظ یا انتہائی دیانت دارانہ (Faithful) نہ ہونے کے باوجود ہر اعتبار سے مکمل ہے، ورنہ اور خوبیوں کے باوجود ناکام رہے گا۔

خستم کلام یہاں تک ترجمے کے لئے جن شرطوں کی نشاندہی کی گئی۔ ان پر نظر ڈالنے کے بعد ایک بتدی کا سمجھنا، یا ترجمے کو ایسا بھاری پتھر سمجھ بیٹھنا بیجا نہ ہوگا۔ جسے صرف چوم کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ حالانکہ ایسا ہے نہیں۔

زندگی کے کام جتنے پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں، اتنا ہی خاص کاری (Specialisation) بڑھتی جاتی ہے۔ ترجمہ بھی ایک خاص ہنر یا فن ہے اور دوسرے پیشوں یا ہنروں کی طرح یہ بھی تربیت اور ریاض طلب کرتا ہے لیکن کسی موسیقی یا قدرتی سائنسوں کے مقابلے میں یہاں ریاض (ریا یا ہنت) کا تقاضہ ہلکا ہے۔ بلکہ اگر کوئی شخص ترجمے کو روزگار یا مستقل ذہنی مشغلے کے طور پر اپنانا چاہے اور ایک دو موضوعات کو اپنی طبیعت یا ابساط کے مطابق چن لے تو کام اور بھی آسان ہو جاتا ہے۔ چند سال کا مطالعہ اور دو تین سال کی لگاتار مشق مل کر رواں ترجمے کے کامیاب راہبر ہیں۔

ترجمے کی ایک شاخ وہ ہے جو محض مشق اور حافظے کے بل پر کھیلتی ہے۔ یعنی ترجمانی (دو بھاشیہ کا کام) تقریری زبان کو ایک سے دوسری میں ڈھالنا محض مشاقی ہے۔ اور ایک لفظ کے لئے دوسرے نپے تلے، مقررہ لفظ کی یادداشت ــــ یہ نسبتہً سہل ہے۔

ترجمے کی دوسری شاخ کلاسیکی ادب یا جدید تخلیقی ادب کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا کام ہے۔ جو پہلی سے زیادہ دشوار، مگر پائیدار ہے اور ہم نے اب تک اسی سے بحث کی ہے۔

لیکن ترجمے کی وہ شاخ جسے چھوتے ہوئے اہل علم کی انگلیاں جلتی ہیں شعر

کا شعر میں ترجمہ ہے۔ ہر زمانے میں اس کام کو نہایت دشوار سمجھا گیا۔ سر جان ڈینہیم
(John Deniham) نے تو اسے محض حماقت قرار دیا ہے۔ یہ کہہ کر شاعرانہ
زبان ایسی اسپرٹ رکھتی ہے کہ ایک زبان [کی بوتل] سے دوسری میں ڈھالتے
وقت اڑ جاتی ہے۔ مگر پھر بھی یہ "حماقت" دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں ڈیڑھ سو
برس سے کی جا رہی ہے۔ نتیجے بھی برے نہیں نکلے۔ کالی داس، فردوسی،
نظامی، جامی، حافظ، سعدی، خیام، شیکسپیئر، ملٹن، گوئٹے، بائرن، شیلے، پوشکن
، بالزاک، ٹالسٹائی، ٹیگور اور جیون بڑے بڑے شعرا اپنی ملکی سرحدوں سے نکل کر دنیا کے شہری اور
عالمی تہذیب کے میراث بن گئے۔ اور بنتے جا رہے ہیں۔

منظوم ترجموں کا رواج مشرق میں بھی تھا۔ لیکن اسے عروج ملا۔ مغرب میں
خصوصاً فرنچ، جرمن، انگریزی اور روسی زبانوں میں۔ صف اول کے شعرا نے اس
کام کو ہاتھ میں لیا تو ایک چلن ہو گیا کہ مشق کی پختگی اور قدرت کلام کے بلند مقام
کو پہنچنے کے بعد مغربی شعرا دوسری زبانوں کے کلاسیکی یا ہم عصر شاعروں کا کلام منظوم
ترجمے کے لئے چنتے ہیں اور اس میں اپنا جوہر دکھاتے ہیں۔ منظوم ترجمہ کرنے والے میں
شاعرانہ جوہری وہ عنصر ہے جو ترجمے کی باقی تمام شرطوں کے علاوہ اوپر سے کام
آتا ہے۔ جو شخص خود اچھا شعر نہ کہہ سکے، نہ کہہ چکا ہو، جسے اپنی زبان میں اساتذہ
کے ہزاروں اشعار ازبر ہوں، جو دوسری زبان کے مصرعوں میں نظموں میں (بلکہ نثر میں بھی)
باطنی آہنگ اور ظاہری ترنم سے لطف اندوز نہ ہو سکے اسے منظوم ترجمے کی اوکھلی
میں سر نہ دینا چاہئے۔ اور جو لوگ اس کام کے اہل ہیں انھیں بھی لازم ہے کہ ہر ایک
دور اور کسی بھی رنگ کے شاعر پر ہاتھ صاف نہ کریں۔ ایک مخصوص دور یا مخصوص فکر

یا طرز کے شاعر کے ہاں الفاظ کے جوڑ اور آوازوں کے اتار چڑھاؤ کا رنگ بھی الگ ہوتا ہے۔ فضا اور ہوتی ہے ایسے شاعر زمین نے اب تک کہاں پیدا کئے ہیں جو کسی رنگ میں بند نہ ہوں اور وہ جو ہر ایک رنگ کی نقل اتار کر رکھ دیں — بڑے بے رنگ ہوتے ہیں، بدآہنگ بھی۔

جمیل جالبی

ترجمے کے مسائل

"ادبی تخلیق کا ایک عظیم دور ہمیشہ ترجمہ کا بھی عظیم دور ہوتا ہے یا پھر نتیجہ کے طور پر فوراً بعد پیدا ہوتا ہے۔ وکٹورین عہد میں ذرا کمتر درجہ پر فٹز جیرالڈ پیدا ہوا اور سوئن برن کے دور میں ڈکن اور روزیٹی۔ وہ اہمیت جو ہسپانوی شاعری کے مورخوں نے بوسکن کو دی ہے اس پر ہم ذرا دیر کو حیرت تو ضرور کرتے ہیں لیکن ہمارے مورخین اپنے مترجمین کو بہت کم اہمیت دیتے ہیں۔"

——— (ایذرا پاونڈ)

عام طور پر کسی ترجمہ کو اچھا سمجھ کر جب اس کی تعریف کی جاتی ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں بڑی روانی ہے، زبان با محاورہ و سلیس ہے اور مضمون واضح ہے۔ لیکن اس بات پر اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ صرف روانی و سلاست ہی ترجمے کے بنیادی اجزا نہیں ہیں۔ آپ خود ہی اندازہ کیجیے کہ سنجیدہ و پیچیدہ تحریر کا ترجمہ صرف رواں اور سلیس کیسے ہو سکتا ہے جب کہ زبان، مزاج اور جملوں کی ساخت ہماری زبان سے زیادہ

اور جملوں کی ساخت سے مختلف ہو۔ جب کہ ایک طرف تو ہمارے ہاں طویل جملے لکھنا مشکل کام ہو اور دوسری طرف فعل حال اور جملۂ معترضہ کا رواج بھی جدید روش کے ساتھ زبان میں داخل ہوا ہو۔ ترجمہ کا مزاج اصل تحریر کے مزاج سے الگ ہوتا ہے۔ ترجمے کے ذریعے زبان ایک نئے مزاج سے روشناس ہوکر پھیلتی اور بڑھتی ہے۔ نئے لہجے اور جملوں کی نئی ساخت کو اپنے مزاج میں جذب کرکے اظہار کی نئی قوتوں سے متعارف ہوتی ہے۔ ترجمہ کی اہمیت یہی ہے کہ ایک طرف تو اس کے ذریعے نئے خیالات زبان میں داخل ہوتے ہیں جس سے ذہنی جذب قبول کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ دوسرے زبان کی قوتِ اظہار میں نئے امکانات پیدا ہونے لگتے ہیں اور وہ زبان بھی سنجیدہ خیالات کے بیانات پر قدرت حاصل کرکے احساس و خیال کی نئی نئی تصویریں ابھارنے کی اہل ہوجاتی ہے۔

اکثر ترجمے کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ بالکل اصل معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی غلطی ہے جو ہمارے ہاں افسانوں اور ناولوں کے آزاد ترجموں کی وجہ سے راہ پاگئی ہے۔ جب کسی فلسفیانہ پیچیدہ تحریر کا ترجمہ کیا جائے گا تو ظاہر ہے اس میں وہ روانی تو ہرگز پیدا نہیں ہوسکتی جو خود اپنی زبان میں براہ راست لکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور جب یہ روانی ترجمہ میں پیدا نہیں ہوسکتی تو وہ ترجمہ اصل کیسے معلوم ہوگا۔ ایسے میں مترجم کا فرض یہ ہے کہ وہ مصنف کے لہجے اور طرز ادا کا خیال رکھے۔ لفظوں کا ترجمہ قریب قریب معنی ادا کرنے والے الفاظ سے نہ کرے اور ضرورت پڑنے پر نئے مرکبات بنائے، نئی بندشیں تراشے اور نئے الفاظ وضع کرے۔ ویسے ترجمے میں آخر کیا فائدہ جو سلاست تو پیدا کرے لیکن مصنف کی روح اس

کے لہجے اور تیور کو ہم سے دور کر دے اور ساتھ ساتھ زبان کے مزاج کو اسی طرح روایتی روش و اظہارِ بیان پر قائم رکھے اور اس میں کسی اضافے، نئے امکان یا تجربے کی کوشش نہ کرے۔ زبان کے مزاج کو بدلنے، اسے نئے امکانات سے روشناس کرانے اور طرزِ ادا کے نئے نئے ڈھنگ سے آشنا کرانے میں مترجم کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ ترجمہ کے ذریعے ایک زبان کی تہذیب دوسری زبان کی تہذیب کے ساتھ مل کر نئے نئے گل کھلا سکتی ہے۔

انگریزی زبان تہذیب و مزاج کے اعتبار سے اردو زبان سے مختلف ہے۔ انگریزی میں جملوں کی ساخت فاعل، فعل، مفعول کی ترتیب اور جملہ تہذیبی انداز نظر ہماری زبان سے مختلف ہے۔ ایسے میں تین طرح کے ترجمے ہو سکتے ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ کہ اصل متن کا صرف لفظی ترجمہ کر دیا جائے اور بس۔ (اسے ترجمہ کرنا نہیں کہتے۔ مکھی پر مکھی مارنا کہتے ہیں۔) دوسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ مفہوم لے کر آزادی کے ساتھ اپنی زبان کے روایتی و مقبول اندازِ بیان کو سامنے رکھتے ہوئے ترجمہ کر دیا جائے۔ تیسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ ترجمہ اس طور پر کیا جائے کہ اس میں مصنف کے لہجے کی کھنک بھی باقی رہے، اپنی زبان کا مزاج بھی باقی رہے اور ترجمہ اصل متن کے بالکل مطابق ہو۔ ترجمہ کی یہ شکل سب سے زیادہ مشکل ہے۔ ایسے ترجموں سے زبان و بیان کو ایک فائدہ تو یہ پہنچتا ہے کہ زبان کے ساتھ بیان کا ایک نیا سانچا آجاتا ہے۔ دوسرے جملوں کی ساخت ایک نئی شکل اختیار کر کے اپنی زبان کے اظہار کے سانچوں کو وسیع تر کر دیتی ہے۔ اب جب کہ زبانوں کے رشتے زیادہ وسیع ہو کر ایک دوسرے سے قریب تر ہو رہے ہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ مترجمین بھی اظہار کے سانچوں اور جملوں کی ساخت کا خاص طور پر خیال

رکھ کر زبان کو نئے تقاضوں اور نئے امکانات سے روشناس کریں جہاں تک ہماری زبان کا تعلق ہے اس میں شاعرانہ اندازِ بیان کے لئے بڑی گنجائش ہے۔ لیکن پیچیدہ و فلسفیانہ تحریروں کے ترجموں میں یہ ماند سی پڑ جاتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم نے ایسے ترجمے کم کئے ہیں جس میں زبان و بیان کے نئے اسلوب و تجربہ کا خیال بھی رکھا گیا ہو۔ دوسرے ترجمہ کرتے وقت نہ تو ہم نے نئے لفظوں کی ٹوہ لگائی ہے اور نہ لفظوں کو مخصوص معنی و مفہوم میں استعمال کرنے کی کوشش کی ہے ایک ہی لفظ کو مختلف لفظوں سے ترجمہ کر کے ہمیشہ اپنا کام نکال لیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں یہ الفاظ ذہن میں پورے طور پر معنی و مفہوم کی تصویر ابھارنے میں ناکام رہتے ہیں۔ لفظوں کے ترجمے اور معنی متعین کرنے سے ایک طرف تو ابلاغ کا مسئلہ سہل ہو جاتا ہے دوسرے زبان میں سنجیدگیِ اظہار پیدا ہو جاتی ہے پچھلے دنوں میٹرک کے امتحان میں ایک سوال یہ پوچھا گیا کہ "مخلوط اور مرکب میں کیا فرق ہے۔ مثالیں دے کر واضح کیجئے" بہت سے طلبہ اس سوال کا جواب صرف اس لئے نہ دے سکے کہ انھوں نے اپنے نصاب کی کتاب میں "آمیزہ" اور "مرکب" کا فرق پڑھا تھا اور یہاں ممتحن نے "آمیزہ" کے بجائے "مخلوط" کا لفظ استعمال کر کے ابلاغ کے مسئلہ کو طلبہ کے لئے دشوار تر بنا دیا تھا۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ترجموں کے ذریعہ اس ابہام کو دور کریں اور لفظوں کے معنی و مفہوم متعین کر کے انھیں اپنی تحریروں کے ذریعہ مروج کریں۔ انگریزی لفظوں کے اردو ترجموں کی بے احتیاطی کا اثر ہمیں جدید ترجموں پر عام طور پر نظر آتا ہے۔ جس کے اکثر جملے بے معنی و بے ربط سے معلوم ہوتے

ہیں اچھے ترجموں کے ذریعے اس خرابی کو بھی دور کیا جا سکتا ہے۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مترجم میں کام کرنے کا محرّک یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دماغ پر زور ڈالے بغیر کسی دوسرے کے پھلوں کو اپنی زبان کے خوان میں رکھ کر پیش کر دے۔ اگر کتاب کا مصنف مشہور ہوا تو اس کے سہارے مترجم کو بھی شہرت کے پر لگ گئے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ ایک طرف تو مترجم کی ذات مصنّف کی ذات سے ہمیشہ کم تر رہتی ہے۔ برخلاف اس کے مصنّف کی شخصیت ترجمے کے ذریعے پھیل کر اور بڑی ہو جاتی ہے۔ اپنی بات ہو تو آدمی جس طرح چاہے اس کا اظہار کر دے لیکن ترجمہ میں آدمی بندھ کر رہ جاتا ہے۔ مصنّف کے ہاتھ میں اس کی باگ ڈور ہوتی ہے۔ اگر اس نے گرفت سے نکلنے کی کوشش کی تو اصل سے دور ہو جاتا ہے اس کے بالکل مطابق رہنے کی کوشش کی تو بیان میں اجنبیت در آتی ہے۔ جملوں کو توڑ کر اپنے طور پر بیان کرنے کی کوشش کی تو اس کی زبان، بیان و اظہار کے نئے امکانات سے محروم ہو جاتی ہے ایسے میں مترجم کا کام یہ ہے کہ وہ دوسری زبان کے اظہار کو اپنی زبان کے اظہار سے قریب تر لائے۔ اور مصنّف کے لہجے اور طرزِ ادا سے اپنی زبان میں ایک نئے اسلوب کے لئے راہ ہموار کرے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ہمارے یہاں اکثر و بیشتر ترجمے اردو کے روایتی و مروّجہ طرزِ ادا کے ذریعہ کئے گئے ہیں جس سے زبان اور قوتِ اظہار کو ترجموں سے وہ فائدہ نہیں پہنچ سکا ہے جس کے امکانات ہمیشہ اچھے ترجموں میں ہوتے ہیں اور جن کی ہمیں زبان و بیان کی ترقی کے لئے شدّت سے ضرورت ہے۔

ایسے ترجموں میں ممکن ہے آپ کو اجنبیت کا احساس ہو لیکن اس اجنبیت سے جب آپ مانوس ہو جائیں گے تو آپ خود محسوس کریں گے کہ اب زبان خیال واحساس کے بوجھ تلے دب کر نہیں رہ جاتی بلکہ اب اس میں اثر آفرینی کیساتھ بیان کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ ایسے ترجمے روا روی میں نہیں پڑھے جاسکتے۔ اور نہ ان کی حسن و دلکشی ایک ہی نظر میں آپ کے دیدہ و دل تک پہنچ سکتی ہے بلکہ ایسے ترجموں کو آپ پلاٹ، کہانی یا موضوع کی دلچسپی اور افادیت زیادہ نئے فلسفیانہ اندازِ فکر، سنجیدہ تہذیبی رویوں، جملوں کی نئی ساخت، اظہار واندازِ بیان کے نئے امکانات کے لئے پڑھیں گے۔ ایلیٹ نے ایک جگہ لکھا ہے۔

> "جب ایک زبان دوسری زبان سے سبقت لے جانے لگتی ہے تو عام طور پر اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ زبان ایسے فوائد اپنے اندر رکھتی ہے جو اسے آگے بڑھاتے ہیں اور جو نہ صرف اپنے اور غیر مہذب زبان کے درمیان فکر اور لطافتِ اظہار کے اعتبار سے امتیاز رکھتی ہے بلکہ احساس کے اعتبار سے بھی بلند درجہ رکھتی ہے۔"

ہم اپنی زبان کو جب تک لطافت اظہار کے تنوع اور علوم کی وسعت سے مفید نہیں بنائیں گے، ہماری زبان پیچھے رہ جائے گی اور ہماری پوری تہذیب بھی موت کے آغوش میں جا سوئے گی۔ میرا خیال ہے کہ اچھے ترجموں کے ذریعے اپنی زبان اور اپنی تہذیب کی خدمت کر کے اسے مفید، کارآمد اور موثر بنا سکتے ہیں۔

———— • ———— ٭٭٭ ———— • ————

لمیر احمد

ترجمہ اور لسانیات

دوسرے فنون کی طرح ترجمہ بھی ایک باقاعدہ فن ہے اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو اس میدان میں اترتے ہی ہمیں مختلف پل صراطوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ جگہ جگہ ایسے مسائل سامنے آتے ہیں کہ انھیں سلجھانا بظاہر ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ اس فن سے متعلق جو ذمہ داریاں ہم پر عائد ہوتی ہیں، وہ نازک بھی ہیں اور دقت طلب بھی۔ اب تک بہت کم کامیاب ترجمے دیکھنے میں آئے ہیں۔ ہومر کے نغمے ہوں یا شکسپیر کے ڈرامے، ابونواس کے اشعار ہوں یا خیام کی رباعیاں، غالب کی شاعری ہو یا کالی داس کی شکنتلا یا ٹیگور کے پیغامات، ابھی تک ہم یہ دعویٰ کرنے سے قاصر رہے ہیں کہ ان شاہکاروں کو دوسری زبانوں میں من وعن انھیں خیالات، انھیں احساسات انھیں کیفیات اور شدت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جیسی کہ وہ اصل زبانوں میں ملتی ہیں۔ یونانی زبانوں میں ارسطو کے بکھرے ہوئے خیالات کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے۔ آنس ٹائن کے کارناموں پر بھی یہ بات صادق آتی ہے۔ ٹالس ٹائے، بال زک، موپاساں، فلا آرٹ، ای می آئی بردن تے وغیرہ کے شہ پاروں اور فاکس، آرنلڈ، رچرڈس اور

اور آئی لیوٹ وغیرہ کے تنقیدی کارنامے بھی اس الزام سے بری نہیں ہیں۔ ان کوتاہیوں کی مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں، جن پر ذیل میں لسانیات کی مدد سے چند اشارے کئے جاتے ہیں۔

درحقیقت صحیح اور کامیاب ترجمے اسی صورت میں ممکن ہیں جب ہم لکھنے والے کے ذہن میں نہ صرف سفر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں بلکہ ان کیفیات اور احساسات سے بھی گذر سکیں جو تصنیف کا ذریعہ بنی ہیں۔ ترجمہ محض ایک جسم کو دوسرا لباس پہنا دینے کا نام نہیں ہے بلکہ ایک جسم کے مقابلے میں بالکل ویسا ہی جسم تراش کر اسے دوسرے لباس میں اس طرح لے آنا ہے کہ دونوں قالبوں میں ایک ہی روح ہو۔ یہاں لباس، جسم اور روح سے مراد ترجمے کی زبان، اصل عبارت کا مرکزی خیال اور وہ تاثر ہے جو پڑھنے کے بعد دل و دماغ میں قائم ہوتا ہے۔

ترجمے کے وقت جو مسائل سامنے آتے ہیں، انھیں دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی ادبی شاہکاروں کے ترجمے سے متعلق مسائل جس میں نثر اور شاعری دونوں شامل ہیں۔ دوسرے وہ مسائل جو علمی یا ٹیکنیکل مضامین کا ترجمہ کرتے وقت درپیش ہوتے ہیں۔ اول الذکر میں مرکزی خیال، مجموعی تاثر، خیال کی شدت، تخیل کی پرواز، الفاظ کی نشست و برخاست، صوتی آہنگ، بحری تناسب اور ہیئت وغیرہ کو ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے۔ جب کہ مسائل کی دوسری قسم میں مرکزی خیال، مجموعی تاثر، سیاق و سباق اور اصطلاحات پر ہماری خاص توجہ ہوتی ہے ہر اعتبار سے ترجمے میں مرکزی خیال کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یعنی جس چیز کو ہم مواد کے طور پر استعمال کر رہے ہیں اس کے ذریعے مصنف کیا کہنا چاہتا ہے۔

ایسے گرفت میں لینے کے لئے ترجمے والی زبان پر عبور حاصل ہونا چاہیئے۔ نثر خواہ وہ کسی ادبی، علمی یا ٹیکنیکل کارنامے پر مشتمل ہو، شاعری کے مقابلے میں نسبتاً آسان ہے۔ اس لئے اس میں مرکزی خیال کو پا لینے میں زیادہ وقت نہیں ہوتی۔ نثر میں مرکزی خیال مختلف پیراگرافوں میں بکھرا ہوا ہوتا ہے۔ یہ پیراگراف بالکل ان لکیروں کی طرح ہوتے ہیں جن کی مدد سے تصویر بنائی جاتی ہے۔ جس طرح لکیروں کا ہر خم، ہر زاویہ بامعنی ہوتا ہے اور اپنی مختلف کروٹوں سے وہ تصویر کاڑھنے میں مدد دیتا ہے اسی طرح تحریر کا ہر پیراگراف مرکزی خیال کو واضح کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ شاعری میں مرکزی خیال کو ڈھونڈ نکالنے میں ہمیں ایک ایک لفظ پر توجہ دینی پڑتی ہے شاعر کے دل میں سفر کرنا پڑتا ہے۔ ان کیفیات اور احساسات سے گذرنا پڑتا ہے ——————— جو مرکزی خیال کی تحریک کا باعث بنتے ہیں۔ یہاں ترجمے کی زبان بولنے والوں کی تاریخی، تہذیبی اور سماجی قدروں کا بھی پہچاننا پڑتا ہے تب کہیں جاکر مرکزی خیال سامنے آتا ہے۔ دوسری اہم چیز ترجمے میں مجموعی تاثر کو پیش کرنا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم دونوں زبانوں کی ساختوں اور ان کی ادبیات سے پوری طرح واقف ہوں۔ زبانوں کے مزاج کو پہچانتے ہوں۔ ان کے اشاروں، کنایوں، اور استعاروں کو سمجھتے ہوں۔ جسے مواد کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے، اس کی جزئیات سے پوری طرح باخبر ہوں۔ صحیح تاثر پیش کرتے وقت ایک بڑی دشواری اس وقت سامنے آتی ہے جب ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ اس کا دامن، سرمایہ الفاظ، خیال اور معنی و مطالب کے اعتبار سے، اس زبان کے مقابلے میں جس کا ترجمہ کیا جا رہا ہے تنگ

ہے۔ اس کمی کو زبان کے مزاج کے مطابق الفاظ مستعار لے کر یا اختراع کر کے ہم کام چلا سکتے ہیں۔ تیسری بنیادی چیز "شدت" ہے۔ یعنی جس شدت کے ساتھ مصنف یا شاعر نے اپنے خیالات پیش کئے ہیں۔ تقریباً وہی بات ترجمے میں بھی آنی چاہئے۔ اگر ترجمے میں ہم ایسا کرنے سے قاصر رہے ہیں تو بلا شبہ وہ صحیح مند ترجمہ نہیں ہوگا۔ اس کے لئے ہمیں الفاظ کا اس طرح انتخاب کرنا چاہئے کہ ترجمے کے الفاظ کے معنی و مطالب اپنے استعمال کی وجہ سے اس طرح قید ہو جائیں کہ وہ الفاظ ویسا ہی مفہوم ادا کریں جیسا کہ ہم چاہتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات کا بھی مناسب ترجمہ ہونا چاہئے تاکہ "شدت" کو صحیح غذا ملتی رہے۔

ترجمے میں الفاظ کا صحیح استعمال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر ایسا کرنے میں ہم ناکام رہے ہیں تو مرکزی خیال، مجموعی تاثر اور خیال کی شدت تینوں چیزیں متاثر ہو سکتی ہیں۔ اس لئے اس منزل سے گزرتے وقت (خاص کر شاعری کے ترجمے میں) بڑی احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ ہر لفظ معنی کے اعتبار سے اپنا ایک حلقہ رکھتا ہے اس لئے یہ حلقے اصل کے جتنے مطابق ہوں گے۔ ترجمے کے لئے سودمند ہوگا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ زبان میں وہ الفاظ نہیں ملتے جنھیں کسی خیال ادا کرنے کے لئے ہم ڈھونڈھنا چاہتے ہیں۔ ایسی صورت میں زبان کی ساخت سے مطابقت رکھنے والے لفظ کو کسی قریبی زبان سے مستعار لے سکتے ہیں۔ یہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس زبان سے ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ اس کے اس لفظ کو ہی اپنا لیں جس کے لئے ہمیں ضرورت ہے بہر حال دونوں صورتوں میں ترجمہ کی جانے والی زبان کی انفرادیت، مزاج، صوتی آہنگ اور گردانوں میں اس لفظ کی ساخت کے اصولوں کو مدنظر رکھنا مناسب ہوگا۔

..... عام طور پر سادہ (Simple) الفاظ کو مستعار لینا چاہئے ۔ اگر مختلف گردانوں پر مشتمل پیچیدہ (Complex) یا مرکب (Compound) الفاظ کو لیا جائے گا تو ہو سکتا ہے آگے چل کر جب مختلف معنوں کے لئے ان الفاظ کی مزید گردانی شکلیں مہیا کرنی ہوں تو وہ ساخت کے اعتبار سے ہمارا ساتھ نہ دیں۔

ترجمے کے وقت اگر سیاق وسباق کی مدد سے الفاظ کا انتخاب کیا جائے تو ہم اپنے مقصد میں زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ یہی واحد ذریعہ ہے جو لفظ کے صحیح معنی ہم تک پہنچاتا ہے ۔ انگریزی کے لفظ (House) کا اردو میں ترجمہ کرنا بہت آسان ہے یعنی گھر یا مکان ۔ لیکن کبھی کبھی یہ لفظ منفرد حیثیت سے یا دوسرے الفاظ کے اشتراک سے تحریر میں دوسرے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ اب اس کے عبارت میں کیا معنی ہو سکتے ہیں یہ سیاق وسباق ہی سے واضح ہو سکتا ہے۔ ذیل میں انگریزی میں (House) کے مختلف استعمال اور معنوں کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔
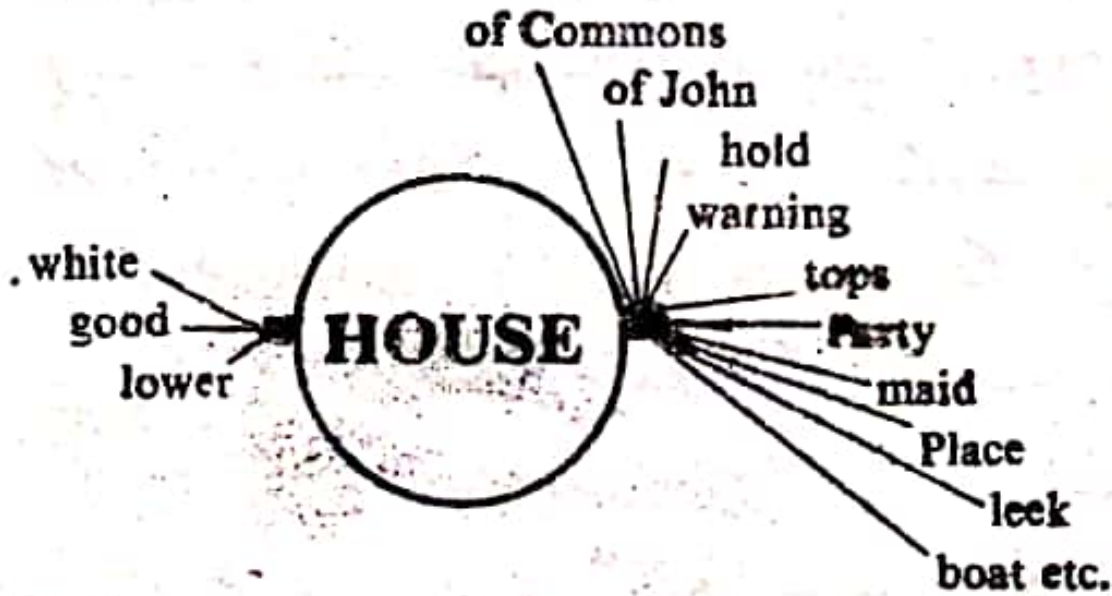
اگر لفظ کسی کردار سے منسوب ہے تو ترجمے کے وقت اس پر ہوشیاری سے ہاتھ ڈالنا چاہئے۔ اردو میں ہندی سے ترجمہ کرتے ہوئے اگر کوئی جملہ "سمراٹ اشوک نے پرستھان کا آدیش دیا ہے" تو اس کا مناسب ترجمہ "شہنشاہ اشوک نے کوچ کا حکم دیا" کے بجائے "سمراٹ اشوک نے کوچ کا حکم دیا" زیادہ مناسب ہوگا۔ یہاں اشوک کے ساتھ شہنشاہ کے بجائے سمراٹ کا لفظ زیادہ فصیح ہے۔ عام طور پر رسوم رواج اور تہوار کے اسما بھی ترجمہ نہیں کئے جاتے اور حاشیوں میں ان کی تشریح کردی جاتی ہے یہ اسی صورت میں صحیح ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کیا جارہا ہے اس میں ان رسوم و رواج یا تہواروں کا چلن نہ ہو جس سے ترجمہ کیا جارہا ہے جہاں تک تشبیہوں اور استعاروں کا تعلق ہے یہ احساس کو شدید کرنے اور خیال کو واضح طور پر پیش کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان کے ترجمے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوتی سوائے اس وقت کے جب وہ ترجمہ ہونے والی زبان میں نہ ملیں ایسی صورت میں انھیں زبان کے مزاج کے مطابق اس طرح ڈھالنا کہ ان سے وہی مقاصد پورے ہوں، جن کے لئے مصنف نے انھیں استعمال کیا ہے۔ ایک ذمہ داری کا کام ہے۔ تشبیہات اور استعارات کا بہت بڑا تعلق اس زبان کے بولنے والوں کے رجحانات، احساسات اور سوچنے کے اندازوں سے ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر زبان میں یہ چیزیں یکساں نہیں ہوتیں اسلئے ضروری نہیں ہے کہ کسی تشبیہ یا استعارے سے ایک زبان میں جس طرح کام لیا جارہا ہے، دوسری زبان میں بھی وہی تاثر پیش کرے۔

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے یہ ترجمے میں سب سے مشکل مہم کہی جاسکتی ہے۔ یہاں کئی لغزشیں ہونے کے امکانات رہتے ہیں۔ اس میں جتنی محنت

ایک شاعر اپنے اشعار کے لئے کرتا ہے، اس سے کہیں زیادہ کاوشیں مترجم کو کرنی پڑتی ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جتنے اچھے ترجمے نثری شہ پاروں کے ہو گئے ہیں اتنے اچھے اور نہ تعداد میں ان سے زیادہ شعری ترجمے ہو سکے ہیں۔ شعری ترجمے میں اچھے شعر کے تمام لوازمات اور ان کے نازک مراحل سے مترجم کو گذرنا پڑتا ہے۔ وہ ایک اچھے شاعر سے زیادہ ذمہ داریاں نبھاتا ہے اسے شاعر کے دل و دماغ میں گھنٹوں سفر کر کے ان کیفیات سے گزرنا پڑتا ہے جن کے تحت شعر کہا گیا ہے۔ یہاں آورد کو آمد بنانا بھی اسی کا کام ہوتا ہے۔ شاعر کے محسوسات کو گرفت میں لانے کے لئے مترجم کو ترجمے کی زبان کے سرمایۂ الفاظ کو کھنگالنا پڑتا ہے۔ الفاظ کے معنی و مطالب سے صحیح کرنے کے لئے میچنگ کرنی پڑتی ہے۔ صوتی آہنگ کے لئے الفاظ کی ایک ایک آواز کو ناپنا اور تولنا پڑتا ہے۔ غرض ایک لمبی تراش خراش، تلاش اور کاوش کے بعد روح کو صحیح قالب ملتا ہے۔ ایسے موقعوں پر ہیئت یا فارم کا صحیح فیصلہ کرنا بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اردو میں غزل، نظم، رباعی، مثنوی، مرثیہ قصیدہ وغیرہ مختلف اصناف سخن ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی اپنی الگ الگ خصوصیات اور اپنا الگ الگ طرز بیان ہے۔ ظاہر ہے ہر ادب میں یہ اصناف رائج نہیں ہیں اس لئے ترجمے والی زبان میں مروج اصناف میں سے اپنے مقصد کے لئے کسی ایک کو اس طرح چننا چاہیئے کہ وہ سارے تقاضے پورا کرے شعری ترجمے میں مرکزی خیال کو گرفت میں لے کر اسے متعلقہ زبان میں ظاہر کر دینا ہی کافی نہیں ہے۔ ہمیں اس تاثر کو بھی پیش کرنا ہو گا جو اصل کو پڑھ کر قاری کے ذہن میں قائم ہوتا ہے۔ زہر عشق میں وصیت نامے کے ترجمے کے بعد مرکزی خیال کے

ساتھ اگر وہ شدت تاثر اور احساسات ہمارے اندر پیدا نہیں ہوں گے جو اسے پڑھ کر ابھرتے ہیں تو یہ ترجمے اور اصل دونوں کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

ترجمے میں ایک خاص پریشانی محاورات کے ساتھ درپیش آتی ہے۔ ہر زبان میں محاورے بولنے والوں کی روایات اور تہذیبی قدروں کے مطابق ہوتے ہیں وہ جو مفہوم ادا کرتے ہیں، ان کے پیچھے ایک تاریخ ہوتی ہے۔ ایک خاص محاورے کے ذریعے ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں بہت ممکن ہے دوسری زبان میں اس خیال کو ادا کرنے کے لئے کوئی محاورہ سرے سے ملتا ہی نہ ہو۔ ایسی صورت میں زبردستی عبارت کے حسن کو بگاڑ دیتی ہے۔ اس لئے ہمیں اعتدال سے کام لیتے ہوئے محاورے کی جگہ محاورے کی جستجو کی بجائے اپنی ضرورت کے مطابق محاورے کے مفہوم کو..... الفاظ سے اور الفاظ کے معنوں کو محاورے کی مدد سے پیش کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ترجمہ ہونے والی زبان میں کسی خاص محاورے کا مفہوم ملتا ہے تو اس کے لئے صحیح قالب ڈھونڈ نکالنا یقیناً ایک دشوار کام ہوگا۔ انگریزی کے قالب میں اردو کے محاورے "بھاگتے بھوت کی لنگوٹی" کی روح اتارنا، یا رائے کھینا، منہ سے بولو، سر سے کھیلو کے لئے صحیح قالب ڈھونڈنا ـــــــ اردو میں بیگمات کی زبان کے ساتھ بھی تقریباً یہی بات ہے جس میں کتنے ہی ایسے الفاظ فقرے اور جملے مل جائیں گے جنہیں اردو، فرانسیسی، جرمنی یا انگریزی کے قالب میں اتارنا تقریباً ناممکن ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اردو کے مقابلے میں ان زبانوں کی عورتوں کی طرزِ زندگی عادات اطوار، سوچنے اور بات کرنے کے انداز قطعی مختلف ہیں۔ اسکے علاوہ مشرق میں بعض رسومات، خاندانی روایات اور رشتوں کے اعتبار سے بہت سی باتیں اور انکے بیان کرنے کے انداز ایسے ہیں جو مغرب والوں کی سمجھ میں نہیں آسکتے

ترجمے کے وقت اگر ان چیزوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ عبارت کے منتہائے کمال پر اثر پڑے یا وہ فضا ہی قائم نہ رہے جو اس تحریر کی جان ہے مثال کے طور پر عصمت چغتائی کے "چوتھی کا جوڑا" یا ڈاکٹر نذیر احمد کا ناول۔ "توبۃ النصوح" کو لیجئے۔ ان دونوں میں اتنی ہندوستانیت ہے کہ انھیں مغرب کی کسی زبان میں لانے کے لئے اس زبان کو "اردو" بننا پڑے گا۔

کسی علمی یا ٹیکنیکل مضمون کے ترجمے کے وقت سہل پسندی سے کام لیتے ہوئے ہم بعض اوقات وہی اصطلاحات نقل کر دیتے ہیں جو اصل تصنیف کی زبان میں پائی جاتی ہیں۔ اس طرح حاشیوں میں ان کی تشریح کرتے ہوئے ہم آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اگر نقل ہونے والی اصطلاح ہماری زبان کے مزاج کے مطابق ہے اور عبارت میں ثقالت کو نہیں بڑھنے دیتی تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن یہاں ایک مسئلہ یہ کھڑا ہو سکتا ہے کہ اپنی وقتی ضرورت کے تحت ہم جو اصطلاح اپنا جاتے ہیں اس کے دوسرے مفہوم کے لئے مختلف اشتقاق یا گردانیں جب سامنے آئیں گی تو ان کے لئے کیا صورت ہو گی۔ ظاہر ہے اس طرح سامنے آنے والی تمام شکلوں کو تو مستعار نہیں لیا جا سکتا اس لئے بہتر یہ ہو گا کہ ہم جو اصطلاح اپنا رہے ہیں اس کی ساق، STEM، تو جوں کی توں لے لیں لیکن اس میں ترجمہ ہونے والی زبان کے مروج سابقے یا لاحقے ہی استعمال کریں جیسے لسانیات میں ایک اصطلاح PHONOLOGY ہے اس میں PHONO ۔ (< PHONEME) ساق کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے پاس (LOGY) کے لئے (۔ یات) ۔ لاحقہ ملتا ہے۔ اس طرح PHONOLOGY کے مترادف جو اصطلاح اردو میں بنے

گی وہ فونیمیات ہو سکتی ہے اسی طرح PHONOLOGICAL کے لئے فونیماتی PHONOMIZATION کے لئے فونیمانا وغیرہ اصطلاحیں ممکن ہیں۔

اصطلاحات کے سلسلے میں دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ترجمے والی زبان میں سے فیصح ساق چھانٹ کر لاحقوں اور سابقوں کی مدد سے اصطلاح کے لئے کوئی لفظ اختراع کر لیا جائے اس کیلئے ضروری ہے کہ پہلے اصل اصطلاح کو ایسے چھوٹے چھوٹے بامعنی ٹکڑوں میں بانٹ لیا جائے۔ جنھیں لسانیات میں مارفیموں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پھر متعلقہ زبان سے کسی متقابل ساق کا تعین کر کے اس میں مفہوم کے اعتبار سے مروّج لاحقوں یا سابقوں کو جوڑا جا سکتا ہے یہاں یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ ہر ساق کے ساتھ یکساں معنوں کے لئے ایک سے لاحقے استعمال نہیں ہوتے۔ مثال کے لئے انگریزی کے لفظ کا اردو میں ترجمہ ملاحظہ ہو۔

NATIONALIZATION قوم ی (ی) انا . قومیانا

لاحقے — ساق — ساق — لاحقے
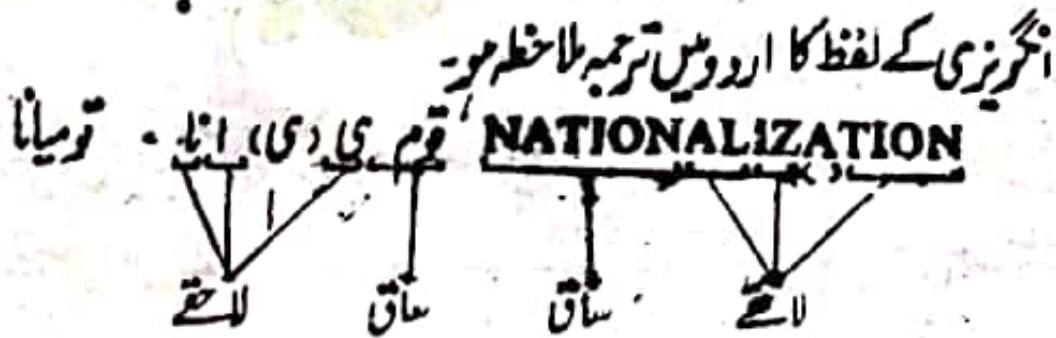
اصطلاحات کے وضع کرنے میں بعض دوسرے قسم کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے لئے لسانیات کی اصطلاحات کو لیجئے۔ اس علم کے کسی معقول عام ترجمہ کرنے بیٹھیں تو جگہ جگہ ہمیں سوچنا پڑے گا کیونکہ ہماری زبان اس علم سے بڑی حد تک بے بہرہ ہے۔ الفاظ کی ساخت کو زیرِ بحث لاتے وقت ROOT اور STEM کے لئے ہم حسب ترتیب مادہ اور ساق کا استعمال کرتے ہیں لیکن NUCLEUS جو مادے اور ساق سے ذرا ہٹی ہوئی ایک چیز ہے، ہمارے

پاس کوئی لفظ نہیں ہے جب کہ یہ اصطلاح ROOT اور STEM دونوں سے مختلف مفہوم کے لئے استعمال ہوتی ہے اسی طرح صوتی بحث میں CONCOID اور VOCOID کے لئے اگر مصمتے اور مصوتے کی اصطلاح رکھیں تو وہ مفہوم نہیں ادا ہوتا۔ جو پائیک نے ان کے لئے اختیار کئے ہیں اور جن کی تعریف CONSONANT اور VOWEL سے مختلف ہیں۔

بعض اوقات قواعد کے کچھ ایسے بنیادی عناصر ترجمے کے وقت سامنے آجاتے ہیں کہ بڑی پریشانیاں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر جرمن زبان کے کسی ترجمے کو لیجئے۔ اگر ہم اردو کے لئے اس کا ترجمہ کر رہے ہیں تو اسما کی تذکیر و تانیث میں یہ زحمت ہو سکتی ہے کہ جرمن زبان میں مذکر، مونث اور NEUTRAL کا جو فرق ملتا ہے انھیں اسما کے ذیل میں کس طرح ظاہر کیا جائے گا، جب کہ اردو میں NEUTRAL جنس سرے سے ہے ہی نہیں اسی طرح زمانوں (TENSES) میں AEORIST والے جملوں کا کیا ترجمہ ہوگا کیونکہ اردو میں صرف ماضی، حال اور مستقبل ہی ملتے ہیں! اسی زبان میں ہر پہر کے سلام کیلئے الگ الگ الفاظ ہیں۔ عبارت میں کبھی کبھی مصنف پہر کا تعین کرنے کے لئے محض سلام کے الفاظ سے کام لیتے ہیں اردو میں سلام کے لئے مختلف الفاظ ہیں لیکن ان سے وقت یا پہر کا اندازہ نہیں ہوتا اگر ترجمے میں ایسی صورت سامنے آجاتے تو اس کے لئے ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے سوائے اس کے کہ ہم وقت کا تعین ایک جملے کے اضافے سے اس وقت کر دیں۔ جب عبارت میں پہر کی ضرورت محسوس ہو۔

ترجمے کے وقت دونوں متعلقہ زبانوں کی ادبیات پر پہلے سے نظر ہونی

چاہیئے۔ جس مصنف یا شاعر کے کارنامے کا ترجمہ کیا جارہا ہے اس کے دوسرے شاہکاروں سے واقف ہونا چاہیئے۔ اس کے اسلوب کی خصوصیات بھی ذہن میں رہنی چاہئیں۔ یہاں متعلقہ زبانوں کی مختلف بولیوں کے فرق سے بھی واقفیت ضروری ہے کیونکہ نثری شہ پارے کے ترجمے کے دوران بہت ممکن ہے کہ مصنف نے اعلیٰ سوسائٹی اور دیہاتی لوگوں کی زندگیوں پر روشنی ڈالی ہو اور اپنی تحریر میں جگہ جگہ ان کرداروں سے مکالمے بلوائے ہوں۔ مکالموں کے اس فرق کو زبان اور بولی کے فرق کو سمجھنے کے بعد ہی صحیح ترجمے میں پیش کیا جا سکتا ہے اور جس زبان میں ترجمہ کیا جارہا ہے۔ وہاں اس فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے کرداروں کے مکالمات کے ساتھ انصاف کیا جا سکتا ہے۔

ترجمے میں جملہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر جملے کی ساخت کو پوری طرح دھیان میں نہ رکھا جائے تو مفہوم کی روح تو متاثر ہوتی ہی ہے، تحریر میں خیال کا تسلسل بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ ہر پیراگراف کا آخری جملہ عام طور پر اس پیراگراف کا نچوڑ ہوتا ہے اس لئے اس جملے کے ترجمے میں بڑی مہارت کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایسے موقعوں پر جہاں جملے کا مفہوم سمجھ میں نہ آرہا ہو، وہاں جملے کو چھوٹے چھوٹے با معنی حصوں میں تقسیم کرکے عمل (function) اور ان کی مطابقت (agreement) کے اعتبار سے جملے کے معنوں کو سمجھنا چاہیئے۔ عمل اور مطابقت کو مارفیموں سے لفظوں میں، لفظوں سے فقروں میں اور فقروں سے نیم جملوں (clauses) میں دیکھنا کارآمد ہوسکتا ہے جیسے:

THE BIG WHITE BEARDED MAN WHO LIVES THERE HAS GONE TO MR. SAM'S HOUSE.
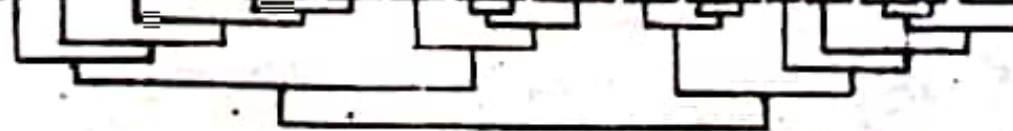
انگریزی کے اس جملے میں مختلف الفاظ، فقرے اور نیم جملے ملتے ہیں جنہیں پڑے ہوئے مربع قوسین کی مدد سے ظاہر کیا گیا ہے یہ مربع قوسین پہلے سابق اور لاحقوں کی مدد سے تشکیل پانے والے پیچیدہ الفاظ (Complex words) کی نشاندہی کرتے ہیں، پھر ان الفاظ سے مل کر بننے والے فقروں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ اس بات کا بھی پتہ دیتے ہیں کہ فقروں کی ترتیب نیم جملوں میں کیا ہے؟ بعد میں انھیں کی مدد سے جملے کی مجموعی ساخت سامنے آتی ہے۔ مربع قوسین جملے میں ہر یونٹ کی مطابقت کو ظاہر کرتے ہیں۔ جس سے ہم بآسانی جملے کے صحیح مفہوم تک پہنچ جاتے ہیں۔ اسی طریق کار کی روشنی میں ترجمہ ہونے والے جملے کو دیکھا جا سکتا ہے آیا یونٹوں کے ان مختلف عملوں اور مطابقتوں کا صحیح تعین ہوا ہے یا نہیں۔ اس طریق کار کی روشنی میں ذیل میں بالائی جملے کا ترجمہ اردو میں دیکھئے۔
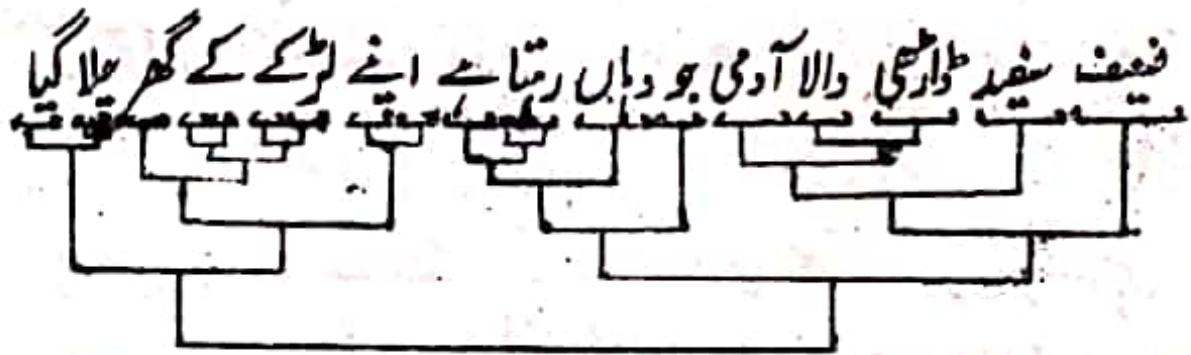
اردو کی اپنی انفرادیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے (ضعیف) لفظ آدمی سے فوراً پہلے آنا چاہئے اس لئے اس جملے کا صحیح ترجمہ اردو میں اس طرح ہوگا، سفید ڈاڑھی والا ضعیف آدمی (مرد) جو وہاں رہتا ہے، اپنے لڑکے کے گھر چلا گیا۔

ایسے موقعوں پر کبھی کبھی پیچیدہ فقرے یا نیم جملے بھی سامنے آجاتے ہیں جن میں

نوعیتوں میں مطابقت کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ مثال کے لئے انگریزی کا ایک نیم جملہ دیکھئے۔

OLDMAN ANDWOMAN (ب) OLDMAN ANDWOMAN (۱)

یعنی — یعنی

بوڑھا آدمی اور (بوڑھی) عورت : بوڑھا آدمی اور (ایک) عورت

ایسی صورت میں صحیح مفہوم تک پہنچنے کے لئے یا تو ہمیں پورے جملے کی ساخت کو ذہن میں رکھنا چاہئے یا پھر سیاق و سباق کی مدد سے اس فقرے کے اصل معنی طے کرنے ہوں گے۔

انگریزی یا کسی اور خاص زبان سے ترجمہ کرتے وقت ہمیں اکثر عبارتوں میں مختصر فارموں کا چلن ملتا ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اردو میں بھی ان کی بنیادوں پر مختصر فارموں کو وضع کریں، مناسب یہ ہوگا کہ پورے لفظ لکھے جائیں کیونکہ پہلی صورت میں ہم ترجمہ نہیں کریں گے۔ بلکہ ہمارا یہ عمل نقالی کے مترادف ہوگا۔ البتہ اگر کوئی ایسی فارم عبارت میں آئی ہے جو ہمارے لئے عام فہم ہے تو اسے جوں کا توں استعمال کر سکتے ہیں جیسے یو۔ این۔ او۔ یا ٹی۔ وی۔ وغیرہ لیکن ہم چاہیں کہ W.H.O کو ترجمے میں ڈبلو، ایچ، او یا ا۔ ص۔ ع (انجمن صحت عالم) لکھیں تو شاید مناسب نہ ہوگا۔

ڈاکٹر عنوان چشتی

منظوم ترجمے کا عمل

ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترسیلِ خیال اور انتقالِ فکر کا عمل ہے۔ اس عمل کے چار واضح مدارج ہیں جنھیں :

۱۔ انتخاب متن

۲۔ ابلاغ کی منزل

۳۔ ترسیل کا فن ... اور

۴۔ نئی مگر "پرانی تخلیق"

کا نام دیا جا سکتا ہے۔

انتخاب متن کی منزل میں مترجم آزاد ہوتا ہے اور بہت سی کتابوں میں سے اپنی پسند کی ایک کتاب کا انتخاب کر سکتا ہے۔ اس انتخاب میں شعور اور ذوق اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔ انتخاب متن کے بعد مترجم پابند ہو جاتا ہے۔ یہ پابندی اس سے دہری وفاداری کا مطالبہ کرتی ہے۔ پہلی وفاداری متن کے ابلاغ سے اور دوسری اس کی ترسیل سے ہوتی ہے۔ انتخاب متن سے پہلے مترجم کی بنیادی ذمہ داری

یہ ہے کہ وہ جس کتاب کا ترجمہ کرنا چاہتا ہے اس کی ادبی، فنی، سماجی اور جمالیاتی قدر و قیمت سے پوری طرح آگاہ ہو جائے کسی فن پارہ کی قدر و قیمت کا عرفان مترجم میں ذمہ داری، دیانت، خلوص اور محنت کا احساس پیدا کرتا ہے۔

انتخابِ متن کے بعد فن پارہ کے مطالعہ اور اس کے ابلاغ ——— (Comprehension) کی منزل آتی ہے۔ ابلاغ کا نقطۂ آغاز وہ لمحہ ہے جب مترجم قاری کی حیثیت سے اس کا مطالعہ شروع کرتا ہے اور اس عمل کا لمحۂ آخر وہ لمحہ ہے جب قاری زیرِ مطالعہ فن پارے کے مفہوم یا مفاہیم کو پوری طرح سمجھ کر مطمئن ہو جاتا ہے، مصنّف کی مجرد آگہی، خیال، فکر، جذبہ یا نقطۂ نظر کو الفاظ کے ذریعے قاری کے ذہن میں جلوہ گر ہونے کو ابلاغ کہتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ مصنف کے مرکزی خیال کو قاری کے ذہن میں جلوہ گر ہونے کو ابلاغ کہتے ہیں۔ اس طرح یہ وہ عمل ہے جو کسی فن پارہ کو پڑھ کر یا مخاطب کی بات یا شعر سن کر قاری یا سامع کے ذہن میں واقع ہوتا ہے اس عمل کی دو سطحیں ہیں: پہلی نفسیاتی اور دوسری لسانیاتی۔ نفسیاتی سطح وہ سطح ہے جس پر شعور، تحت الشعور اور لاشعور کی قوتیں نظری اصولوں کے مطابق سرگرم ہوتی ہیں اور ایک دوسرے سے پُراسرار اشتراکِ عمل کرتی ہیں لسانیاتی سطح وہ سطح ہے جہاں الفاظ اور ان کی مختلف شکلیں اپنی گرہیں کھولتی اور معانی کا انکشاف کرتی ہیں۔ یہ دونوں عمل ایک ساتھ رونما ہوتے ہیں اور ایک دوسرے میں پیوست بلکہ تحلیل ہوتے ہیں۔ ابلاغ کی دونوں سطحوں کا یہی تال میل ہی قاری کو مصنف کی اصل اور بنیادی خیال تک پہنچاتا ہے۔

ابلاغ ایک فطری عمل ہے۔ دوسرے نظری کاموں کی طرح یہ عمل بیک وقت

ذہنی بھی ہے اور اکتسابی بھی اسکا انحصار ایک طرف عمر، تعلیم اور تجربہ پر اور دوسری طرف محنت، ذہانت اور مزاجی کیفیت پر ہے۔ چونکہ انسان کا ذہن ہمیشہ ایک حالت میں نہیں رہتا۔ اس لئے ایک ہی فن پارے کا ابلاغ ایک ہی شخص کو مختلف اوقات میں مختلف ہوتا ہے۔ ایک ہی وقت میں مختلف لوگوں کو مختلف ابلاغ بھی ہوتا ہے۔ چونکہ تمام افراد کی ذہنی صلاحیت یکساں نہیں ہوتی اس لئے ابلاغ بھی یکساں نہیں ہوتا۔ ابلاغ، زمان ومکان اور افراد کے تعلق سے اپنی کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے اشعار کا مفہوم تمام قارئین کے ذہن میں یکساں نہیں ہے۔ منظوم ترجموں کے دائرے میں ابلاغ کے اختلاف کی مثال لارڈ لٹن کی نظم "نابینا پھول والی" کے ترجمے ہیں مولانا محمد حسین آزاد کے ترجمے "نابینا پھول والی کا گیت" سید محمد ابراہیم اشک کے "اندھی پھول والی کا گیت" سرور جہاں آبادی کے منظوم ترجمے۔

"اندھی پھول والی کے گیت"

سید مہدی حسن احسن لکھنوی کے "اندھی پھول والی کے گیت" رشک بلند شہری کے "اندھی پھول والی کا گیت" اور سائل دہلوی کے ترجمے "پھولوں کی تعریف میں" نمایاں اختلافات ہیں۔ مثال کے طور پر ان منظوم ترجموں کا ایک ایک ابتدائی شعر پیش کیا جاتا ہے:۔

لوگو میرے پھول خرید و۔ کہتی ہوں عجز سے پھول خرید و (آزاد[1])

میں پھول بیچنے لائی ہوں پری زاد و

بن آنکھوں والی سے ان کو نجات دلوادو (سید محمد ابراہیم اشک[2])

---

[1] ماہنامہ مخزن لاہور، مئی ۱۹۰۸ء [2] ماہنامہ مخزن لاہور مئی ۱۹۰۸ء

لوگو چلو مرے دل رعنا خرید لو
اس اندھی پھول والی کا سودا خرید لو (سرور جہاں آبادی[۵۳])

گود میں مالن کے ہیں ٹوٹے ہوئے ڈالی کے پھول
لو خریدار و یہ اندھی بیچنے والی کے پھول (احسن لکھنوی[۵۴])

خریدو پھول میرے لینے والو
ذرا ان کی بہاروں کا مزہ لو (اشک بلند شہری[۵۵])

باغباں کی جائے جس کے دونوں دیدے ہیں پٹم
گھر سے نکلی ہے پھول لے کر بیچنے بازار میں (سائل دہلوی[۵۶])

ان اشعار میں ابلاغ کے اختلاف سے شعری زبان، تکنیک، اسلوب اور بحر و وزن کی تبدیلیاں نمودار ہوتی ہیں آزاد بحر سے پھول خرید دکی صدا لگاتے ہیں۔ سید محمد ابراہیم اشک پری زادوں کو مخاطب کرکے بن آنکھوں والی سے پھولوں کو نجات دینے کی گذارش کرتے ہیں سرور جہاں آبادی پھولوں کے سودے کو گلِ رعنا قرار دے کر گاہکوں کو متوجہ کرتے ہیں احسن لکھنوی اندھی بیچنے والی کے دامن ڈالی کے ٹوٹے ہوئے تازہ پھولوں کو دکھا کر للچاتے ہیں ــــــ رشک

---

[۵۳] ماہنامہ مخزن لاہور، جون ۱۹۰۵ء

[۵۴] " " " جون "

[۵۵] ماہنامہ مخزن لاہور مئی ۱۹۰۵ء

[۵۶] " " جون ۱۹۰۵ء

بلند شہری پھولوں سے بہاروں کا مزہ لوٹنے کی خوشخبری سناتے ہیں اور رسائل دیلوی محض کو سنے لگتے ہیں۔ بظاہر ان تمام شعروں میں اندھی پھول والی پھول بیچنے کی صدا لگاتی ہے مگر ہر شاعر کے صدا لگانے کا انداز الگ ہے۔ یہ اختلاف بے وجہ نہیں ہے بلکہ ابلاغ کے اختلاف سے وابستہ ہے اس لئے ابلاغ کی مختلف سطحیں اور پرتیں ہوتی ہیں۔

ابلاغ کی بعض بنیادی ضرورتوں کو پورا کر کے اس کے مسائل کو بڑی حد تک حل کیا سکتا ہے انہیں پہلی ضرورت مصنّف کے بارے میں باخبری ہے مترجم کیلئے مصنّف کے فلسفۂ حیات، طرزِ احساس، علمی لیاقت، نفسیاتی کیفیت اور اس کے فنی طریقۂ کار سے واقفیت ضروری ہے۔ چونکہ ہر مصنّف موضوع اور مواد کو اپنے طور پر برتنے کی کوشش کرتا ہے اس لئے اس کی تصنیف کے الفاظ، تراکیب محاورات، استعاروں، پیکروں، علامتوں اور اساطیر وغیرہ کو مصنّف کے فکر و فن کی روشنی میں سمجھنا چاہیئے دوسری ضرورت مصنّف کے عہد کا راز داں ہونا ہے۔ ہر تخلیق خواہ کتنی ہی ذاتی اور انفرادی ہو اپنے عہد کے معاشی، تہذیبی، سیاسی، ادبی، تعلیمی اور فنی عمل اور ردِ عمل سے وابستہ ہوتی اور اس سے نمو پاتی ہے اس میں روحِ عصر یا تاریخیت کی کسی نہ کسی حد تک جلوہ گری ہوتی ہے اس لئے مصنّف کی شخصیت کے ساتھ اس کے عہد کی روایات، تحریکات اقدار اور سماجی پس منظر سے آگاہی ضروری ہے۔ تیسری ضرورت اس زبان کی تاریخ سے واقفیت ہے جس سے ترجمہ کرنا ہے اور جس میں ترجمہ کرنا ہے ہر لفظ کی ایک تاریخ ہوتی ہے اس کا املا، تلفظ، محلِ استعمال اور معانی و تلازمات بدلتے

رہتے ہیں اس لئے ان تمام تبدیلیوں کا رمز شناس ہونا ضروری ہے۔ چونکہ ابلاغ کا عمل زبان شناسی کے لحۂ اوّل سے شروع ہوتا ہے اس لئے اصل فن پارے کی زبان پر قدرت ہونی چاہیے اس کی گرامر، ساخت اور صوتیات سے واقفیت ہونی چاہیئے اس زبان کی نمایاں تکنیکوں، ہیئتوں اور اسالیب کا شعور ہونا بھی لازمی ہے۔ مترجم کے لئے اس طرح کے تمام اسرار و رموز سے واقفیت ضروری ہے۔ جن کا تعلق زبان اور علم سے ہوتا ہے چوتھی ضرورت مترجم کے ذہنی افق کا وسیع ہونا ہے۔ مترجم کے لئے ضروری ہے کہ وہ جس کتاب کا ترجمہ کرنا چاہتا ہے اس کے موضوع پر مادی ہو اور موضوع سے متعلق ثانوی چیزوں کا علم رکھتا ہو ان ضرورتوں کو پورا کئے بغیر مترجم کے ذہن میں مصنّف کے اصل خیال کا مکمل ابلاغ نہیں ہو سکتا۔

ہمارے ابتدائی مترجموں نے ان ضرورتوں کا پوری طرح لحاظ نہیں کیا اس لئے ان کے اکثر منظوم ترجمے بے روح اور اصل سے دور ہیں۔ ان میں مصنّف کے بنیادی خیال نے شعری پیکر اختیار نہیں کیا بلکہ وہ جداگانہ نظمیں معلوم ہوتی ہیں۔ محمد حسین آزاد، حالی، اسماعیل میرٹھی، اکبر الہ آبادی، ونا تریہ کیفی اور دوسرے بہت سے شاعروں کے منظوم ترجمے ناقص یا نامکمل ابلاغ ہونے کی وجہ سے مکمل ترجمہ نہیں ہیں۔ نظم طباطبائی کی "گور غریباں" گرے کی "ایلجی ان دی چرچ یارڈ" کا بہترین ترجمہ مانا جاتا ہے۔ مگر اس کے بعض بند ابلاغ کے نامکمل رہنے کی وجہ سے گرے کے بنیادی مفہوم سے بہت دور ہو گئے ہیں مثلاً مندرجہ ذیل بند دیکھئے۔

بہت سے گوہر شہوار باقی رہ گئے ہوں گے

کم جیکی خوبیاں سب مٹ گئیں تہ میں سمندر کی
ہزاروں پھول دشت و در میں ایسے بھی کھلے ہونگے
کہ جن کے مسکرانے میں ہے خوشبو مشک و عنبر کی

اب گرے کے مذکورہ بند کا نثری ترجمہ بھی پڑھئے۔

بہت سے گہرہائے تابدار تاریک اور بیکراں سمندر کی تہوں (غاروں) میں پوشیدہ ہیں۔ بہت سے ایسے پھول کھلتے ہیں جن کی رعنائی کو کوئی نہیں پاتا اور وہ ریگستانی ہواؤں میں اپنا رنگ و بو (مٹھاس) کھو دیتے ہیں۔

نظم کے منظوم ترجمے میں "گوہر شہوار" باقی ہیں کہہ کر گرے کے خیال سے انحراف کیا گیا ہے۔ گرے انھیں سمندر کی تہ میں پوشیدہ خیال کرتا ہے مگر نظم نے گرے کے آخری دو مصرعوں کا ترجمہ بالکل مختلف کر دیا ہے۔ یہاں نظم کو گرے کے بند کا صحیح اور بھرپور ابلاغ نہیں ہوا ہے۔ گرے ایسے پھولوں پر اظہار افسوس کرتا ہے جنہیں کوئی نہیں دیکھ پایا اور جن کا رنگ و بو ریگستانی ہواؤں میں ضائع ہو گیا۔ مگر نظم دشت

ھ ماہنامہ دلگداز لکھنؤ مئی ۱۹۰۸ء

٭ اصل استنزا اس طرح ہے:

Full many a gem of Purest ray serene
The dark unfothoni'd Caves of ocean bear
Full many a flower is born to blash unseen
And waste its sweetness on the desert-air

ور کے ایسے پھولوں کا ذکر کرتے ہیں جن کے مسکرانے سے مشک و عنبر کی خوشبو پھیلتی ہے۔ گرے کا لہجہ حزنیہ ہے اور نظم کا طربیہ۔ گرے نے اس بند میں المیہ اور یاس انگیز فضا کی تخلیق کی ہے جب کہ نظم نے نشاطیہ اور کیف افزا ذہنی کیفیت کا اظہار کیا ہے۔

ابلاغ کا نقطۂ عروج وہ منزل ہے جہاں قاری کے ذہن پر ایک سے زیادہ معانی کا انکشاف ہوتا ہے اور اس کو ایک شعر میں بہت سے جلوہ ہائے معانی نظر آتے ہیں۔ مثلاً غالب کے بہت سے شعر معانی کے اعتبار سے ایک سے زیادہ امکانات کے حامل ہیں۔ یہ امکانات کبھی ایک ہی مفہوم کے مختلف پہلو ہوتے ہیں اور کبھی ایک دوسرے سے متضاد ہوتے ہیں۔ معانی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنا مترجم کا نہیں تشریح نگار کا کام ہے۔ ایسے موقعوں پر مترجم ہجوم معانی سے ایک کا انتخاب کر کے دوسرے معانی کو چھوڑ دیتا ہے۔ انتخاب و اجتناب کا یہ عمل ایک شعوری عمل اور مصنف کے فلسفۂ زندگی، اندازِ نگارش، موضوع کی مناسبت اور عبارت کے سیاق و سباق کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ مفہوم کے انتخاب کی کامیابی کا معیار یہ ہے کہ وہ کل مفہوم کے ایک جز کی حیثیت سے کل سے کتنا قریب ہے یعنی وہ منتخب مفہوم کل کا لازمی، منطقی اور فطری حصہ ہے یا نہیں۔ دراصل انتخابِ مفہوم کا مسئلہ کلیتہً مترجم پر منحصر ہے کہ وہ آئینہ کس رخ سے پکڑتا اور شاہدِ معنی کا کون سا جلوہ دیکھتا ہے۔ اس اصول کی روشنی میں جب پیکر نگاروں، علامت پسندوں اور داخلیت کے علمبرداروں کی تخلیقات کے تراجم پر تنقیدی نظر ڈالی جاتی ہے تو بعض تراجم میں اصل کی رمق بھی نظر نہیں آتی ہے۔

Scanned with CamScanner

مترجم کے لئے ابلاغ کے مسائل اس وقت زیادہ پریشان کن ہوتے ہیں۔ جب وہ مصنف کے کسی نازک اور نادر خیال، نیم محسوس حقیقت، خالی خیال آرائی، ذاتی اور اچھوتے تجربے، دوررس افکار اور وجدانی کیفیتوں کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بعض اوقات شاعری میں ایسے نازک مقام آجاتے ہیں جہاں اصل خیال سطور میں نہیں بلکہ بین السطور یا ماورائے سطور ہوتا ہے کبھی کبھی الفاظ محض ایسے پلیٹ فارم کا کام کرتے ہیں جہاں سے معانی کی ایک ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے۔ شعری ترجموں کی انھیں دقتوں کے پیش نظر انگریزی کے شاعروں نے کہا تھا کہ شاعری کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا اور اس دور کے نا اہل مترجمین کے ناقص ترجموں نے معترضین کی رائے پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔ ایذرا پاونڈ (EZRA POUND) نے شاعری کو ترجمہ کرنے کے نقطۂ نظر سے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) فونا پوئیا (PHONA POEIA)

(۲) میلو پوئیا (MELO POEIA)

(۳) لوگو پوئیا (LOGO POEIA)

فونا پوئیا ایسی شاعری ہے جس کا ترجمہ کیا جا سکتا ہے، میلو پوئیا ایسی شاعری ہے جس کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔ لوگو پوئیا ایسی شاعری ہے جس کا من و عن ترجمہ تو نہیں کیا جا سکتا لیکن شاعر کے اصل خیال کی جھلک ترجمے میں آسکتی ہے۔ اس لئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ترجمے کا سنگ بنیاد "ابلاغِ مفہوم" ہے اور اسی پر ترجمہ کی خوبی کا انحصار ہے۔

ابلاغ کے بعد ترسیل (Communication) کی منزل آتی ہے۔ ترسیل کا لمحۂ اول وہ لمحہ ہے جب مترجم اصل فن پارے کے مفہوم کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کے لئے قلم اٹھاتا ہے اور آخری لمحہ وہ لمحہ ہے جب وہ اپنی نئی مگر پرانی تخلیق کو حتمی طور پر پڑھنے والوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس طرح ترسیل وہ عمل ہے جس میں مترجم مصنّف کی مجرّد آگہی یا فن پارے کے اصل مفہوم کو قابلِ فہم علامتوں یعنی ترجمے کی زبان کے ذریعے قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ عمل گذشتہ دونوں منزلوں سے زیادہ پیچیدہ اور دقّت طلب ہے۔ ترجمے کے عام قارئین کو اس سے دلچسپی نہیں ہوتی کہ اصل تصنیف میں کیا تھا یا اس کا اندازِ بیان کیا تھا۔ وہ ترجمے کو اصل کے نعم البدل کی حیثیت سے پڑھتے ہیں۔ اس میں جو کچھ ہوتا ہے وہی ان کے لئے سب کچھ ہوتا ہے۔

ترسیل کے عمل کے دو مدارج ہیں۔ پہلا وہ ہے جہاں ذہن کے آئینہ خانہ میں لفظ اور خیال ایک دوسرے میں تحلیل ہوتے ہیں۔ یہ الفاظ دیگر مترجم کی مجرّد آگہی الفاظ کا مرئی پیکر اختیار کرتی ہے۔ ترسیل کا عمل مجرّد سے غیر مجرّد کی طرف ہوتا ہے۔ اس لئے ترسیل کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ مترجم نے شاعر کی آگہی کو (جو ابلاغ ہونے پر اس کے ذہن کا لازمی حصہ ہوتی ہے) کس حد تک ترجمے کی زبان میں سمویا ہے۔ دوسری منزل وہ ہے جب مترجم مصنّف یا شاعر کی مجرّد آگہی کو ایک نئی زبان میں قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ منزل مترجم کی تخلیقی اور فنی صلاحیت کی آزمائش کی منزل ہے۔ اس منزل سے آسانی سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ مترجم کے پاس کافی ذخیرۂ الفاظ ہو، وہ مترادفات کے مہین اور

نازک امتیازات سے واقف ہو' الفاظ کے لغوی، مجازی اور تخلیقی استعمال سے آگاہ ہو۔ اگر موقع کی مناسبت سے لغت میں کوئی لفظ موجود نہ ہو تو وہ نیا لفظ بنانے کی صلاحیت رکھتا ہو حسبِ موقع نئے استعاروں اور پیکروں کی تخلیق کرسکتا ہو۔ اور انھیں فنکارانہ طور پر برتنے کا فن بھی جانتا ہو۔ چونکہ خیال کو الفاظ کا جامہ پہنانے کا عمل فنّی، ادبی اور تخلیقی نوعیت کا ہے اس لئے دوسری زبانوں سے اردو میں منظوم ترجمہ کرتے وقت علم بدیع وبیان پر نظر رکھنا ضروری ہے' اور عروض وقوافی، معائب ومحاسن سخن اور شعری اسالیب کا عرفان بھی ضروری ہے۔

ترسیل کے عمل پر ترجمے کے بہت سے طریقۂ کار منحصر ہیں۔ مثلاً (۱) کسی فن پارے کا لفظی ترجمہ (۲) خارجی یا داخلی خصوصیات کا ترجمہ۔

(۳) فن پارے کی تلخیص یا تشریح (۴) مصنّف کے بنیادی خیال کا اپنی زبان میں اظہار۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے طریقۂ کار ہو سکتے ہیں۔ لفظی ترجمے میں لغت کی مدد سے لفظوں یا جملوں اور اقتباسوں کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ یہ صورت حال نثر میں تو کسی حد تک گوارا ہو سکتی ہے۔ مگر نظموں کے منظوم تراجم میں ناکام ہو جاتی ہے۔ شاعری میں الفاظ، استعارات، پیکروں اور علامتوں کے مجازی اور تخلیقی معانی ہوتے ہیں' اس لئے محض لغوی معانی لکھنے سے شاعر کے اصل خیال کی عکاسی نہیں ہو سکتی لفظی ترجموں کی دو صورتیں ہیں:

(الف) لغت کی مدد سے لفظ کا ترجمہ لفظ کی صورت میں کیا جاتا ہے یہ تیکنک بہت ناقص ہے اس میں ترجمہ غیر دلکش، اکھڑا اکھڑا اور اصل سے دور ہوتا ہے۔

(ب) دوسری یہ کہ لغت کی مدد سے سامنے کا مفہوم قلم بند کر دیا جاتا ہے۔
عظمت اللہ خاں نے ورڈسورتھ کی نظم دی ککو (The Cuokoo) کا ترجمہ "کوئل" کے عنوان سے کیا ہے۔ اس کا پہلا بند یہ ہے

خوشا مست آواز والے پرندے — تری کوک خوشیوں کا اک راز ہے
پرندہ کہوں یا تو بچپن کی میرے — بھٹکتی ہوئی سی اک آواز ہے ؂*

عظمت اللہ خاں نے اس ترجمے میں الفاظ کی کفایت کے اصول کو مدنظر رکھا ہے اور انگریزی کے چار مصرعوں کا ترجمہ اردو کے چار مصرعوں میں کیا ہے۔ یہ محتاط لفظی ترجمے کی اچھی مثال ہے۔ البتہ عظمت اللہ خاں نے ترجمے میں "بچپن کی میرے" الفاظ کا اضافہ کر کے ورڈسورتھ کے خیال کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ تخلیق کا ابہام ترجمے میں وضاحت بن کر ترجمے کا تخلیقی حسن کم کر دیتا ہے۔ زیرِ نظر ترجمہ بھی اسی وضاحتِ خیال کا شکار ہے۔
بعض مترجم کسی فن پارے کی خصوصیات یعنی الفاظ کی موسیقی، لب و لہجہ

؂ عظمت خاں "سُریلے بول" حیدرآباد ۱۹۴۰، ص ۱۴۸

* ووڈزورتھ کی نظم کا ابتدائی بند یہ ہے:

O BLITH new Comer, I have heard,
I have Thee and rejoice,
O Cuckoo shall I call Thee Bird
Or but a wondering voice?

کے زیر و بم، بحر و وزن کی نغمگی کے ترجمے میں منتقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اوّل تو کسی فن پارے کی خارجی خصوصیات کی دوسرے فن میں منتقلی کو ترجمہ نہیں کہتے۔ دوسرے ایک زبان کی خارجی خصوصیات کو دوسری زبان اور فن میں منتقل بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ترجمے میں مصنّف کے بنیادی خیال کی ترسیل ہی مقصود بالذات ہوتی ہے۔ خارجی خصوصیات کی منتقلی کی ناکامی کی نمایاں مثال اردو کی آزاد نظم ہے۔ انگریزی میں "فری ورس" لکھنے والوں نے اوزان و بحور کو خیرباد کہہ کر آہنگ کا سہارا لیا تھا۔ اردو میں انگریزی آہنگ کا نعم البدل موجود نہیں ہے۔ مجبوراً اردو شاعروں نے آزاد نظم میں مروجہ اوزان و بحور ہی کا سہارا لیا ہے۔ اگرچہ انھوں نے ایک نظم کے مختلف مصرعوں میں ایک ہی بحر کے مختلف ارکان کو برتا مگر مکمل طور پر عروضی آہنگ سے نجات حاصل نہیں کی۔ یہی حال اردو میں معرّیٰ نظم کا ہے انگریزی "بلینک ورس" ایک بحر یعنی آئمبک پنٹامیٹر میں لکھی جاتی ہے مگر اردو میں اس کے لئے کوئی بحر مخصوص نہیں ہے اس کی دوسری روشن مثال جاپانی شاعری کا اردو ترجمہ ہے۔ جاپانی زبان کی ساخت اردو زبان کی ساخت سے مختلف ہے، اس کی اصناف اور شعری ہیئتوں کا ایک مخصوص عروضی تنظیم ہے۔ جاپانی شاعری میں رکن یا دہ تصور نہیں جو اردو یا انگریزی میں ہے۔ اس لئے جنھوں نے جاپانی شاعری کا جاپانی ہیئتوں کی خارجی خصوصیات کے ساتھ اردو میں ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے انھیں ناکامی ہوئی۔ منصور احمد کا خیال ہے کہ:۔

"ہیکو نظموں کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ حسین اجمال کی تفصیل اسے حسن سے معرّیٰ کر دیتی ہے۔ ہیکو نظم گھاس کی پتی کے ساتھ لٹکتا ہوا شبنم

کا وہ قطرہ ہے جو مختلف اطراف سے دیکھنے پر کبھی نیلا کبھی سرخ اور کبھی ارغوانی شعاعیں پیدا کرتا ہے۔[9]"

منصور احمد نے ہائیکو کی دشواری کا ذکر کیا ہے وہ محض ہائیکو کی بلاغت ......

...... کی وجہ سے ہی نہیں ہے بلکہ اس کی عروض، ساخت اور خارجی خصوصیات کی وجہ سے بھی ہے جو اردو میں منتقل نہیں کی جا سکتیں۔ ہائیکو تین مصرع کی ایک مختصر مگر بلیغ نظم ہوتی ہے جس کے پہلے اور تیسرے مصرع میں ۵۔ ۵ اور دوسرے میں ۷ رکن ہوتے ہیں اردو میں ہائیکو کے تمام ترجموں میں اس کی خارجی خصوصیات کی منتقلی کی ناکامی کا احساس ہوتا ہے۔ فضل حق نے جاپانی ہائیکو کے چند نثری ترجمے دیئے ہیں۔ مثلاً

" چاول کے ایک پودے کی بال
جھک گئی تو جھ سے کیونکہ
ایک کوڑا اس پر آبیٹھا "[10]

اس ترجمے میں خارجی خصوصیات تو کجا بعض دوسری خصوصیات بھی موجود نہیں ہیں اس ترجمے میں نظم کے پس منظر کے طور پر موسم، منظر اور فطرت نہیں ہے کوئی ایک مخصوص لفظ بھی نہیں ہے جب کہ ہائیکو میں یہ تمام چیزیں ضروری ہیں۔

داخلی خصوصیات میں مصنّف کا اسلوب اور اس فن پارے کی داخلی منطق تنظیم شامل ہے۔ ترجمے میں اس اسلوب یا داخلی منطق کی تلاش اور ترسیل بھی کارِ لاحاصل ہے اگر مترجم ان خصوصیات سے مرعوب ہو جائے تو مترجم کے ذہن کے گرد مرعوبیت کا ایک ایسا ہالہ بن جاتا ہے جو مصنّف کے مرکزی خیال

---

[9] ماہنامہ ساقی، دہلی، جاپان نمبر جنوری ۱۹۳۶ء ص ۲۵

[10] ماہنامہ ساقی، دہلی جاپان نمبر جنوری ۱۹۳۶ء ص ۲۶

کی روشنی کو ذہن میں داخل ہونے سے روکتا ہے

ہر مصنّف یا شاعر کا اسلوب اس کے اپنے تخلیقی تجربے سے وابستہ ہوتا ہے۔ اس لئے ایک زبان کے فن پارے کے اسلوب کو دوسری زبان کے ترجمے میں منتقل کرنا ناممکن ہے۔ یہی حال فن پارے کی داخلی تنظیم کا ہے۔ جو تخلیقی تجربے سے ابھر کر فن کی شریانوں میں لہو کی طرح دوڑتی ہے۔ ترجمے میں اس داخلی منطقی تنظیم کو بھی سمویا نہیں جا سکتا۔ اس طرح ایک فن پارے کی داخلی اور خارجی خصوصیات کا ترجمہ محال ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ بالفرض اگر کسی طرح خارجی خصوصیات کو دوسری زبان میں منتقل کر بھی دیا جائے تو اس کو ترجمہ نہیں کہہ سکتے۔

کبھی کبھی کسی فن پارے کی تلخیص یا تشریح کو بھی ترجمہ کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کی اپنی افادیت ہے مگر تلخیص یا تشریح بھی ترجمہ نہیں ہے۔ تلخیص و تشریح میں حذف و اضافہ کا عمل ہوتا ہے جو الفاظ اور معانی دونوں سطحوں پر ہوتا ہے ترجمے کے لئے یہ عمل غیر ضروری ہے۔ البتہ ترجمہ کرنے میں حذف و اضافہ سے اس وقت کام لیا جا سکتا ہے جب مصنّف ژولیدہ بیانی، اطناب یا ابہام کا شکار ہو۔ تلخیص کرنے میں مفہوم کی بعض کڑیاں غائب ہو جاتی ہیں جس سے بے ربطی اور ابہام پیدا ہونے کے علاوہ مصنّف کے متن اور خیال میں خیانت ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں قاری تک مصنّف یا شاعر کا کل مفہوم نہیں پہنچتا۔ اس کے برعکس تشریح میں غیر ضروری چیزیں شامل ہو جاتی ہیں جو مصنّف یا شاعر کے اصل جذبہ یا خیال میں غیر ضروری چیزوں کو ملا دیتی ہے اور قارئین کی توجہ اصل بات سے ہٹا کر فروعات میں الجھا دیتی ہے۔ شعری تراجم میں حذف و اضافہ کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں جو کبھی

ابلاغ کی کمی، کبھی بدنیتی اور کبھی محض تن آسانی سے رونما ہوتے ہیں۔ ابتدائی شعری تراجم میں حذف و اضافہ کی اکثر مثالیں ملتی ہیں۔ یہ صورتِ حال بعض ایسے تراجم میں بھی نظر آتی ہے جنھیں نقادوں نے اعلیٰ درجہ کا ترجمہ تسلیم کیا ہے۔ نادر کاکوروی نے مور کی نظم "دی لائٹ آف دی ڈیز" کا ترجمہ گذرے زمانے کی یاد کے عنوان سے کیا ہے۔ اس ترجمے کے بارے میں ممتاز حسن لکھتے ہیں کہ

"گذرے زمانے کی یاد" نہ صرف نادر کا بہترین ترجمہ ہے بلکہ اسے اردو شاعری کا بہترین ترجمہ کہنا چاہیے۔ اس کی ادبی اہمیت اصل اور ترجمے کو ساتھ ساتھ دیکھنے سے ہی واضح ہو سکتی ہے۔"[۱]

اب ممتاز حسن کے مشورہ کے مطابق اصل کو اور ترجمے کو ساتھ ساتھ پڑھئے:

اکثر شبِ تنہائی میں ۔۔۔ کچھ دیر پہلے نیند سے
گذری ہوئی دلچسپیاں ۔۔۔ بیتے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمعِ زندگی ۔۔۔ اور ڈالتے ہیں روشنی
میرے دلِ صد چاک پر

وہ بچپن اور وہ سادگی ۔۔۔ وہ رونا، وہ ہنسنا کبھی
پھر وہ جوانی کے مزے ۔۔۔ وہ دل لگی، وہ قہقہے!
وہ عشق، وہ عہدِ وفا ۔۔۔ وہ وعدہ اور وہ شکریا
وہ لذتِ بزمِ طرب ۔۔۔ یاد آتی ہے ایک ایک سب
دل کا کنول جب روز و شب ۔۔۔ رہتا شگفتہ تھا سو اب

۱۔ ممتاز حسن (مرتبہ) جذباتِ نادر (حصہ اول) دوم، کراچی، ۱۹۶۶ء، ص ۶

اس کا یہ ابتر حال ہے ایک سبزۂ پامال ہے
اک پھول کملایا ہوا سوکھا ہوا بکھرا ہوا
روندا پڑا ہے خاک پر ۱۹۱۰ء[۱۲]

۱۲۔ تاجور نجیب آبادی (مرتب) تصویرِ جذبات، لاہور سنہ ۱۹۶۳ء ص ۱۳

* مور کی نظم حسب ذیل ہے۔

THE LIGHT OF THE OTHER DAYS

Oft, in the stilly night,
Ere siumber's chain has bound me,
Fond Memory brings the hght,
Of othar days around me:

The smiles, The tears
of boyhood's years

The words of love Then spoken,
The eyes that shone
Now dimm'd and gone,
The Cheerful hearts now broken!
Thus, in the stilly night
Ere siumber's chain has bound me,
of other days around me

نادرؔ کاکوروی کے منظوم ترجمے کے بعد مورؔ کی انگریزی نظم کا نثری ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:

خاموش رات میں
اس سے پہلے کہ نیند اپنی باہیں میری گردن میں حمائل کر دے
میری پسندیدہ یادداشت
ماضی کے ان دنوں کی یاد تازہ کرتی ہے جو میرے چاروں طرف پھیلے ہوتے ہیں
مسکراہٹیں اور آنسو
بچپن کے ایام
پیار بھری باتیں جو زیر لب دہرائی گئی ہیں
اور وہ آنکھیں جن میں چمک تھی
اور جو اب ماند ہیں اور بجھ چکی ہیں
اور حسرت سے لبریز دل جو اب ٹوٹ چکا ہے
اس طرح اس رات کی خاموشی میں (ایک ایک کر کے یاد آتی ہے)
اس سے پہلے کہ نیند اپنی باہیں میری گردن میں حمائل کر دے
میرا ماضی مجھے محصور کر چکا ہے

مورؔ کی نظم کا اصل ٹکڑا، نادرؔ کا منظوم ترجمہ اور نثری ترجمہ، پڑھ کر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نادرؔ نے ۱۳ مصرعوں کا ترجمہ ۲۲ مصرعوں میں کیا ہے۔ جن میں تین مصرع:

بیتے ہوئے دن عیش کے

بنتے ہیں شمعِ زندگی

میرے دلِ صد چاک پر

اضافہ ہیں۔ یہ تینوں بحر کی پابندی اور رعائت لفظی کی وجہ سے شامل ہوگئے
اسی طرح باقی ترجمے میں بھی بھرتی کے مصرعے شامل ہیں۔ جن میں:

پھر وہ جوانی کے مزے

وہ لذّتِ بزمِ طرب

اک پھول کملایا ہوا

سوکھا ہوا بکھرا ہوا

روندا پڑا ہے خاک پر!

حشو ہیں۔ چونکہ شاعری تاثرات کا اظہار ہے اس لئے ترجمے میں بھی اسی اصول کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ نادر کاکوروی کا یہ ترجمہ جس کو ممتاز حسن نے اردو کا بہترین ترجمہ کہا ہے ایک طرف اعلیٰ شعری محاسن سے محروم ہے۔ اور دوسری طرف اطناب اور اضافہ الفاظ وخیال کا شکار ہے

اعلیٰ ترجمے وہ ہیں جو شاعر کے خیال یا جذبے کو من وعن پیش کرتے ہیں اس میں علامتوں، استعاروں اور پیکروں کے نظام کو خاص اہمیت دی جاتی ہے ترجمے کو حذف واضافہ سے پاک رکھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بلیغ اشاروں، حکیمانہ نقطوں، فلسفیانہ خیالات، جذبے کی رو اور تاثر کو پوری شادابی اور شدت کے ساتھ ترجمے میں سمویا جاتا ہے۔ اس میں بنیادی خیال، جذبہ یا فکر کے ساتھ زبان، تکنیک اور اسلوب پر بھی توجہ دی جاتی ہے گویا ترجمے میں فن کے خارجی اور داخلی

عناصر کا خوبصورت امتزاج ہوتا ہے۔ اس طرح کا ایک کامیاب ترجمہ عظمت اللہ خاں کا "ننھا غاصب" ہے جو میریڈتھ (Meridith) کی نظم دی ینگ یزرپر (The young usurper) کا منظوم ترجمہ ہے۔ ترجمہ نیچے نقل کیا جاتا ہے۔

ننھّا غاصب

مرے گھر کی دیوی کے بالائے سینہ کھلا ہے محبت کا تازہ کنول
درخشندہ جیسے سرِ شام زہرہ افق پر سمندر کے آئے نکل!
وہ ہاتھوں پہ اپنے کھلاتی ہے اسکو وہ پیروں پہ اپنے جھلاتی ہے اسکو
وہ رکھتی ہے آنکھوں میں پتلی بنا کے وہ سوتے میں روتا جو اٹھ بیٹھتا ہے
تو بوسوں نے موتی سے آنسو وہ پونچھے وہ سو جان سے ہر ادا پر فدا ہے
وہ ہے لال دونوں جہاں جس پہ صدقے یہ ننھی سی جان اور غاصب کے دعوے
مرا تخت زریں ہے تیرے حوالے ترے دست و بازو فرشتوں کے دستے
تو ہے وہ زبردست جیتے پہ بیٹھے[۱۲]

---

[۱۳] عظمت اللہ خاں، سریلے بول، حیدرآباد، ۱۹۴۰، ص ۱۱۰

[۱۴] اصل نظم یہ ہے:

The young usurper
On my darling's bosom,

(بقیہ نظم اگلے صفحہ کے حاشیہ پر دیکھیے)

اس ترجمے میں اصل کی روح جلوہ گر ہے۔ حذف واضافے کا اثر کم سے کم ہے
اس میں لفظی اور معنوی ترجمے کی بعض خوبیوں کا امتزاج ہے

اس گفتگو سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ترسیل کے عمل پر ترجمے سے مختلف طریقہ ہائے کار کا دارومدار ہے۔ ہر قسم کے ترجمے کا الگ رنگ و آہنگ اور اپنی جداگانہ قدر و قیمت ہوتی ہے۔ مگر بہر طور معنوی ترجمے کو لفظی اور آزاد ترجمے پر فوقیت حاصل ہے۔

Fair as brilliant Hesper,
Against the brimming flood,
She handles him ;
She dandles him ;
She fondles him and eyes him,
And if upon a tear he wakes,
With many a kiss she dries him ;
She covet every move be makes,
And never enough can prize him
Ah the young usurper,
I yield my golden throne ;
Such angels bands attend his hands
To claim it for his own.

ترسیل کے عمل سے گذر کر مترجم قاری کے سامنے نئی مگر پرانی تخلیق پیش کرتا ہے اس لئے قاری اور نقاد سب سے پہلے اس کی زبان سے متعارف ہوتا ہے اس کے بعد تکنیک، اسلوب اور کُل ہیئت اس کے سامنے آتی ہے۔ نثر میں چونکہ زبان کا بنیادی مقصد ترسیل خیال ہے شاعری میں اس کا منصب اظہار جذبات وکیفیات ہے اس لئے ترجمے کی زبان قابل فہم ہونی چاہئے۔ اس میں ژولیدہ بیانی اطناب، تنافر حروف، تکرار اور غرابت نہیں ہونی چاہئے اور اس زبان سے قاری کو وہی ابلاغ ہونا چاہئے جو مصنف یا شاعر کا اصل منشا، مقصد، خیال یا تاثر تھا۔ تکنیک اور اسلوب بھی ابلاغ اور ترسیل کے دوران ذہنی عمل سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ترجمے میں تکنیک اور اسلوب کا کام آرائش نہیں بلکہ مرکزی خیال کی ترسیل یا اظہار ہے۔ مترجم کو جان بوجھ کر کوئی نئی تکنیک یا اچھوتا اسلوب اختیار کرنا چاہئے بلکہ ترجمہ کے عمل کے دوران، اس کے موضوع، مواد اور مزاج کی مناسبت سے ایسی تکنیک اور اسلوب اختیار کرنا چاہئے جو ہر طرح سے اس تصنیف کے بنیادی خیال یا تاثر کے اظہار میں مفید ثابت ہو یہی معاملہ ہیئت کا ہے۔ مترجم کو ہیئت بھی عجیب وغریب اختیار کرنی چاہئے بلکہ جو موضوع اور مواد کا تقاضہ ہو اس کے مطابق اختیار کرنی چاہئے یہ ضروری نہیں کہ انگریزی آزاد نظم کا ترجمہ مثنوی کی شکل میں کیا جائے بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ فری ورس کا ترجمہ آزاد نظم ہی میں ہو۔ اگر آزاد نظم میں ترجمہ کرنے سے نظم کا حسن قائم نہ رہتا ہو تو پھر کوئی ایسی ہیئت اختیار کرنی چاہئے جس میں اصل فن پارے کا حسن تاثر اور توانائی باقی رہے۔ اس طرح ترجمے میں وہ تمام خصوصیات ہونی چاہئیں، جن کی

توقع ہم ایک اعلیٰ تخلیق سے کرتے ہیں۔

ایک اعلیٰ درجے کا ترجمہ شاعر یا مصنف کے مرکزی خیال یا جذبے کا امین اور عکاس ہوتا ہے۔ اس کی زبان، تکنیک، اسلوب اور ہیئت موضوع و مواد کے مطابق ہوتا ہے ترجمے کی زبان نئی اور دلکش ہوتی ہے، نیز ادبی سرمائے میں اضافہ کرتی ہے۔ اس میں قارئین کی توجہ کا مرکز بننے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ منظوم ترجمے میں جمالیاتی کیفیت اور شعریت بھی ہوتی ہے۔ اس طرح ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترسیل خیال یا انتقالِ فکر کا سادہ عمل ہوتے ہوئے بھی بہت پیچیدہ اور محنت طلب عمل ہے۔ جس کے لئے تحقیقی دیانت، تنقیدی بصیرت اور تخلیقی صلاحیت کی ضرورت ہے مترجم اگر ان اوصاف سے محروم ہے اور وہ اپنے فرض کی ادائیگی سے قاصر رہتا ہے تو اٹلی کی ضرب المثال کے مصداق ایسا ٹرانسلیٹر (Translator) ٹریٹر (Traitor) ہوتا ہے۔

تھیوڈور سیوری

ترجمہ: آصفہ جمیل

آزاد اور لفظی ترجمہ

فن کار خواہ وہ کسی بھی فن سے متعلق ہو اپنے اتالیق یا نقاد کے بغیر ادھورا ہوتا ہے جو اسے ہمیشہ یہ بتانے کے لئے تیار رہتے ہیں کہ اس کو کیا کرنا چاہئے۔ یا اس نے کیسا کیا ہے۔؟

مترجموں کو ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ وہ ہدایت، نصیحت اصلاح اور نکتہ چینی میں تینوں طرح کے اشخاص سے استفادہ کرنے کیلئے تیار رہیں یعنی جو جانتے ہیں، جو نہیں جانتے اور جو غلط جانتے ہیں۔ لیکن یہ تینوں طرح کے اشخاص یہاں تک کہ موخرالذکر بھی (جن کی معلومات غلط ہیں) سب سے زیادہ خطرناک ہیں۔ اور اپنی آواز بغیر وثوق کے بلند کرتے رہتے ہیں بے شک اگر ان کے دلائل کی بنیاد کچھ روشن اصولوں پر ہو تو یہ اصول ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔ کیا یہ اصول الفاظ کی پیچیدگی اور ابہام کے باوجود واضح طور پر سمجھے جاسکتے ہیں اور ان کا کوئی جواز ہو سکتا ہے۔؟

اس سوال کا ایک جواب یہ ہے کہ ترجمے کے اصولوں کے بیان میں اختصار

ناممکن ہے اور توضیحی شکل اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے جتنی ہم سمجھتے ہیں لیکن یہ دشواری خود مترجموں کی تحریروں سے پیدا ہوئی ہے یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ ترجمہ کے کوئی عالمی اصول تسلیم نہیں کئے گئے ہیں کیونکہ ان اصولوں کی تشکیل کرنے والے حضرات خود آپس میں کبھی متفق نہیں ہو سکے اور ان کے خیالات میں بے انتہا مغائرت ہے، انھوں نے جو کچھ بھی ہمارے لئے چھوڑا ہے وہ منتشر خیالات کا ایک ایسا ابتذ مجموعہ ہے جس کی ہمیں ادب کے دوسرے شعبوں میں مثال نہیں ملتی۔ مترجموں کی کوششوں کا ماحصل مندرجہ ذیل نکات سے زیادہ واضح ہو جائے گا۔

۱۔ ترجمہ میں اصل متن کے الفاظ کا ترجمہ ہونا چاہئے۔

۲۔ ترجمہ اصل متن کے معانی ومفاہیم پر مشتمل ہونا چاہئے۔

۳۔ ترجمہ اصل تصنیف کی طرح پڑھا جانا چاہئے۔

۴۔ ترجمہ کو ترجمہ کی ہی طرح پڑھا جانا چاہئے۔

۵۔ ترجمہ میں اصل تصنیف کے اسلوب کی جھلک ہونی چاہئے۔

۶۔ ترجمہ کو مترجم کے منفرد اسلوب کا نمائندہ ہونا چاہئے۔

۷۔ ترجمہ اصل متن کے ہم عصر کی طرح پڑھا جانا چاہئے۔

۸۔ ترجمہ کو مترجم کے ہم عصر کی طرح پڑھا جانا چاہئے۔

۹۔ ترجمہ میں اصل تصنیف سے حذف واضافہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۰۔ ترجمہ میں اصل متن سے حذف واضافہ کبھی ممکن نہیں۔

۱۱۔ نظم کا ترجمہ نثر میں ہونا چاہئے۔

۱۲- نظم کا ترجمہ نظم میں ہونا چاہئے۔

دی گئی فہرست میں سب سے پہلے جو تبادلات ہیں ان کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ ان میں سے ایک لفظی یا دیانتدارانہ ترجمہ پر اصرار کرتا ہے اور دوسرا بامحاورہ یا آزاد ترجمہ پر۔ اس ترجمہ کی ہمیشہ حمایت کی گئی ہے جو امکانی حد تک لفظی ترجمہ کہلائے اور یہ حمایت اس خیال کی بنیاد پر کی گئی ہے کہ اصل کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وفاداری مترجم کا فرض ہے۔ کوئی مترجم عام مصنف سے کسی بھی طرح کی غیر دیانت داری کا الزام لینا اور اس سے بچنے کا خواہاں نہیں ہوتا لیکن پیشتر اس کے کہ وہ اس سے بچنے کی ضمانت حاصل کرے اس کے ذہن میں یہ بات واضح ہونی چاہئے کہ دیانت داری سے کیا مطلب ہے۔ اور یہ کن عناصر پر مشتمل ہے؟

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لفظی یا لفظ بہ لفظ ترجمہ، ترجمہ کا سب سے اولین طریقہ ہے بلکہ یہ خالص دنیاوی اور غیر ادبی کاموں کے لئے مناسب ہے اور اگر دیانت داری بھی اس معنی میں لی گئی ہو تو صرف یہی ناقابل اعتراض سچائی بچے گی کہ کسی زبان میں ہر لفظ کا بالکل صحیح مترادف تلاش نہیں کیا جا سکتا۔

دیانت داری کی حمایت کی ایک وجہ یہ ہے کہ مترجم یہ کبھی نہ بھولے کہ وہ ایک مترجم ہے وہ تسلیم کرے کہ وہ اصل مصنف نہیں ہے۔ اور وہ کام جو اس کے ہاتھ میں ہے اس کا اپنا نہیں ہے اس کی حیثیت ایک ترجمان کی ہے جس کا فرض قارئین اور مصنف کے درمیان ایک پل کا کام کرنا ہے۔ اس کو اپنی حیثیت بالکل فراموش کر دینا چاہئے اور وہ روم یا برلن کو لندن یا پیرس سے براہ راست

بدلنے کی اجازت دے۔ اگر وہ یہ محسوس کرے کہ اس نے ایسا کیا ہے تو اپنی فتوحات پر فخر کر سکتا ہے۔ ولیم کوپر نے ہومر کے ترجمہ کے سلسلہ میں کہا ہے کہ مجھے سب سے بڑا فخر اس کا ہے کہ میں اصل متن کے زیادہ سے زیادہ قریب رہا ہوں۔"

مگر مترجم جو یہ اصول قبول کرتا ہے بہت جلد ہی مشکلات میں گھر جاتا ہے جس کا اظہار ROSSETTI سے زیادہ بہتر اور موثر طریقے پر کسی نے نہیں کیا۔ "مترجم کا کام دادر یہ پوری عاجزی سے کہا گیا ہے۔) نفی ذات میں سے ایک ہے۔ اکثر وہ محاورے اور اپنے عہد کی خصوصیات سے کام لے گا اگر اس خواہش کا تعلق صرف اسی سے ہے تو اس کا اپنا احساسِ ترنم اس کی رہبری کرے گا اگر اصل مصنف کا اسلوب اور احساسِ ترنم اس کی راہ میں رکاوٹ نہ بنا تو ایسا ہو گا کہ کبھی تو موسیقی کے لئے مواد کی قربانی دے گا اور کبھی مواد کے لئے موسیقی کی۔ لیکن نہیں اسکو دونوں کے ساتھ برابری کا رویہ رکھنا پڑے گا۔ کبھی کبھی ایسا ہو گا کہ اصل تصنیف میں کوئی خامی یا کوتاہی اسے روکے گی، اور وہ بظاہر اپنے طور سے اسے دور کرنے کی کوشش کرے گا، اس طرح مصنف کے لئے وہ کام کرے گا جس سے اس کے عہد نے اسے محروم رکھا تھا۔ مگر نہیں ان سب کاموں کے لئے وہ مجبور نہیں ہے۔"

اس پیراگراف کے مطالعہ کے بعد کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ لفظی ترجمہ کو لیاقت کے ساتھ ترتیب دینا بہت مشکل کام ہے اور ہم کو آزادی کا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کرنا پڑے گا۔ اس لئے پوسٹ گیٹ کو یہ کہنے کی ترغیب ملی کہ "دیانتداری کے اصول ترجمہ کی افادی حیثیت اور "عام رضامندی سے

نہ کہ عالمی مشق و روایت کی رو سے وضع کئے گئے تھے۔"

اکثر لوگوں نے ترجمہ میں آزادی کی حمایت کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ مترجم نے خود کو اصل تک رسائی کی محنت سے بچا لیا ہے۔

اکثر ہم سے کہا جاتا ہے کہ ترجمہ میں اصل کتاب کی ضرورت کے مطابق ہم کوئی بھی بامحاورہ اظہار ترجمہ میں شامل کرنے کے مجاز ہیں۔

پہلی اور بنیادی ضرورت یہ ہے کہ وہ انگریزی میں ہونا چاہئے کہ وہ اصل کی طرح پڑھا جائے اور اصل مضمون کے تمام نقوش اس میں دکھائی دیں۔ ان سب ہدایات کا لب لباب یہ نکلتا ہے کہ ترجمہ ایسا ہونا چاہئے جو بہت آسانی اور دلچسپی کے ساتھ پڑھا جا سکے اور اگر ایسا نہیں ہے تو کبھی نہیں پڑھا جا سکے گا۔ ایسا نہ ہوتا تو شاید ترجمہ کبھی بھی نہیں کیا گیا ہوتا۔

یہ خطرات وہ ہیں جن کو مترجم خود مول لیتا ہے، ان کی حدود شاید ان الفاظ میں ظاہر ہو سکیں جو ہمارے کسی دوست کے مونہہ سے ہماری درخواست پر کسی دوسری زبان کے ایسے خط کا ترجمہ کرتے ہوئے جس کی عبارت صاف طور پر نہیں پڑھی جاتی نکلتے ہیں۔ وہ خاص انہماک کے ساتھ اپنی عقل مندی کا اظہار کرتے ہوئے اس خط پر نظر ڈالتا ہے اور کہتا ہے " دراصل میں اس خط کو پوری طرح نہیں پڑھ پا رہا ہوں لیکن اس کا مطلب کچھ ایسا نکلتا ہے ...."

میرا خیال ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کو اس طرح کا تجربہ ہوا ہوگا۔ اپنے اس دوست کے آزاد اور خاصے بے معنی و بے مصرف ترجمہ کی مدد لینے کے

لہ مصنف کتاب، انگریزی میں لکھنے کی بنا پر انگریزی کا ذکر کر رہا ہے۔

بجائے ہم یہ طریقہ اختیار کریں کہ ایک محدب شیشہ لے کر اس خط کے ایک ایک لفظ کا لغت کی مدد سے ترجمہ کر لیں۔

ایک آزاد اور قابل قبول ترجمہ کی خصوصیات کا محتاط جائزہ تین اہم نکات ہمارے سامنے لائے گا۔

۱۔ بہت مختصر اور راز عانی بیان کہ ایک ترجمہ اپنے متن کی طرح ہونا چاہیے۔ استدلال کی مدد سے اس بات کی حمایت کی جا سکتی ہے۔ متن کا ترجمہ متن کی طرح ہونا چاہیے یعنی اس نظریہ کا منطقی ماحصل یہ ہے کہ قاری یہ امتیاز نہ کر سکے یہ ترجمہ فرانسیسی یا یونانی سے، عربی یا روسی سے کس زبان سے کیا گیا ہے۔

۲۔ جب یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ مترجم اور اصل مصنف میں نمایاں فرق ہے تو مترجم کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ مصنف کا مقروض ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ ترجمہ اصل تصنیف کا نتیجہ ہے جو مترجم نے کیا ہے، اسی طرح اصل مصنف بھی مترجم کا مقروض ہے جو ایک قابل لحاظ حد تک اس ترجمہ کا مالک ہے۔ اس ملکیت کی بنا پر ہی مترجم کو اظہار و ادا میں ایک حد تک انحراف کی اجازت دی جا سکتی ہے مگر سوال صرف اس بات کا ہے کہ کس حد تک انحراف کی اجازت ہو۔ یہ مسئلہ مترجم کی خواہش کے مطابق حل نہیں کیا جا سکتا مگر اس کی زبان کی ماہیت وسعت، محاورے، اظہار اور ساخت مترجم کی زبان کے درست ہونے کی ایک مثال ترجمہ کو بنانے کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔

۳۔ یہ حقیقت کہ مصنف کے برخلاف مترجم ان بہت سے مترجموں میں سے ایک ہوتا ہے جو اس سے پہلے ترجمہ کا یہی کام کر چکے ہوتے ہیں۔ ایک مترجم

جو گوئٹے یا موپاساں کی تصانیف کا ترجمہ کر رہا ہے اور یہ جانتا ہے کہ وہ ان ترجموں کے سلسلے کی سب سے آخری کڑی ہے جنہوں نے ماضی میں ان مسائل کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کی جن کا اب وہ سامنا کر رہا ہے۔ اس سے کچھ نازک سوالات ایسے سامنے آتے ہیں کہ اگر اس نے ایک فقرہ تراشا ہے جس کے بارے میں اس کو یقین ہے کہ اس سے مصنّف کے مفہوم کا ہوبہو اظہار ہوتا ہے اور اگر پھر اس کو یہ معلوم ہو کہ اس کے پیش روؤں میں سے کسی نے پہلے ہی اس کا استعمال کیا ہے تو اس کو کیا کرنا چاہیئے؟ سند یافتہ لوگوں سے خیالات میں اختلاف ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ایسے بھی لوگ ہوئے ہیں جنہوں نے کہا کہ جو ترجمہ ایک دفعہ کر لیا گیا۔ آئندہ آنے والے اس کو مقابلتاً بہتر بنانے کوشش نہ کریں اور یہاں تک کہنے سے گریز نہیں کیا کہ ایک ایسا مقابلہ صرف اتفاقی مطابقت کو دور کرنے کے لئے ہونا چاہیئے۔ اگر یہ سختی سے لاگو کیا گیا تو بیوقوفی ہو گی۔ ورجل نے دوسری Aeneid کے شروع میں Conticuere Omnea لکھا جس کا کسی نے اس طرح ترجمہ کیا۔ 'All were hushed'

اور دوسرے نے اس طرح کیا All were silent پھر ایک نیا مترجم کیا یہ ترجمہ کرے "They all held their tounges"

"ان سب نے اپنے مونہہ سی لئے"

ایک زیادہ قابل قبول نقطۂ نظر جسے پوسٹ گیٹ نے پیش کیا جس کا خیال اس کے برعکس ہے کہ اگر ایک مترجم جس نے بہترین ترجمہ کیا ہے اسے معلوم ہو کہ اس کے کچھ فقرے اس سے پہلے دوسروں نے استعمال کئے ہیں تو اسے ان

کو تبدیل کرنے کا کوئی راستہ نہیں سوچنا چاہیئے ۔

ایک ترجمہ محاوراتی اظہار پر مشتمل ہو سکتا ہے جو کہ اس کی زبان سے مخصوص ہے اور جس کو کہ مترجم قبول کرنے کے لئے مناسب سمجھتا ہے مگر اس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ مصنّف کا اسلوب اپنا لیتا ہے جس کی کہ ایک قاری امید کرتا ہے ۔ اسلوب تحریر کے ہر ٹکڑے کا امتیازی وصف ہے مصنّف کی شخصیت کا ماحصل اور اس کے لمحاتی جذبات اور کچھ حد تک اس کی فطرت کو ظاہر کئے بغیر ایک پیراگراف بھی یکجا نہیں کیا جا سکتا ہے ۔ مگر جو مصنّف کے لئے حقیقت ہے وہی مترجم کے لئے بھی ہے ۔ مصنّف کا اسلوب خواہ فطری ہو یا اکتسابی الفاظ کا انتخاب وہ خود کرتا ہے اور جیسا کہ دیکھا گیا ہے کہ مترجم اکثر متبادل الفاظ کے درمیان انتخاب کیلئے مجبور ہوتا ہے ۔ اور اپنے انتخاب کے عمل میں وہ اپنی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ وہ اس کا اپنا اسلوب نہیں مگر اس کا دھندلا سا عکس ہو سکتا ہے ۔

لفظی ترجمہ کو ترجیح دینے کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس سے مصنّف کے اسلوب کے نزدیک تر آنے کا زیادہ امکان ہے۔ اس کو اور بھی درست ہونا چاہیئے ۔ اور کوئی نقل چاہے تصویر یا نظم کی ہو اس کی صحت سے جانچنا زیادہ موزوں ہے تاہم یہ حقیقت ہے کہ تصنیف کے اثر کو دوبارہ پیدا کرنے کی کوشش میں بہت زیادہ لفظی ترجمہ ایک غلطی ہے ۔ اس کے تاثرات دوسری زبان میں منتقل کرنے کے لئے مصنّف کے جملوں کی ساخت کو بدلنا ضروری ہو سکتا ہے جیسے کہ ڈاکٹر ای ۔ وی ۔ ایو Odyssey کے اپنے ترجمہ کا تعارف کراتے ہوئے

کہتا ہے " دوسرے تمام بڑے ادیبوں کی طرح ہومر کی تصانیف میں بھی مواد اور اسلوب ایک دوسرے میں جذب ہو گئے ہیں۔ اور اگر ہم ہومر کی تصانیف کو بجنسہ منتقل کریں۔ تو معنی اور اسلوب دونوں سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔"

یہ ناقابل انکار حقیقت اس بات کی حمایت کرتی ہے کہ باقاعدہ صحیح اور لفظی ترجمہ کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ بہترین ترجمہ کی مثال جو مترجم اپنے سامنے رکھ سکتا ہے رشی اور مور نے اتنے اچھے طریقے سے بیان کی ہے کہ ان کے الفاظ کا اقتباس دینا ہی مناسب ہے۔ " فرض کرو ہم رسکن کے ایک خاص صفحے کا دیانت دارانہ ترجمہ کرنے میں کامیاب ہو گئے اور ہم اسے دو فرانسیسی تعلیمیافتہ دوستوں کو تنقید کے لئے پیش کرتے ہیں ان میں سے ایک انگریزی کم جانتا ہے جب کہ دوسرے کی ہماری زبان کے بارے میں اچھی خاصی معلومات ہیں اگر پہلے نے یہ کہا ہو "کتنا پیارا انداز بیان ہے۔ اس کا مصنف کون ہے؟" دوسرا جواب دے " یقیناً رسکن ہے۔ اگرچہ مجھے اس کا اصل اقتباس یاد نہیں ہے۔" تب ہم یقین کر سکتے ہیں کہ اسلوب کے اعتبار سے ہمارا ترجمہ مثالی ترجمہ سے دور نہیں رہا ہے۔ ہمیں با محاورہ فرانسیسی زبان ہی لکھنا چاہیے اور کوشش یہ ہو کہ اسمیں اصل کا لطف برقرار رہے۔

اسلوب مصنف کی شخصیت اور تاریخ کے اس عہد سے جس میں وہ رہتا ہے دونوں سے متاثر ہوتا ہے۔ ترجمہ جس طرح زمانی خلا کو پر کرتا ہے اسی طرح مکانی خلا کو بھی۔ چاسر کے بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے انگریزی میں لکھا تھا مگر اس کے باوجود کافی قارئین "کینٹربری ٹیلس" کو ناقابل فہم

پاتے ہیں اور اس کے ترجمہ کو اپنے زمانے کی انگریزی میں پڑھ کر زیادہ لطف اندوز
ہوتے ہیں۔ چوسر کے بعد Archbishop Cranmer نے عام دعاؤں کی
کتاب اس وقت تک لکھی گئی۔ انگریزی کتابوں میں سب سے دلکش انگریزی میں
لکھی ہے اس کے باوجود آج ایسے پادری بہت ہیں جو یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ اس
کے الفاظ بتدیل کر دیں۔ جہاں تک عام ترجمہ کا تعلق ہے اس مسئلہ کو اس طرح
پیش کیا جا سکتا ہے۔ سروانٹس نے Don Quixote ۱۶۰۵ میں
شائع کی۔ کیا اس کہانی کا ترجمہ اس کی ہم عصر انگریزی زبان میں ہونا چاہئے
یعنی وہ زبان کہ اگر وہ انگریز ہوتا تو اس میں تصنیف کرتا۔ یا آج کی انگریزی
میں؟ اصولی طور پر اس کے جواب میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ اور اکثر حالتوں میں
قاری ایک ایسی زبان میں ترجمہ کی توقع کرنے میں حق بجانب ہے جس کا وہ عادی
ہے۔ اگر ترجمہ کا کام اپنے قارئین کے ذہنوں میں وہی احساسات پیدا کرنا ہیں۔ جو
اصل کو پڑھ کر اولین قارئین کے ذہنوں میں پیدا ہوئے تھے تو جواب واضح ہے۔
جب مصنف اپنے مواد سے زیادہ اپنے اسلوب کی وجہ سے پڑھا گیا ہو تو استثنا کے
امکان پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ خصوصاً ہم سسرو کی تقاریر کو پڑھ سکتے ہیں
داد دے سکتے ہیں۔ آج انگریزی کا سب سے بڑا خطیب چرچل ہے۔ مگر
چرچل کا اسلوب سسرو کا اسلوب نہیں ہے کیا سسرو کی تقریر کو اس کی ضرورت
ہے کہ ہم چرچل کے انداز خطابت کے مطابق اس کا ترجمہ کریں۔ ؟ نہیں!

جیسا کہ کہا گیا ہے کہ خیالات کے انتشار کا بڑا سبب خود ایک انوکھی چیز ہے
جو وضاحت طلب ہے۔

اس میں شک نہیں کہ وضاحت کا جز انسانی ذہن کی طبعی تغیّر پذیری میں پایا گیا۔ یہی واحد سبب ہے کہ کچھ قارئین لفظی ترجمہ کو اور کچھ دوسروں کے آزاد ترجمہ کو ترجیح دیتے ہیں اور یہی سبب کچھ قارئین کی اس ترجیح کو جو کبھی یہ نہیں بھولتے کہ وہ ایک ترجمہ پڑھ رہے ہیں اور باقی دوسرے جو اس بات کو ذہن سے محو کر دیتے ہیں اس کو بھی واضح کرتا ہے۔ مگر یہ بیان تمام اختلافات کو سمجھنے کے لئے ناکافی ہے۔

ترجموں کے قارئین کی اپنی ذاتی پسند ہی مختلف نہیں ہوتی، بلکہ ان کے پڑھنے کی وجوہات بھی مختلف ہوتی ہیں۔ شاید سب سے اہم سبب قدیم ترجمہ کے کام کا مقصد اصل تصنیف کی زبان سے لاعلمی کی کمیوں کو پورا کرنا ہے لیکن اکثر ترجمے ایسے اشخاص بھی پڑھتے ہیں جو مترجم کی طرح ہی اصل زبان کو جانتے ہیں اور جب تنقید کرنا مناسب سمجھتے ہیں تو ان کے ذہن اس واقعہ سے نجات نہیں پا سکتے وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ عام قاری جو اصل زبان سے ناواقف ہے اور ممکن ہے کہ آئندہ بھی ناواقف ہی رہے، اس کے لئے ان کی تنقید بے معنی ہو سکتی ہے۔ اور شاید ایسے قاری کے لئے وہ ترجمہ خوشگوار اور اطمینان بخش ہو سکتا ہے اور شاید اسی وجہ سے وہ اصل زبان سیکھنے کی طرف بھی مائل ہو جاتا ہے۔

پھر آخر ترجمے ہوتے کس لئے ہیں؟ اس باب میں چار حصے نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

اول ایسا قاری ہے جو تصنیف کی زبان بالکل نہیں جانتا وہ احساس تجسس کے تحت یا اس زبان کے ادب سے حقیقی دلچسپی کے زیر اثر پڑھتا ہے جس کا ایک

جملہ بھی وہ اصل زبان میں نہیں سمجھ سکتا۔

دوسرا طالب علم وہ ہے جو اصل تصنیف کی زبان سیکھ رہا ہے وہ ترجمہ کی مدد سے اس کے ادب کو پڑھ کر بہت کچھ سیکھ لیتا ہے۔

تیسرا وہ قاری ہے جس نے ماضی میں اس زبان کو سیکھا تھا لیکن چونکہ دوسرے فرائض اور کاروبار کی وجہ سے اپنی ابتدائی معلومات کو تقریباً فراموش کر بیٹھا ہے۔

چوتھا دانشور ہے جو اسے ابھی تک جانتا ہے۔

ظاہراً قارئین کی یہ چار قسمیں ترجمے کو مختلف مقاصد کے لئے استعمال کر رہی ہیں۔

اس سے یہ سمجھنا چاہیئے چونکہ عام طور پر مختلف طریقوں اور آلات کی مدد سے مختلف مقاصد حاصل ہوتے ہیں اس لئے ایک ہی طرح کا ترجمہ ایک ہی طریقہ سے ان سب کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا۔ دوسرے الفاظ میں قاری کے تجزیاتی مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ ترجمہ کی ہر شکل کا اپنا مقصد ہوتا ہے۔ جو ٹھیک طریقہ سے اسوقت پورا ہوتا ہے جب اسی قاری نے اسے استعمال کیا ہو جس کے لئے وہ ترجمہ کیا گیا ہے۔

آیئے اس کو وضاحت سے دیکھیں کوئی بھی بہت آسانی سے ان الفاظ کا تصور کر سکتا ہے جو ترجمہ کی کسی نئی کتاب کو ہاتھ میں لینے پر چار مختلف حضرات کی زبان سے نکلیں۔

پہلا اپنے تئیں کہتا ہے یہ کتاب کس موضوع سے متعلق ہے؟ میں لوگوں

کو اس کتاب کے بارے میں یوں بات کرتے ہوئے دیکھتا ہوں، مصنف نے ان کی دلچسپی کے لیے کیا کیا ہے؟

دوسرا کہتا ہے اس ترجمہ کے مطالب میں آسانی سے سمجھ لوں گا ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر میں اس کا خیال ذہن نشین کر لوں گا۔ تیسرا کہتا ہے زیادہ عرصہ نہیں گذرا۔ میں نے خود اس کتاب کا مطالعہ کیا تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ترجمہ میں کیا کیفیت پیدا ہوئی ہے؟ اس وقت مجھے جو لطف آیا تھا یہ ترجمہ بھی اسے دینے میں کامیاب ہے یا نہیں؟

چوتھا کہتا ہے میں بھی دیکھوں کہ مترجم نے اصل کتاب کی کیا حالت بنا دی مجھے خود اس کتاب سے محبت تھی اور امید ہے کہ اس نے اس کتاب کے حسن کو تباہ نہیں کیا ہوگا۔

قارئین کی یہ چار اقسام ہمارے ترجمے کی مختلف قسموں سے مکمل مطابقت رکھتی ہیں۔ کم علم آدمی آزاد ترجمہ پڑھ کر خوش ہوتا ہے کیونکہ یہ اس کے تجسس کو تسکین پہنچاتا ہے اور وہ سوچنے کی زحمت اٹھائے بغیر آسانی سے پڑھ لیتا ہے زبان کے طالب علم کو صحیح انگریزی میں لفظی ترجمہ سے مدد ملے گی۔ وہ زبان کی مختلف ساخت کی پیچیدگیوں کو سمجھنے میں اس کی مدد کرے گی۔ وہ الفاظ جن کو وہ کم جانتا ہے۔ ان کے صحیح استعمال اس کے سامنے آتے ہیں۔ تیسرا اس ترجمے کو ترجیح دیتا ہے جو ترجمے کی طرح معلوم ہوتا ہو یہ اس کے سابقہ علم کی یادوں کو واپس لے آتا ہے اور اس کے شعور کو ایسا لگتا ہے گویا وہ اصل زبان پڑھ رہا ہے اور چوتھا جو اصل کا مواد اور اسلوب دونوں جانتا ہے وہ ترجمہ کے بعض حصوں میں

علمی نکات سے محظوظ ہوگا اگرچہ یہاں یہ اعتراف کرنا چاہئے کہ اس ترجمہ کے بارے میں اس کی رائے زنی اکثر طنز آمیز نکتہ چینی پر مشتمل ہوگی۔

ان چاروں قسم کے قارئین کی تعداد کم نہیں ہے جیسے ایک مصنف جس نے تقریباً ۲۰ سال ایک پبلک لائبریری میں گذارے ہوں جانتا ہے کہ لائبریری کا عام قاری ایک ایسی شخصیت ہے جو کہیں بھی نہیں پائی جاتی اور یہ کہ یہ مشہور تصنیف کا ترجمہ جو کتب خانے کی زینت بنتا ہے وہ اپنے قدرشناسوں کا حلقہ خود پیدا کر لیتا ہے۔ اس کے ماسوا بہت سے قارئین ایک سے زیادہ تراجم پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ وہ تراجم ایک ترجمہ کے مقابلے میں چار گنا زیادہ بہتر ہوتے ہیں۔ اور ادبی مہمات کے وسیع میدان میں ان سب کے لئے جگہ موجود ہے۔

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

اُردو میں تراجم کے مسائل

سائنس کی ترقی کے ساتھ جوں جوں دنیا کے ملک ایک دوسرے سے قریب آنے کی کوشش کر رہے ہیں اسی قدر ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھنے اور مزاج سے آگہی حاصل کرنے کی ضرورت بھی محسوس ہو رہی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک زبان کو واسطہ نہ بنایا جائے مگر دشواری یہ ہوتی ہے کہ "زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم"۔ یہاں پر زبان کی ناواقفیت ترجمہ کے سہارے دور کی جاتی ہے۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ اگر ترجمہ کا دستور نہ ہوتا تو دنیا گونگوں کی بستی ہو کر رہ جاتی۔ ترجمہ کی ضرورت انفرادی بھی ہوتی ہے اور اجتماعی بھی۔ مگر ہمیں آج دوسری قسم پر مختصر طور سے بحث کرنا اور یہ دکھانا ہے کہ ہماری اردو زبان میں ترجمہ کے کیا مسائل ہیں اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔

اردو تراجم اردو زبان کی گذشتہ ترقی اور آئندہ امکانات کے آئینہ دار ہیں۔ وہ اردو بولنے والی سوسائٹی کی ذہنی نشوونما کا پیمانہ ہیں اگرچہ اردو تراجم ان ترجموں

کے مقابلے میں جو انگریزی یا عربی میں کئے گئے ہیں کم ہیں لیکن اردو زبان اور
اس کی عمر کو دیکھتے ہوئے ان کی اہمیت ناقابل انکار ہے۔ ایک ملک
یا ایک کلچر کے خیالات کو دوسرے ملک یا کلچر کی زبان میں منتقل کرنے کو ترجمہ
کہتے ہیں۔ فارسی اور انگریزی بولنے والی قوم نے جب فکر و جذبات کے کیسی
طریقوں سے اپنے آپ کو قریب کرنا چاہا تو ترجموں سے مدد لی ترجمہ اپنے محدود معنی میں ایک آرٹ
ہے اور وسیع معنوں میں ایک طرز زندگی ہے اردو میں ترجمہ وسیع مفہوم کے اعتبار سے زیادہ نمایاں ہے اسکا جو
آپکو اردو شاعری میں خاص طور سے ملیگا اگرچہ اردو شاعری میں شاہنامہ جیسا شاہکار پیش نہ ہوسکا۔
مگر ایرانی اسپرٹ اور کلچر کو اپنی شاعری میں سمو کر ترجمہ کا وہ پہلو پیش کیا جس کو طرز زندگی میں تعبیر کرسکتے
ہیں اسلئے اردو ہندوستانی اور دوسری تہذیبوں کی روایت کے درمیان ایک پل بنگئی اور یہی ترجمہ
کا آرٹ بھی ہے اور مقصد بھی۔

ترجمہ کے سلسلے میں ہمارے علما اور فقہا کا بڑا حصہ رہا ہے۔ ان کو دو حصوں
میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ جب ان کو دینی خیالات نئی نسلوں تک پہنچانے کی ضرورت محسوس
ہوئی جو ان کی علمی زبانوں (عربی۔ فارسی) اور ان کے طرز بیان سے ناآشنا تھے
تو انھوں نے ان خیالات کو عوام کی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی اور اس طرح
عربی و فارسی الفاظ کا سادہ عوامی زبان میں ترجمہ ہوا۔ شاہ عبدالقادر کا اردو ترجمہ
قرآن اس کی عمدہ مثال ہے۔

۲۔ بعد کو کچھ لوگ ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے قرآن و حدیث کے ترجمے
اور دینی خیالات کے منتقل کرنے میں عربی و فارسی کی مضحک نقالی شروع

کی۔ اس طرح وہ مولویانہ اردو ترجمے وجود میں آئے جن کو پڑھ کر ہنسی آتی ہے اور ایسے ترجمے اصل سے زیادہ ناقابل فہم ہوتے ہیں اس نقالی کا یہ اثر ہوا کہ یہ استثنائے چند کوئی قابلِ ذکر اردو میں ترجمہ نگار نہیں پیدا ہوا۔ ان روایات اور اصطلاحات کا پورا فائدہ اس وقت اٹھایا گیا۔ جب انگریزی سے اردو میں قانونی مواد کے ترجموں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مثلاً ڈاکٹر نذیر احمد کا (INDIAN PENAL CODE) تعزیرات ہند کا اردو ترجمہ ہوا۔ یہ ترجمے مقبول اور شستہ و پاکیزہ تھے۔

سرسید تحریک سے اردو تراجم کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اب مترجم ایک مقصد کے شعور کے ساتھ علمی اور ادبی کارناموں کے ترجموں کی طرف متوجہ ہوئے۔ مغربی تہذیب اور تمدن کی قدریں اور انگریزی زبان کے معیار ان کے راہ نما تھے یہ گروہ حرکت اور تبدیلی کی نمائندگی کرتا تھا۔ ان کے علاوہ پہلا گروہ بھی ترجمہ کے میدان میں موجود تھا مگر وہ جمود اور پرانی قدروں کی نمائندگی کرتا تھا۔ اس طرح اردو زبان ان دو رجحانات کے عمل اور ردِ عمل کی جولان گاہ بن گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے گروہ کا دائرۂ عمل یہ ٹھہرا کہ پرانا گروہ جو مصنوعی اور کھردری زبان اپنے تراجم میں استعمال کرتا تھا انھیں چیزوں کو یہ ہموار اور جدید مذاق سے قریب کرتا۔ اس طرح قدیم گروہ نے تراجم کے مواد اور پیرائے کو کنٹرول کیا اور نئے گروہ نے جدید رجحانات کو۔ جو نئے ترجمے ہندوستان اور پاکستان میں ہوئے ہیں ان کے اندر قدیم اور جدید رجحانات کا سنگم نظر آتا ہے۔ نیا پہلو یہ ہے کہ انہیں جدید خیالات اور جدید اسالیب کی کافی نمائندگی ہے۔ قدیم پہلو کہ قدیم عربی اور فارسی علمی ذخیرے اور ان سے ماخوذ سرمایہ الفاظ

سے ان میں خاص مدد لی جاتی ہے۔
اب ہمیں یہ غور کرنا ہے کہ اردو ترجمہ کو مستقبل میں کیا مسائل پیش آسکتے ہیں۔ یا کس اصول پر ان کی پیش رفت ہونی چاہیے۔ اس کے لئے ان کی نشوونما کے مختلف ادوار پر نظر ڈالنا ہوگی۔

۱۔ شروع دور میں ترجمہ ایک ایسے عمل کی مانند تھا جس کے ذریعہ دوسرے ملکوں اور زبانوں کے تہذیبی اثرات اردو زبان میں منتقل کئے جا رہے تھے۔ ترجمہ اس وسیع اور تہذیبی تاثر کا ایک رخ تھا۔ ان لوگوں کو اردو کے علاوہ کئی زبانوں سے شغف تھا اس لئے وہ ان کی تہذیبی روایات کو اردو میں منتقل کر رہے تھے۔ اس دور کے ترجموں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان مترجموں کی ذہنی صلاحتیں عربی اور فارسی کے طفیل اعلیٰ درجہ کو پہونچی ہوئی تھیں۔ اور اردو دورِ طفولیت میں تھی اس لئے اس کی نشوونما کے لئے وہ غذا فراہم کررہے تھے۔ ان کی مثال ایسے بیمار کی سی تھی جو اپنی روزانہ غذا (اردو) کے نقص کو دواؤں (عربی و فارسی) خیالات اور اسالیب کے ذریعہ دور کر رہا ہو۔

۲۔ اردو تراجم کا دوسرا دور وہ تھا جب مترجموں نے اردو کو اپنے اسلامی فکر و خیالات کے اظہار کا محکم ذریعہ بنانے کی کوشش کی۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو زبان کی نشوونما اسلامی خیالات کے آلے کی حیثیت سے ہوئی۔ لیکن ترجموں کی خوبیوں اور معیار کے اعتبار سے یہ کوشش ناقابلِ اطمینان تھی۔

۳۔ تیسرے دور میں نفس ترجمہ اور اس کی ضروریات پر زور دیا گیا پچھلے

دور میں نفس ترجمہ کو کسی حد تک نظر انداز کیا گیا۔ لیکن اس دور کے ترجموں میں نقص پایا جاتا ہے کہ ترجمے محض ترجمہ کی اہمیت کو ملحوظ رکھ کر کئے جاتے تھے اور ان میں زبان کی ساخت اور اس کے اندرونی تقاضوں کا لحاظ نہ تھا۔

۴- اردو ترجموں کا چوتھا دور مستقبل سے تعلق رکھتا ہے اور اس دور میں ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اس بنیادی نقص کو دور کیا جائے۔ مگر یہ کس طرح ہو۔

مترجم کو چاہیے کہ وہ محض یہ نہ دیکھے کہ کس زبان کی کونسی اہم اور مفید تصانیف ہیں جن کو اردو میں منتقل کرنا چاہیے یہ ترجمہ کا خارجی پہلو ہوگا۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ اردو زبان کا مزاج کس قسم کی چیزوں کے ترجمہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور اردو کن زبانوں کے اثرات کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور کن زبانوں کی نہیں، جو ترجمے عربی اور فارسی میں ہوئے ہیں ان کی تاریخ سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

زبان کی ساخت کے تقاضوں کو ترجموں میں ملحوظ رکھنے کا حسب ذیل طریقہ بھی ہو سکتا ہے مثلاً (WIRELESS) ترجمہ کرنے میں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اگر اردو میں ترجمہ کسی ایسے لفظ جیسے "لاسلکی" سے کریں جو بہت کم استعمال ہوتا ہے اگر "وائرلیس" کو بہتر فیصدی انسان سمجھ سکتے ہیں تو اس کا اردو ترجمہ دس فیصدی سمجھیں گے۔

مترجم کو محض میکانکی طریقہ سے یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ اصل لفظ اور اس

کے ترجمے کی مقدار استعمال (USEFREQUENCY) کیا ہے بلکہ یہ بھی دیکھنا ہے کہ اصل لفظ اور اس کے ترجمے کے پیچھے جو تصور اصل زبان میں ہے اس کو ترجمہ کی زبان قبول اور جذب کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے یا نہیں اگر دونوں شرطیں پوری ہوتی ہیں تو ترجمہ کا مقصد کامیاب ہے اور اگر مترجم آشنا با شعور ہے اور وہ یہ دیکھتا ہے۔ کہ اصل زبان کا کوئی لفظ اور اس کے پیچھے اس کا تصور ایسا ہے کہ اس کے لئے مناسب لفظ (جو آشنا ہی مقبول ہے) ترجمہ کی زبان میں موجود نہیں تو اس کو چاہئے کہ عام استعمال کا کوئی سادہ لفظ منتخب کرلے۔ اگرچہ وہ لفظ پہلے سے وہ تصور اپنے پیچھے نہ رکھتا ہو تو مترجم کی تخلیقی قوت اس کو نئی اہمیت بخش دے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ التزام ادبی کتب کے ترجمے کے لئے مناسب ہے لیکن فنی اور علمی تراجم میں یہ قید لازم نہیں۔ وہاں اس کا فرض یہ ہوگا کہ حسب ضرورت عربی یا سنسکرت کے خزانہ الفاظ سے مدد لے اور اس کا خیال نہ کرے کہ جو اصطلاح اس نے بنائی ہے وہ سادہ اور عام فہم ہے یا نہیں۔ ہاں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ وہ اصل کی پوری معنویت کا احاطہ کر رہی ہے۔ اس کی مثال کے طور پر ہم نذیر احمد کے ترجمہ تعزیرات ہند کو پیش کر سکتے ہیں۔ مثلاً انھوں نے (SELF GRATIFICATION) کے لئے رشوت کا لفظ مناسب نہیں سمجھا بلکہ ایک جامع اصطلاح مابہ الاحتظاظ ذمنع کی جو پورے مفہوم پر حاوی ہے جو ذرا ثقیل اور اجنبی ضرور تھی مگر ضرورت اور جامعیت نے اس کو قبول عام عطا کر دیا۔

مختصر یہ کہ اب ترجمہ کی نشو و نما کا اردو میں یہ راستہ ہونا چاہئے کہ اندر سے باہر کی طرف نشو و نما ہو۔ مترجم کو چاہئے کہ وہ صرف اس پر قانع نہ ہو کہ وہ کسی زبان کی تصنیف کو جیسے تیسے اردو میں منتقل کر دیں بلکہ الفاظ اور معنی کو تولیں اور دیکھیں کہ وہ اپنے پڑھنے والے کو ترجمہ کے ذریعے سے اصل کی ذہنی سطح اور بصیرت بھی دے سکتے ہیں اور ترجمہ کے ساتھ ساتھ انفرادی تصانیف کا کام بھی چلتا رہے تو امید ہے کہ اردو زبان ایک پختہ اور محکم آلۂ اظہار کی حیثیت سے نمایاں ہوگی۔

آخر میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔ مجھے ایک ضرورت کا احساس اکثر ہوا ہے اور وہ یہ کہ جن یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبے قائم ہیں وہ ایک سیکشن تراجم کے لئے بھی مخصوص رکھیں اور کوشش کریں کہ فارسی اور انگریزی ادب کو اردو کے سانچے میں ڈھال دیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ مغربی اور کلاسیکی روایتیں ہماری زبان میں شامل ہونگی اور دوسری طرف زبان کا دائرہ (خیال اور زبان کے اعتبار سے) وسیع ہوگا۔

شہباز حسین

ترجمہ کی اہمیّت

ترجمہ بڑا مشکل کام ہے۔ یہ نگینہ جڑنے کا فن ہے جو بڑی مہارت اور ریاضت چاہتا ہے۔ ایک زبان کے معانی اور مطالب کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرنے کے لیے کہ اصل عبارت کی خوبی اور مطلب جوں کا توں باقی رہے۔ دونوں زبانوں پر یکساں قدرت کی ضرورت ہوتی ہے جو عام طور پر کمیاب ہوتی ہے۔ ترجمے بہت ملتے ہیں اچھے ترجمے خال خال ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو دو زبانیں جانتا ہے بزعم خود مترجم بن بیٹھتا ہے اور ایسے ایسے گل بوٹے کھلاتا ہے کہ ترجمے کی اہمیت اور افادیت مجروح ہوجاتی ہے اور ترجموں پر سے اعتبار اٹھ جاتا ہے۔

ذرائع آمد و رفت میں وسعت اور سرعت آجانے کی وجہ سے دنیا کی مختلف زبانیں بولنے والوں میں ارتباط اور اختلاط روز بروز بڑھتا جارہا ہے اور ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ضرورتاً ایک دوسرے کی زبان

سیکھنی پڑتی ہے اور ملوکیت میں وہ افراد یا طبقے ہمیشہ ممتاز رہے جنہوں نے حاکموں کی زبان سیکھنے میں سبقت کی۔ حاکموں نے بھی محسوس کیا کہ امن و استحکام کے لئے صرف زور بازو ہی کافی نہیں ہے۔ دلوں کو بھی مسخر کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے محکوم قوموں کی زبان اور ثقافت سے بھی آشنائی ضروری ہے۔ اجنبیت اور مغائرت کو کم کرنے کے لئے ترجموں کا بڑا ہاتھ رہا ہے

علم کی وسعت اور علمی اور سائنسی دریافتوں کی کثرت سے بنی نوع انسان کو فائدہ پہونچانے میں ترجموں نے بڑی مدد کی ہے۔ یورپ کے نشاۃ ثانیہ میں عربی کے تراجم کا بھی ہاتھ ہے۔ ترجمہ وہ کنجی ہے جس کے ذریعہ علوم و فنون کے خزانے سب کے لئے کھل جاتے ہیں۔ اسی لئے روز بروز ترجموں کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے اور ترجمے نے بھی تخلیق کا درجہ پالیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ترجمہ خواہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو اس میں اصل کے تمام محاسن آہی نہیں سکتے۔ یہ بات مشرقی ترجمے کے لئے یا ان زبانوں کے لئے تو ٹھیک ہے جو ابھی ترقی یافتہ نہیں ہیں جو ہر قسم کے معانی و مطالب کے اظہار پر قادر ہوں مگر دنیا کی ترقی یافتہ زبانیں اب اس مرحلے پر پہونچ گئی ہیں۔ کہ وہ کم از کم نثری تخلیقات کو بجنسہٖ دوسری زبانوں میں منتقل کر سکیں۔ کسی دوسری زبان سے براہ راست استفادہ کرنے والے ہمیشہ تھوڑی تعداد میں ہوتے ہیں لہٰذا ترجمے کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی کیونکہ کالیداس، عمر خیام، اقبال اور ٹیگور کی عظمت کا اعتراف ترجموں کی بدولت ہی ہوا ہے۔

مغلیہ دور میں سنسکرت سے فارسی میں کافی ترجمے ہوئے انگریزوں کی آمد

کے بعد انگریزی سے مقامی زبانوں میں ترجموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ فورٹ ولیم کالج میں انگریزی سے کسی کتاب کا ترجمہ اردو میں نہیں ہوا لیکن عربی اور فارسی اور سنسکرت کے تراجم ضرور ہوئے انگریزی سے اردو میں ترجمہ شدہ پہلی کتاب جمن شنلر کا "انجیل مقدس" ہے جو ۱۸۰۴ء میں شائع ہوئی۔ بعدہٗ مرزا فطرت نے دل ہیز کی مدد سے ۱۸۰۵ء میں انجیل کے "عہد جدید" کا ترجمہ شائع کیا۔ بعد میں اکا دکا انفرادی کوششیں ہوتی رہیں۔ بعد میں امراء اور نوابین نے جو جدید علوم کی اشاعت اور فروغ میں دلچسپی رکھتے تھے۔ ترجموں کی سرپرستی کی۔ جیسے حیدرآباد کے نواب فخرالدین خاں شمس الامراء کی کوششوں سے بعض رسالے شائع ہوئے۔ رسالہ مختصر جرثقیل، رسالہ کسورات اعشاریہ، رسالہ اسطرلاب، کردی، کیمسٹری کا مختصر جز، رسالہ شاہان اودھ نے بھی بعض کتابوں کے ترجمے کرائے۔ اور مطبع سلطانی سے شائع کئے۔ جیسے رسالہ ہیئت، رسالہ علوم طبعیہ، رسالہ قوت مقناطیس، رسالہ علم الحرارۃ، رسالہ علم المناظر وغیرہ۔ لیکن ترجموں کی پہلی باضابطہ کوشش دہلی کالج میں ہوئی۔ کیونکہ مغربی علوم کے پڑھانے میں سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ اردو میں کتابیں دستیاب نہیں تھیں۔ لہذا انجمن اشاعت علوم بذریعہ السنہ ملکی" یا "دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی" قائم ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ جدید کتابوں کی تالیف اور ترجمے کے ذریعے ہندوستانی زبانوں کو ترقی دی جائے۔ انجمن نے ترجمے کے لئے جو قاعدے مقرر کئے تھے ان کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

۱۔ ہر اوہ لفظ اردو میں نہ ملے تو اصل لفظ استعمال کیا جائے۔

۲۔ سائنس کی کتابوں کا ترجمہ انگریزی سے ہوگا۔ اس لئے انگریزی الفاظ کا استعمال ناگزیر ہے۔

۳۔ ترجمہ لفظی نہ ہو بلکہ اس کا مفہوم اردو میں ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔

اس ادارے میں بہت سی کتابوں کا ترجمہ ہوا۔ غدر کے ہنگامہ میں یہ کالج بند ہوگیا اور پھر نہ کھلا۔ اس کے بعد دوسرے قدرے منظم کوشش سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کے تحت ہوئی۔ تاریخ، جغرافیہ، سائنس اور معاشیات کی متعدد کتابیں ترجمہ ہوئیں اس کے بعد زمانے میں انگریزی تعلیم کے عام ہوجانے کی وجہ سے بہت سے ترجم پیدا ہوگئے لیکن یہ تراجم زیادہ ناولوں، ڈراموں، کہانیوں کے تھے ذریعۂ تعلیم انگریزی تھا اسی نصابی ضرورتوں کیلئے ملکی زبان میں علوم کی کتابوں کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔

دراصل اردو میں سب سے منظم اور باضابطہ کوشش جامعہ عثمانیہ کے قیام (۱۹۱۸ء) کی بعد شروع ہوئی۔ کیونکہ جامعہ عثمانیہ نے ذریعۂ تعلیم اردو کو قرار دیا تھا۔ جامعہ عثمانیہ میں "سررشتہ تعلیم و ترجمہ" قائم ہوا جس کے تحت ۵۰۰ کے قریب کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ یہ کتابیں آرٹس اور سائنس، انجینرنگ اور میڈیسن تقریباً تمام جدید علوم پر حاوی تھیں ہندوستان کی کسی زبان میں اعلیٰ تعلیم دینے کا یہ پہلا تجربہ تھا جو بحیثیت مجموعی کامیاب رہا۔

دارالترجمہ میں دو طرح کے رکن تھے۔ ایک وہ جو مستقل اس کے رکن تھے اور دوسرے وہ جو اجرت پر کام کرتے تھے۔ ترجمے کی تکمیل کے بعد کسی ماہر فن سے اس پر نظر ثانی کرائی جاتی اور پھر ادبی ناظر زبان و بیان کی اصلاح کے لحاظ سے نظر ثانی کرتے اور کتاب شائع ہوجاتی۔ ترجمہ کے دوران مترجمین ایسے الفاظ اور

اصطلاحات کی فہرستیں متعلقہ مجالس وضع اصطلاحات میں بھیجتے تھے جن کے مترادف الفاظ اردو میں نہیں تھے۔ اس مجلس کے اراکین میں علم کے ماہرین کے علاوہ عربی، فارسی اردو اور ہندی میں دستگاہ رکھنے والے بھی شامل ہوتے تھے جو زبان کی ادبی اور لسانی خصوصیات کو مدنظر رکھتے تھے۔ اردو کے دامن کو مالا مال کرنے میں دارالترجمہ نے بڑا نمایاں حصہ لیا ہے۔

ترجمہ کے سلسلے میں سب سے پہلی مشکل اصطلاحات کے سلسلے میں پیش آتی ہے۔ یہ مشکل سائنسی علوم کے سلسلے میں زیادہ محسوس ہوتی ہے کیونکہ... اصطلاح ایک معین معنی دیتی ہے۔ اور اس کیلئے ایسا متبادل لفظ ہونا چاہئے جو یہی مخصوص معنی دیتا ہو مثلاً AGREEMENT یا TREATY کے لئے اردو میں سمجھوتہ یا معاہدہ استعمال ہوتا ہے۔ یہ طے نہیں ہے کہ TREATY کے لئے معاہدہ اور AGREEMENT کے لئے سمجھوتہ ہی استعمال ہوگا۔ لہذا جس کا جو جی چاہتا ہے استعمال کر لیتا ہے۔ یہ سہولت سائنس میں نہیں ہے اسی طرح قوانین، اور قانون کی کتابوں یا عدالتوں کے فیصلوں کے ترجموں کے لئے بھی مخصوص اور معین الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے لہذا جہاں کہیں بھی ترجمے ہوئے اصطلاحات سازی بھی ہوئی۔ دارالترجمہ حیدرآباد نے وسیع پیمانے پر اصطلاحات وضع کیں مولانا وحیدالدین سلیم اپنی بیش بہا تصنیف "وضع اصطلاحات" مرتب کی اور پہلی بار اصطلاحات وضع کرنے کے اصول مقرر کئے جو آج بھی اتنے ہی کارآمد ہیں۔

اصطلاحات سازی کے سلسلے میں بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ اصطلاحات

کا ترجمہ نہیں کرنا چاہیئے۔ ان کا کہنا ہے کہ انگریزی زبان کی اصطلاحوں کو تقریباً بین الاقوامی اصطلاحوں کا درجہ حاصل ہو گیا ہے لہٰذا ان کو جوں کا توں اپنا لینا چاہیئے۔ لیکن یہ صورت قابل عمل نہیں ہے۔ کیونکہ اصطلاحوں سے جو مشتقات بنتے ہیں ان کو اردو میں جوں کا توں اپنا لینے سے بڑی قباحت پیدا ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ اب اصطلاحوں کی اتنی کثرت ہو گئی ہے کہ اردو میں ان کے بے محابا استعمال سے عبارت بڑی عجیب وغریب ہو جائے گی۔ لہٰذا انھیں انگریزی اصطلاحوں کو اپنانا چاہیئے جو آسانی سے اردو میں کھپ سکیں۔

ترجمے کے سلسلے میں بنیادی اور اولین شرط یہ ہے کہ جس زبان سے ترجمہ کرنا ہو اور جس زبان میں ترجمہ کرنا ہو دونوں پر قدرت حاصل ہو۔ صرف اسی حد تک نہیں کہ دونوں زبان کے مطالب سمجھ میں آجائیں بلکہ زبان کی ساخت، مزاج اور اس کے تہذیبی پس منظر سے بھی اچھی آگاہی ہو۔ عام طور پر اردو میں جو ترجمے دیکھنے میں آتے ہیں وہ ادھ کچرے سے ہوتے ہیں اور پڑھنے والا فوراً سمجھ جاتا ہے کہ عبارت کا لفظی ترجمہ ہوا ہے۔ کیوں کہ زبان اکھڑی اکھڑی سی ہوتی ہے اور جملوں کی ساخت بھی انگریزی جملوں کے مطابق ہوتی ہے اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ ترجمہ لفظ کا نہیں مفہوم کا کیا جاتا ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اگر کسی بات کو اپنی زبان میں کہیئے تو کس طرح کہئے ایسا انداز اپنانے سے ترجمے کے عیوب دور ہو جاتے ہیں۔ یوں تو ہر معاملے میں عقل سلیم کی ضرورت ہوتی ہے مگر مترجم کے لیے تو یہ شرط کی حیثیت رکھتی ہے عام طور پر ڈکشنری میں ایک لفظ کے کئی معنی دیئے ہوتے ہیں اب سیاق وسباق

کے مطابق مترجم صحیح لفظ کا انتخاب کرتا ہے اس کے لئے استعداد اور لیاقت ذخیرہ ضروری ہے ہی مگر سمجھداری کی بھی بڑی اہمیت ہے مثلاً ایک جگہ ایک ترجمہ یہ دیکھا: 'I solemnly dedicate myself for the service of the nation'.

"میں انتساب سے قوم کی خدمت کا عہد کرتا ہوں"

اب DEDICATE کے معنی انتساب کے بھی ہیں مگر یہاں اس کا محل استعمال نہیں ہوگا۔ جنگ کے زمانہ میں ایک ترجمہ اس طرح کیا دیکھا کہ "ہوا باز بحفاظت تمام طیارے کو واپس لے آیا حالانکہ اس کی نظر کمزور تھی۔ "نظر کمزور تھی" انگریزی کے ان الفاظ کا ترجمہ تھا — 'Though the visibility was poor'. عقل سلیم سے معلوم ہو جائے گا کہ ایسا شخص ہوا باز نہیں بن سکتا جس کی نظر کمزور ہو۔ بعض دفعہ سیاق کو صحیح نہیں سمجھنے سے ترجمہ غلط ہو جاتا ہے مثلاً

'A Muslim is required to performs Haj without causing distress to his family'.

"مفہوم یہ ہے کہ کسی مسلمان پر حج اس وقت فرض ہے جب اس کے فریضۂ حج پر چلے جانے سے اس کے خاندان کے لوگ کسی طرح کی مالی مشکلات میں نہ پھنس جائیں" مگر ایک مترجم نے اس کا ترجمہ یوں کیا تھا "خاندان کو تنگ کئے بغیر حج کو جا سکتا ہے" بعض دفعہ عبارت کو صحیح نہ سمجھنے سے بالکل غلط ترجمہ ہو جاتا ہے۔ جیسے: " Hold fast to truth "

کا ترجمہ سچائی کے لئے برت رکھنا۔ بعض دفعہ ترجمہ بالکل نا اہل ہوتا ہے جیسے۔ Outstanding Scientist کا ترجمہ باہر کھڑے ہوئے سائنس داں یا Steel Plants. "فولاد کے پودے" اس طرح کی بہت مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

ترجمہ محض ایک زبان کے خیالات کو دوسری زبان میں پلٹ دینے کا نام نہیں ہے بلکہ خیالات اور احساسات کو اس ترتیب کے ساتھ منتقل کرنے کا نام ہے کہ مصنّف نے کس جگہ پر زور دیا ہے۔ کہاں پر طنز ہے۔ کہاں پر محاورہ یا روزمرہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ صحیح ہے کہ ترجمے میں اصل کی ساری خوبیاں نہیں پیدا کی جا سکتیں لیکن بہت سی خوبیاں ضرور سموئی جا سکتی ہیں۔

اردو میں اچھے ترجموں کی کمی رہی ہے۔ خصوصاً علمی اور سائنسی موضوعات کے اچھے ترجمے کمیاب ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ رہی ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم کبھی نہیں رہی جب جامعہ عثمانیہ نے اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا تو وہاں خاصی تعداد میں (۵ سو کے لگ بھگ) کتابوں کے ترجمے ہوئے اور اب ترقی اردو بورڈ کے ذریعہ تقریباً سو کتابیں ترجمہ کرائی جا رہی ہیں۔ اس سلسلے میں مترجمین کو جو مشکلات پیش آ رہی ہیں وہ وہی ہیں جن کا ذکر اوپر آچکا یعنی اصطلاحات کی کمی، اچھی انگریزی اردو ڈکشنری کی عدم موجودگی۔ عبدالحق صاحب کی ڈکشنری ۱۹۳۶ء میں تیار ہوئی تھی اس کے بعد سے لاکھوں الفاظ آ گئے ہیں یا الفاظ کے معنی اور استعمال بدل گئے ہیں۔ کسی اچھے نمونے کی کمی پھر اردو کی اپنی نارسائی۔ فی الحال ترقی اردو بورڈ وسیع پیمانے پر علمی اور سائنسی موضوعات پر

تراجم کرا رہا ہے اس سلسلے میں تقریباً ہر موضوع کے مترجمین کو جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ کی وضع کردہ قدیم اصطلاحات مہیا کر دی گئی ہیں لیکن گزشتہ بیس سال کے عرصے میں سائنس اور علوم نے اتنی ترقی کی ہے جتنی کہ پچھلے دو سو برس میں نہیں کی تھی۔ اور نہ صرف اصطلاحوں میں بے انتہا اضافہ ہوا ہے بلکہ اصطلاحوں کے معنی تک بدل گئے لہذا عثمانیہ کی اصطلاحیں ہماری رہنما ثابت ہو سکتی ہیں ..... اور ایک مثال کے طور پر کام دے سکتی ہیں۔ لیکن ہمارے لئے مستقل نہیں ہو سکتیں۔ ہمیں تو آج خود کنواں کھود کر پانی پینا ہے۔

ترجمہ ایک مستقل فن ہے جو بڑی ریاضت چاہتا ہے۔ اخبار، ریڈیو اور اب تدریسی ضرورتوں کے تحت اردو ترجموں کی مانگ بڑھتی جا رہی ہے ایک دو یونیورسٹیوں میں ترجمے کے شعبے کھل گئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ مزید یونیورسٹیوں میں شعبے کھلیں۔ اردو بورڈ کی ترجمہ کردہ کتابوں اور اصطلاحوں سے اس کام میں بہت مدد ملے گی۔

ترجمہ کی روایت

سید احتشام حسین

اردو میں دوسری زبانوں کا افسانوی ادب

تجارت کی طرح مختلف قوموں اور ملکوں کے درمیان تہذیبی لین دین کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ دنیا کی کوئی تہذیب اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتی کہ وہ خالص ہے اور اسے کسی دوسری تہذیب میں ایسے عناصر نظر نہیں آئے جن کی طرف اس نے شوق اور رشک آمیز تجسس کے ساتھ نہ دیکھا ہو۔ تہذیب کے دوسرے پہلوؤں کے مقابلہ میں ادب میں یہ بات زیادہ نمایاں ہوتی ہے کیونکہ رقص، موسیقی اور مصوری کی نقل اتارنے کے بہ نسبت خیالات کو اپنی زبان اور اپنے الفاظ میں ڈھال لینا آسان ہوتا ہے۔ اس لئے ایک ادب دوسرے ادب سے وہ چیزیں اپنے یہاں منتقل کر لیتا ہے جنہیں وہ کسی نہ کسی حیثیت سے اپنے ادبی مزاج سے ہم آہنگ یا مفید پاتا ہے اس کی محرک عملی توسیع کی خواہش بھی ہو سکتی ہے اور محض تجارتی مفاد بھی۔ اردو دنیا کی بہت سی زبانوں کے مقابلہ میں کم عمر ہے اس

کا ادبی ارتقا اس وقت ہوا جب بہت سی زبانوں کے ادب میں گراں بہا سرمایہ جمع ہو چکا تھا اس لئے اسے شروع ہی سے دوسری ترقی یافتہ زبانوں سے فائدہ حاصل کرنے کا موقع ملا لیکن جہاں تک مختصر افسانے کا تعلق ہے اس کی ابتدا انیسویں صدی میں ہوئی اور گو اس سے ملتی جلتی چیزیں ہندوستان ایران چین اور عرب وغیرہ میں قدیم زمانے سے نظر آتی ہیں۔ لیکن جدید مفہوم میں افسانہ نگاری کا سلسلہ گذشتہ صدی ہی سے شروع ہوتا ہے۔ اس وقت افسانے کا یہی مفہوم پیش نظر ہے۔

اردو میں دوسری زبانوں سے ترجمہ کا کام تو بہت پہلے سے شروع ہو چکا تھا لیکن مغربی ادب سے ترجمے انیسویں صدی ہی میں شروع ہوئے ان ترجموں میں بھی مختصر افسانوں کی نوبت بہت دیر میں آئی۔ افسانہ کو بعض نقادوں نے ادب اور صحافت کے درمیان ایک صنف قرار دیا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ افسانے کا عروج رسالوں کا پیٹ بھرنے کے سلسلے میں ہوا۔ اردو میں بھی مختصر افسانے پہلے رسالوں ہی کی زینت بنے۔ یقین کے ساتھ تو نہیں کہا جا سکتا کہ انیسویں صدی کے آخری حصّہ میں جو رسائل نکلتے تھے ان میں افسانے شائع ہوتے تھے یا نہیں لیکن جب لاہور سے مخزن، کانپور سے زمانہ، آگرہ سے نگار، دہلی سے صلائے عام، وغیرہ نکلنے شروع ہوئے تو بعض یورپی افسانوں کے ترجمے بھی ان میں شائع کئے گئے۔ ان ترجموں کی اہمیت اس لئے زیادہ ہے کہ ان کے اثر سے خود اردو کے ادیب افسانہ نگاری کی جانب مائل ہوئے۔ ہندوستان کی بعض دوسری زبانوں کے ادب میں ترجمہ، اخذ اور اقتباس کی کوششوں نے مشہور و معروف افسانہ نگاروں سے نہ سہی مغربی افسانوں سے اردو دانوں کو روشناس کرایا۔ اگر رسائل کی ورق گردانی کی جائے تو ایسے متعدد افسانے ملیں گے جو

مغربی زبانوں سے لئے گئے ہیں اور یا تو انھیں ویسے کا ویسا ہی رکھا گیا ہے یا ہندوستانی لباس پہنا کر اپنا لیا ہے۔ مشکل ہی سے کسی جگہ یہ معلوم ہو گا کہ یہ ترجمہ کس کا ہے اور کس زبان سے لیا گیا ہے۔ مگر یہ صورت حال آج بھی جاری ہے اور چوری کی نیت سے لے کر سچی ادبی خدمت کے شوق تک یہ بات نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ افسانہ کس کا ہے لیکن باقاعدہ ترجموں کی تعداد بھی اتنی زیادہ ہے کہ ان پر نظر ڈالنے کے لئے وقت چاہئے۔

شروع میں سر عبدالقادر، ظفر علی خاں، سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری نے مختلف زبانوں سے ترجمے کئے۔ کبھی یہ معلوم ہو سکا کہ افسانہ کا ترجمہ کون سا افسانہ ہے اور کبھی نہ معلوم ہو سکا، اس دوران میں بنگالی میں افسانہ نویسی عام ہو چکی تھی، بعض افسانے وہاں سے بھی لئے گئے۔ لیکن ۱۹۳۰ء کے قریب کئی اچھے لکھنے والے باقاعدہ افسانوں کے ترجمے کی طرف متوجہ ہوئے اور یہی نہیں کہ انھیں جو ملا اس کا ترجمہ کر لیا بلکہ دنیا کی مختلف زبانوں کے اچھے افسانوں کی جانب نگاہ گئی۔ ان مترجمین میں خواجہ منظور حسین، حامد علی خاں، جلیل قدوائی، محشر بدایونی، فضل حق قریشی اختر حسین رائے پوری، قاضی عبدالغفار، مجنوں گورکھپوری، اعظم کریوی نے روسی، فرانسیسی، جرمنی، انگریزی اور انگریزی کے ذریعے دوسری زبانوں کے افسانے ترجمہ کے لئے منتخب کئے۔ رسائل ان ترجموں کو اہمیت دیتے تھے اور اچھے ترجمے نئے لکھنے والوں کے لئے شمع راہ بنتے تھے۔ خواجہ منظور حسین اور جلیل قدوائی نے روسی افسانہ نویس چیخوف کے یہاں سے، اعظم کریوی نے ہندی سے اور دوسرے لکھنے والوں نے مختلف زبانوں سے افسانے لئے اور باقاعدہ ترجمے کئے۔ مجنوں نے لفظی ترجمے

کرنے کے بجائے انگریزی کہانیوں اور خاص کر ہارڈی کی کہانیوں پر اپنے افسانے ڈھال لئے۔ ان مترجمین نے یقیناً اردو افسانہ نگاری کو نئی راہیں دکھائیں کیونکہ ان کے ترجمے اعلیٰ درجے کا ادبی حسن بھی رکھتے تھے۔

ترجمے کی اس کوشش میں یہ بات واضح ہوئی کہ فرانس کے عدیم النظیر افسانہ نگار موپاساں اور روس کے حقیقت پسند افسانہ نویس چیخوف کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے اگر غور کیا جائے کہ ایسا کیوں تھا تو اس کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں۔ ۱۹۳۰ء کے بعد اردو میں حقیقت پسندی اور نفسیاتی رومانی رجحان دونوں کے لئے جگہ بن چکی تھی اور یہ افسانہ نویس اپنے طرز اظہار اور انتخاب موضوع سے یہاں کی زندگی کے حقائق اور خوابوں سے قریب معلوم ہوتے تھے۔ کچھ دنوں کے اندر روسی اور فرانسیسی افسانوں کے ترجمے نہ صرف رسالوں میں بلکہ کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ سعادت حسن منٹو نے خود طبعزاد افسانے لکھنے سے پہلے ترجموں کی طرف توجہ کی اور اپنے ترجموں کا مجموعہ روسی افسانے کے نام سے لاہور سے شائع کیا۔ اس مجموعے میں کاؤنٹ لیوٹالسٹائی کے دو افسانے، تین سوال اور شراب شیطان، چیخوف کی خادمہ اور اشار گورکی کے چھبیس مرد ایک عورت، چیری کوف کے جادوگر کے علاوہ سلوگب کے دو مختلف افسانے شامل تھے۔ روسی ادب کی حقیقت پسندی، زندگی کے مسائل پر گہری نگاہ، عوامی نقطۂ نظر ہر چیز ہندوستانی ادب کے عام میلانات سے ہم آہنگ تھی۔ اس لئے روسی ناولوں اور ڈراموں کے ساتھ ساتھ افسانوں کے ترجمے بھی بڑی تعداد میں ہوئے۔ چیخوف، ٹالسٹائی اور گورکی کے علاوہ نئے روسی ادیبوں مثلاً میموتوف، پیٹروف، شچوناف، الکسی ٹالسٹائی، شولوخوف کے افسانے بھی برابر ترجمے

ہوتے رہے ہیں۔ پچھلی لڑائی کے زمانے میں شولوخوف نے ایک دلچسپ اور زبردست کہانی نازی بربریت کے خلاف لکھی۔ سبط حسن نے اس کا ترجمہ نفرت کے نام سے شائع کیا۔ انھیں دنوں میں نے سیمونوف کی ایک کہانی کا ترجمہ غلام کی پیدائش کے عنوان سے کیا۔ کیونکہ ہندوستان میں بیرونی حکومت اور غربی کے خلاف عوام جو جدوجہد کر رہے تھے اس کی خوبصورت تصویر اس افسانے میں بھی ملتی تھی بہرحال روسی کہانیوں کا ترجمہ ہوتا جارہا ہے۔ حال میں رضیہ سجاد ظہیر نے روس کی کچھ بہترین کہانیوں کا ترجمہ کیا ہے۔ اس مجموعے میں پشکن، چیخوف، الکسی ٹالسٹائی، شولوخوف اور سیمونوف کے ایک ایک افسانے لئے گئے ہیں۔

اردو میں ترجمہ کے نقطہ نظر سے موپاساں فرانسیسی افسانہ نگاروں کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کے افسانے کی رنگینی سادہ نفسیاتی انداز بیان اور واقعات کے ڈرامائی موڑ اسے ہر ملک میں ہر دل عزیز بناتے ہیں۔ اردو میں اس کے نہ جانے کتنے افسانے اخذ و ترجمہ ہو کر آئے ہیں۔ موپاساں کے افسانوں کے دو مجموعے آج بھی آسانی سے دستیاب ہو جاتے ہیں۔ افسانوی ادب کے مشہور مترجم منشی تیرتھ رام فیروزپوری نے موپاساں کے تیرہ افسانوں کا مجموعہ رنگین افسانے کے نام سے شائع کیا۔ جس کے کم از کم دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ دوسرا مجموعہ موپاساں کے افسانے کے نام سے سید نصیر حیدر نے مرتب کیا۔ اس کا دوسرا اڈیشن ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں بھی گیارہ افسانے ہیں۔ ان دونوں مجموعوں میں مختلف افسانے ہیں۔ فرانسیسی افسانوں کا ایک مجموعہ حیدرآباد سے بھی شائع ہوا۔ جس کی ترتیب میں اردو کے مشہور افسانہ نویس اور ادیب عزیز احمد نے حصہ لیا تھا۔ یہ مجموعہ اس اہم سلسلہ کی ایک کڑی تھا۔ جو دنیا کے

شاہکار افسانے کے نام سے شائع ہونا شروع ہوا تھا جس کے چودہ مجموعوں میں سے چند ہی مجموعہ شائع ہو سکے۔ اگر یہ مجموعہ مرتب ہو گئے ہوتے تو دنیا کے ہر اہم ادب کی نمائندگی ہو جاتی۔ اس سلسلے کے مدیر عمومی پروفیسر عبدالقادر سروری تھے جو مجموعے شائع ہوئے تھے ان کے نام یہ ہیں۔ قدیم افسانے، انگریزی افسانے، فرانسیسی افسانے چینی اور جاپانی افسانے، ممکن ہے بعض اور مجموعہ بھی شائع ہوتے ہوں لیکن وہ میری نظر سے نہیں گذرے۔

انگریزی افسانوں کے ترجمے بھی برابر ہوتے رہے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ انگریزی کے ہی توسط سے دوسری مغربی زبانوں سے شناسائی ہوئی لیکن پھر بھی انگریزی افسانہ نویسی سے کبھی اردو افسانہ نگار اس قدر متاثر نہیں ہوئے جتنا روسی، فرانسیسی اور چینی سے ہوئے ہیں۔ پھر بھی ایک مجموعہ "انگریزی افسانے" جس کا ذکر ابھی ہو ا تھا، حیدرآباد سے شائع ہو چکا ہے۔ اس میں گولڈ اسمتھ، اسکاٹ ایڈیسن کے علاوہ ڈکنس، ہارڈی، اسٹی ونسن، آسکر وائلڈ، کیلنگ، ایچ۔ جی۔ ویلز، کیتھرائن فیس فیلڈ کے افسانے شامل ہیں۔ ایڈگر ایلن پو، جسے بعض نقاد افسانہ نگاری کا بانی کہتے ہیں اردو ادب میں پسند کیا جاتا ہے اور اسی کے افسانوں کا ترجمہ ابن انشا نے کیا ہے۔ واشنگٹن ارونگ کے افسانوں کا ترجمہ الحمرا کے افسانے کے نام سے حامد علی خاں نے کیا تھا۔ انھوں نے اور بہت سے یورپی افسانوں کا ترجمہ شائع کیا۔ کیلنگ کو ظفر علی خاں نے اردو کا جامہ پہنایا۔ ڈکنس کی بارہ کہانیوں کا مجموعہ "ارغوان راز" کے نام سے شائع ہوا۔ گالزوردی کے طویل مختصر افسانے "سیب کا درخت" کے دو ترجمے ہو چکے ہیں اور دونوں اردو کے دو اہم ادیبوں پطرس

اور قاضی عبدالغفار نے کئے ہیں ۔ انگریزی افسانہ نویسوں میں سامرسیٹ مام
اوہنری اور کیتھرائن منیسفیلڈ بھی ترجمہ کے لئے مخصوص ہیں ۔ یورپ کی زبانوں میں جرمنی
ہسپانوی، پولش افسانوں کے ترجمے بھی ملتے ہیں لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں ۔

ایشیا کی زبانوں میں بعض ایسی زبانیں ہیں جن سے اردو کا تعلق بہت قدیم اور
گہرا ہے لیکن کیونکہ ان میں مختصر افسانہ خود بہت بعد میں پیدا ہوا اس لئے وہاں سے
ترجمہ کا سلسلہ بھی دیر میں شروع ہوا مثلاً عربی سے جو ترجمے ہوئے ہیں وہ حال ہی میں
ہوئے ہیں ۔ عربی مصنفوں میں مصطفیٰ المنفلوطی اور خلیل جبران کے ناولوں اور
افسانوں کے متعدد ترجمے اردو میں موجود ہیں " سرخ کتاب " کے نام سے ضیاء الحسن
نے چند عربی افسانوں کا ترجمہ حال ہی میں کیا ہے فارسی اور اردو کا گہرا ادبی رشتہ ہے ۔
حامد حسن قادری نے " ایرانی افسانے " کے نام سے چند فارسی افسانوں کا ترجمہ شائع
کیا ۔ غیب الرحمٰن نے جمال زادہ کے کئے فارسی افسانوں کو اردو کا جامہ پہنایا ہے ۔
ترکی سے ترجموں کی ابتدا سجاد حیدر یلدرم نے کی تھی وہ اب بھی جاری ہے ۔ نامق
کمال اور خالدہ ادیب خانم کے کئے افسانے اردو میں مل جاتے ہیں ۔

پہلے پہل جدید چینی افسانوں سے ہندوستان اس مجموعہ سے متاثر ہوا جو
LIVING OF CHINA کے نام سے شائع ہوا ۔ تمنائی نے اس مجموعہ
کے کئی افسانوں کا ترجمہ اردو میں کیا اور اسے " زندہ چین " کے نام سے شائع کیا ۔ چین
کے متعلق پرل بک کی بعض کہانیوں کے ترجمے بھی ہوئے تھے لیکن زیادہ دلچسپی خود
چینی افسانہ نویسوں سے لی گئی ۔ الگ الگ افسانوں کے ترجموں کے علاوہ ظ ۔
انصاری نے چین کی پانچ نمائندہ کہانیوں کا مجموعہ " چین کی بہترین کہانیاں " کے نام

سے شائع کیا۔ چین کے لیہ سون کو چینی پریم چند کہا جاتا ہے۔ اس کی متعدد کہانیاں اردو میں ملتی ہیں۔ لیہ سون کے علاوہ لوتا فو، ماؤ تون یہو سنگ لنگ لاؤ شِن، لیو تونگ لنگ وغیرہ کی بہت سی کہانیوں کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ کچھ جاپانی افسانوں کے ترجمے بھی ہوئے ہیں چنانچہ ایک مجموعہ چینی اور جاپانی افسانے کا شائع ہو چکا ہے جسے راحت بی۔ اے نے مرتب کیا تھا۔ کتابوں کی شکل میں تو نہیں لیکن رسائل میں انڈونیشیا اور کوریا کے افسانوں کے ترجمے بھی چھپتے رہے ہیں۔

اس بات چیت میں محض چند نام گنائے جا سکتے ہیں اور اس میں ابھی ہندوستان کی ان متعدد زبانوں کا ذکر نہیں کیا گیا ہے جن سے براہ راست اردو کا تعلق ہے۔ ہندی، بنگالی، گجراتی، مرہٹی، پنجابی، کشمیری، تامل، تلگو، کنڑی، ملیالم ہر زبان کے پاس مختصر افسانوں کا ذخیرہ موجود ہے۔ ابھی اردو میں ایسے کم لوگ ہیں جو ہندی کے علاوہ دوسری ہندوستانی زبانوں سے براہ راست ترجمہ کر سکیں پھر بھی ان تمام زبانوں کے افسانے اردو میں آہستہ آہستہ منتقل ہو رہے ہیں اور بعض اس کا خاص اہتمام کرتے ہیں کہ وہ ان ترجموں کو شائع کر سکیں۔ ٹیگور کے تقریباً تمام افسانے اردو میں بھی مل جاتے ہیں۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں بنگلور کے رسالہ نیا دور نے اپنا بنگالی افسانہ نمبر شائع کیا جس میں ٹیگور کے بعد کے افسانہ نگار لئے گئے تھے اور بنگال کے بارہ نمائندہ افسانے اس میں شامل تھے۔ کرشن چندر نے نئے افسانے کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس میں ہندوستان کی مختلف زبانوں کے نمائندہ افسانے منتخب کئے تھے۔ اس طرح اردو میں دوسری زبانوں کے مختصر افسانوں کا بڑا ذخیرہ موجود ہے لیکن سب کو دیکھنے کے بعد اس بات کا احساس ضرور ہوتا ہے کہ یہ کام اور زیادہ نظم اور سلیقہ کے ساتھ ہونا چاہئے۔

میر حسن

اردو زبان میں وضع اصطلاحات کے مسائل

اب جب کہ اردو کی فطری ترقی کی راہ سے رکاوٹیں دور ہو رہی ہیں ملک کی مختلف ریاستوں میں مرکزی ایما پر اردو کی تعلیم اور اس کے علم و ادب کی نگہداشت اور توسیع کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں، اس زبان میں جدید سائنس اور علوم عمرانی سے متعلقہ معلومات کے ذخیرے میں اضافے کے لئے وسائل مہیا کئے جا رہے ہیں، مختلف مدارج کی درسی اور غیر درسی کتابیں تالیف و ترجے کے ذریعہ مرتب کی جا رہی ہیں، نئے خیالات اور تصورات کے لئے موزوں الفاظ تلاش کرنے اور بنانے ہوں گے اور حسب ضرورت وضع اصطلاحات کے کام کو آگے بڑھانا ہو گا۔

یہ امر موجب طمانیت ہے کہ ترقی اردو بورڈ کے تحت اصطلاح سازی کا کام باضابطہ طور پر اور بڑے پیمانے پر شروع ہو چکا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ ضروری ہے کہ اصطلاح سازی کا جو کام پہلے ہندوستان کے مختلف حصوں

ہو چکا ہو اس پر نظر رکھی جائے۔ اور اس سے مناسب حد تک استفادہ کیا جائے۔

سائنس اور دوسرے کارآمد مغربی علوم کی کتابوں کے اردو میں ترجمے کا کام آج سے کوئی پونے دو سو سال قبل ہی شروع ہو چکا تھا اور اس طویل مدت میں مختلف عمرانی علوم اور سائنس کی جو کتابیں اردو میں ترجمے کے ذریعے داخل ہو چکی ہیں ان کی تعداد اس قدر کثیر ہے کہ اگر صرف ان کے نام گنائے جائیں تو ایک ضخیم رسالہ تیار ہو جائے۔

سائنس کے موضوع پر قدیم ترین تراجم میں "بحرِ حکمت" مولفہ پادری کرنس شامل ہے۔ جس کا سن ترجمہ ۱۷۹۸ء ہے اس میں "اسٹیم" یعنی "بھاپ" سے بحث کی گئی ہے اور اس کے کارآمد خواص پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسٹیم کے لئے "دخان" کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ اس میں استعمال شدہ چند اصطلاحیں "نقطہ جوش" "نقطۂ جوشِ آب" "نقطہ انجماد" وغیرہ ہیں۔ "فیدڑ" کے لئے "ارزق" اور "تھرما میٹر" کیلئے "تابدرجہ نما" کی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں ۱۸۱۱ء میں کپتان ٹامس روبک نے لغت جہاز رانی شائع کی جس میں جہاز رانی کی اصطلاحوں کے علاوہ ایسے الفاظ کا اردو ترجمہ بھی کیا گیا ہے جو کمانداروں کے لئے میدانِ جنگ اور بارکوں میں کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ انگریزی سے اردو ترجمے کے سلسلہ میں فورٹ ولیم کالج کے ارباب کا کام زیادہ تر انگریزی اردو لغات کی اشاعت تک محدود رہا۔ اس زمانے میں اردو ترجمے کا دوسرا اہم مرکز حیدرآباد دکن تھا امیر کبیر نواب فخرالدین خاں شمس الامرا نے مدارس اور رصدگاہ جہاں نما کے علاوہ ایک دارالترجمہ بھی ۱۸۳۴ء میں قائم کیا تھا جس کی کتابیں ان کے سنگی چھاپے خانے میں چھپتی تھیں۔ اردو میں مغربی علوم

کی کتابوں کے تراجم اور تدریس کی ایسی منظم انفرادی کوشش شاید ہی کسی اور نے
کی ہوگی۔ شمس الامراء کے سررشتہ تالیف و ترجمہ سے شائع شدہ حسب ذیل کتابوں
میں سے چند کتابیں حیدرآباد کے کتب خانوں میں دستیاب ہیں "ستہ شمسیہ" جو رسالہ
علم جر ثقیل، رسالہ علم ہیئت، رسالہ علم ادب، رسالہ علم ہوا، رسالہ علم انظار پر مشتمل ہے۔
اور جس کے آخر میں علم مقناطیس پر مقالہ بھی شامل ہے۔ شمس الامرا کی دوسری کتابیں
کیمسٹری کا مختصر رسالہ، رسالہ مفتاح الافلاک، رسالہ مختصر حیوانات مطلق، منتخب المبصر
(دوربین نما) ہیں ان میں مرکز میں ایسڈ (ACID) کا ترجمہ، کھٹّا اور نائٹرک ایسڈ
(NITRIC ACID) کا ترجمہ شورے کا کھٹّا، ہیدروسٹاٹکس
(HYDROSTATICS) اور آپٹکس (OPTICS) کے لئے علم آب
اور علم انظار کی اصطلاحیں وضع کی گئی تھیں جس کے لئے نوابان اودھ کے
دارالترجمے کے اراکین غلام محی الدین حیدرآبادی، میر امان دہلوی، مسٹر جونس،
موسیو تند دیسی، رتن لال اور مسٹر جوزف تھے۔ بعض انگریزی اصطلاحوں کیلئے
الفاظ اردو میں نہیں ملے تو ان کو ان کی اصل شکل میں برقرار رکھا گیا ہے۔
شمس الامراء کے دارالترجمہ کی وضع کردہ چند اصطلاحیں یہ ہیں:

چوستے کا پمپ	STCKING PUMP
زبردستی کا پمپ	FORCE PUMP
کلاں بیں	MICROSCOPE
موسمی پون	MONSOON
منعکس دوربین	REFLECTING TELESCOPE

متوازی شعاعیں	PARALLEL RAYS
انقباضی شعاعیں	CONVERGENT RAYS
انبساطی شعاعیں	DIVERGENT RAYS
موصل	CONDUCTOR

'تبدیلی پون'، 'آر تحلیل'، 'مذی پون' جیسے الفاظ اور اصطلاحیں بھی استعمال کی گئی ہیں۔ چند کتابوں کے شروع میں اصطلاحات کی فہرست دی گئی ہے جنمیں سے چند اصطلاحیں حسب ذیل ہیں۔

گندھک کا کھٹا	SULPHURIC ACID
کھانے نمک کا کھٹا	MURAIC ACID
ہلدی کے پتے کے رس میں بھیگا ہوا کاغذ	TUBMERIC PAPER
سنتھیسس	SYMTHESIS
اینلیسس	ANALYSIS
تھرمامیٹر	THERMOMETER
بونامیٹر	BANOMETER

جیسی بعض انگریزی اصطلاحیں بجنسہٖ استعمال کی گئی ہیں۔ اور بعض کا مطلب سمجھایا گیا ہے۔

اس عہد میں اردو ترجمے کا کام لکھنؤ میں بھی ہوا شاہان اودھ نے مغربی علوم وفنون کی بعض کتابوں کا ترجمہ کروایا جو مطبع سلطانی میں چھپ کر شائع ہوئیں۔ سید کمال الدین حیدر نے مغربی علوم کے ۹ رسالوں کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کیا جس میں رسالۂ ہیئت۔ رسالۂ علم الہوا، رسالۂ علم الحرارت شامل ہیں۔

انیسویں صدی کے اواسط میں مغربی تصانیف کے اردو تراجم کا ایک اہم دور شروع ہوا۔ اس دور سے قبل کی کوششیں اس درجہ منظّم اور وسیع پیمانے پر نہیں تھیں جتنی کہ دہلی کالج کی تھیں۔ اس کلیہ کے ارباب علم نے جس میں رامچندر بھی شامل تھے ——— ترجمے کی مشکلات کو حل کرنے کے لئے بعض اصول پہلی مرتبہ مرتب کئے جو یہ تھے کہ مترادف اردو میں نہ ملے تو اصل لفظ استعمال کیا جائے۔ اردو لفظ ملے تو وہی استعمال کیا جائے۔ سائنس کی کتابوں کا ترجمہ چونکہ انگریزی سے کیا جائے گا اس لئے انگریزی الفاظ کا اردو میں استعمال ناگزیر ہے۔ انگریزی جملے میں اگر کسی ایسے واقعہ کی طرف اشارہ ہو جس سے اہل ہند ناواقف ہوں تو مترجم کو چاہئے کہ حاشیے یا متن میں مختصر طور پر اسکی تشریح کر دے۔ ترجمہ لفظی نہ ہو بلکہ اردو میں مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔ دہلی کالج کے مترجمین نے علم ہیئت، کیمسٹری، پولٹیکل اکانومی، قانونِ مال، میکانیات، تاریخ عالم، جغرافیہ طبعی، مقناطیس، جرّاحی، حرکیات و سکونیات، علم المناظر، حرارت، ہیڈروسٹاٹکس علم برق اور طب سے متعلق کوئی تیس کتابوں کا ترجمہ شائع کیا۔ رسالہ مقناطیس میں جو اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:-

قوت ور مقناطیس	STRONG MAGNET
مقناطیس کرنا	TO MAGNETISE
غرق و انحراف	DIP AND INCLINATION
جذب و اندفاع	ATTRACTION ANDREPULSION
ریشہ	FIBRE

تجربہ — EXPERIMENT

اس رسالے میں بیشتر اصطلاحات کا ترجمہ درج کیا گیا ہے۔ صرف معدودے چند انگریزی الفاظ الیکٹریسٹی، کمپاس وغیرہ بجنسہٖ مستعمل ہوتے ہیں۔

سر سید کی سائنٹفک سوسائٹی قائم شدہ ۱۸۶۳ء کو مغربی علوم اور سائنس کے تراجم اور اصطلاح سازی کے اعتبار سے کافی اہمیت حاصل ہے۔ اس سوسائٹی نے چھوٹی بڑی تقریباً چالیس کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کروائیں۔ اس کی مطبوعات زیادہ تر تاریخ، سوانح، جغرافیہ، سیاسیات اور معاشیات پر مشتمل ہیں۔ سوسائٹی نے اصطلاحات کے ترجمے میں سلیقے کا ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس کی وضع کردہ بعض اصطلاحیں یا تو اپنی اصلی حالت میں یا تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اردو میں مستقل طور پر داخل ہو گئیں۔" رسالہ "انتظام مدن" پولیٹیکل اکانومی POLITICAL ECONOMY کا ترجمہ ہے۔ ایلیمنٹس آف پولیٹیکل اکانومی (ELEMENTS OF POLITICAL ECONOMY) کا ترجمہ اس سوسائٹی کی جانب سے شائع ہوا اس کا نام "اصول سیاست مدن" ہے۔ اس مرکز میں وضع شدہ چند اصطلاحیں حسب ذیل ہیں:

FACTORS OF PRODUCTION	لوازم پیدائش
PRODUCTION	پیدائش یا صنعت کاری
CONSUMPTION	صرف
EXCHANGE	مبادلہ
PRODUCTION LABOUR	پیدا کرنے والی محنت
UNPRODUCTIVE LABOUR	غیر پیدا کرنے والی محنت

CAPITAL	راس المال
CO-OPERATION	عمل بہ اتفاق
NECESSITIES	اشیائے احتیاجات
LUXURIES	سامان عیش وکامرانی

اردو میں جدید علوم عمرانی اور سائنس کی کتابوں کے ترجمے کا وسیع پیمانے پر ضروری اہتمام کے ساتھ انتظام جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ میں کیا گیا۔ جامعہ عثمانیہ کی جنرل کمیٹی نے جس میں زبان اور علم کا صحیح مذاق اور مہارت رکھنے والے بزرگ شامل تھے یہ اہم مسئلہ کثرتِ رائے سے طے کر دیا تھا کہ انگریزی اصطلاحیں بجنسہٖ یا کسی تغیر وتبدل کے ساتھ اردو زبان میں نہ لی جائیں بلکہ انگریزی اصطلاحوں کے مقابلے میں اردو اصطلاحیں وضع کی جائیں۔ کمیٹی نے یہ بھی طے کیا تھا کہ جو علمی اصطلاحیں وضع کی جائیں ان کے لئے الفاظ عربی، فارسی اور ہندی سے بے تکلف لئے جائیں۔ ان ہدایات کی روشنی میں جامعہ کے ماہرین نے اصطلاح سازی کے لئے کئی راہیں نکال لیں اور پروفیسر وحید الدین سلیم پانی پتی نے محنت وکاوش سے وضع اصطلاحات کے اصول مرتب کئے۔ نئے الفاظ کی تلاش ووضع اصطلاحات کے اغراض کے لئے اردو کے ذخیرۂ الفاظ کا جائزہ لیا گیا۔ مفرد اور مرکب الفاظ اور تراکیب کی ساخت اور مشتقات کے اصولوں کی جانچ کی گئی حسب ضرورت دوسری زبانوں کے الفاظ کا استعمال جائز قرار پایا۔ لیکن شرط یہ تھی کہ فارسی، عربی یا ہندی جس زبان سے بھی مادہ لیا جائے وہ اردو میں آنے کے بعد اردو ہو جائے گا۔ اور اس پر اردو قواعد کی چھاپ لگ جائے گی۔ اپنی عہد آفریں تالیف "وضع اصطلاحات"

میں پروفیسر وحیدالدین سلیم نے اصطلاح سازی کے اصول، امکانات اور دشواریوں پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ وضع اصطلاحات کے میدان کو وسیع کرنے کے لئے اس امر کو پیش رکھنا ضروری ہے کہ بنیادی الفاظ اور دوسری خصوصیات کے اعتبار سے اردو کا تعلق سنسکرت، ہندی فارسی کی طرح آریائی خاندان السنہ سے ہے اور اس خاندان السنہ سے تعلق کی بنا پر اس کا رشتہ انگریزی اور بعض دوسری مغربی زبانوں سے بھی جا ملتا ہے۔ نئے خیالات اور الفاظ کی تلاش اولاً خود اردو ادب میں کی جانی چاہئے۔ یہ داخلی جائزہ مفید ثابت ہو سکتا ہے اور ممکن ہے موزوں الفاظ نئے خیالات اور اصطلاحوں کے لئے مل جائیں۔ دکنی ادب اور قدیم اردو ادب ہندی سے قریب تر تھا جس میں سنسکرت کے الفاظ بھی مروج تھے اور مذہب اور اخلاق سے متعلق ہندی اصطلاحیں اولیاء اللہ کی تحریروں میں بھی ملتی ہیں۔ یہ الفاظ بعد میں متروک ہو گئے مگر اب بہ شرط موزونیت انھیں پھر سے رائج کیا جا سکتا ہے کیونکہ اردو کو آزاد ہندوستان میں ملک کی دوسری زبانوں کے دوش بدوش آگے بڑھنا ہے۔ پروفیسر سلیم اردو ان کے ہم نوا ہندی سے استفادہ کے حامی تھے اس بارے میں "وضع اصطلاحات" میں موصوف نے لکھا ہے۔

"اردو کے لئے ہندی بمنزلہ زمین کے ہے اس زمین پر فارسی اور عربی کے پودے لگائے گئے ہیں اسی تختے پر غیر زبانوں نے آکر گل کاری کی ہے اگر یہ زمین نکال دی جائے تو پھر اردو کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہے گا۔ ہندی کو ہم اپنی زبان کے لئے "ام اللسان" اور "ہیولائے دل" کہہ سکتے ہیں اس کے بغیر ہماری زبان کی کوئی ہستی نہیں رہتی ہے۔ اس کی مدد کے بغیر ہم ایک جملہ بھی نہیں بول

سکتے۔"

یہ خیال درست ہے اور وضع اصطلاحات میں اس کو رہنما بنایا جا سکتا ہے "وضع اصطلاحات" میں اردو کے مفرد الفاظ، مرکبات، تراکیب اور مشتقات کا جائزہ لیا گیا ہے اور الفاظ کی ساخت کے اعتبار سے آریائی زبانوں کے مشترکہ اصولوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اردو میں مرکب امتزاجی اور مرکب ارتباطی کی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ جن کے نمونے پر نئی اصطلاحیں وضع کی جا سکتی ہیں۔ آریائی زبانوں کا مشترک اصول، سابقوں، لاحقوں، نیم سابقوں اور نیم لاحقوں کا استعمال ہے۔ جو مادّے کے آگے پیچھے اضافہ کئے جاتے ہیں اور جن کی بدولت نئے مفاہیم پیدا ہوتے ہیں۔ پروفیسر سلیم نے عملاً ثابت کر دکھایا ہے کہ اس اصول کے تحت فارسی، عربی اور ہندی کے مادّوں کو استعمال کر کے بے شمار تراکیب اور اصطلاحات وضع کی جا سکتی ہیں مثال کے طور پر موصوف نے صرف ایک لفظ " برق " کے ساتھ سابقوں، لاحقوں نیم سابقوں، نیم لاحقوں کا اضافہ کر کے (۳۰۰) سے زیادہ تراکیب اور اصطلاحات بنا ڈالیں۔ ایک اور اصول جو آریائی زبانوں میں مشترک ہے یہ ہے کہ ضرورت کے مطابق ہر لفظ سے فعل بنا لیا جائے جیسے انگریزی میں (NATION) سے (NATIONALISE) (NATURE) سے (NATURALISE)

اسی طرح اردو میں " قوم " سے " قومانا " یا " قومیانہ "، " برق " سے " برقانہ "، " اردو " سے " اردوانا "، " ہندی " سے " ہندیانہ "، " مقناطیس " سے " مقنانا "، " ترشہ " سے " ترشانا "، " قلم " سے " قلمانا "، " مرکز " سے " مرکزانا "، " نمک " سے " نمکانا " جیسے افعال بنائے جا سکتے ہیں۔

دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے طریق کار کے بارے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ترجمہ طلب اصطلاحات کا انتخاب لغات یا گلاسری سے نہیں کیا جاتا تھا جامعہ کی نصابی مجلسیں اپنی اپنی ضروریات کی کتابوں کا انتخاب کرتی تھیں جو ترجمے کے لئے دارالترجمہ روانہ کی جاتی تھیں۔ ترجمے کے دوران مترجمین ایسے الفاظ اور اصطلاحات کی فہرستیں متعلقہ مجالس وضع اصطلاحات میں بھیجتے تھے جن کے مترادفات انھیں اردو میں نہ مل سکے ہوں مجالس وضع اصطلاحات کا کام جدید علوم کی ضروریات کے مطابق اردو میں علمی اور فنی موزوں اور زرخیز اصطلاحیں یعنی ایسی اصطلاحیں وضع کرنا تھا جن سے مشتقات نکل سکیں اور مجالس کے اراکین دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو اس علم کے ماہر ہوں جس کا ترجمہ زیر غور تھا۔ اور دوسرے ایسے علماء جو عربی فارسی اور اردو میں کامل دست گاہ رکھتے ہوں۔ ماہرین زبان کی حیثیت سے مجالس وضع اصطلاحات میں شرکت کرنے والوں میں نواب حضور جنگ نظم طباطبائیؒ، علامہ عبداللہ عمادی، مولوی عبدالحق، مولانا عبدالہادی ندوی، وحیدالدین سلیم پانی پتی اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور شامل تھے اصطلاحات کی صحت وسقم اور اردو کے لئے ان کے قابل قبول ہونے یا نہ ہونے کا اندازہ کالج کی جماعتوں میں تدریس کے دوران ایک حد تک ہو جاتا تھا۔

اصطلاح باہمی قرارداد اور آپس کی مفاہمت کا نتیجہ ہوتی ہے اور اسی لحاظ سے کسی لفظ یا ترکیب کے جو معنی مقرر کئے جائیں ذہنی متعلقہ گروہ میں سمجھے جائیں گے۔ اور یہ ضروری نہیں کہ اصطلاحی لفظ یا ترکیب میں متعلقہ تمام مفہوم موجود ہو۔ کل کے لئے جزو کے اصول کے تحت اس خاص علم سے متعلق رکھنے والوں کے لئے خفیف

سا اشارہ کافی ہو سکتا ہے۔ اصطلاح کی ضرورت یوں پیش آتی ہے کہ اگر اصطلاحیں جو خیالات کے مجموعے کی جانب رہبری کرتی ہیں استعمال نہ کی جائیں تو مطالب کے اظہار میں طوالت سے بچا نہیں جا سکتا۔ اسکی ایک مثال شمس الامراء کے دار الترجمے کی کتاب "رسالہ کیمیا" میں ملتی ہے جسکا ذکر اوپر آ چکا ہے اور جس میں ٹرمرک پیپر کا ترجمہ نہیں کیا گیا بلکہ مطلب سمجھانے کیلئے "ہلدی کے پتّے کے رس میں بھیگا ہوا کاغذ لکھا گیا ہے۔ یہ اصطلاح متن میں بار بار آتی ہے اور ہر جگہ ہلدی کے پتّے کے رس میں بھگایا ہوا کاغذ لکھا گیا ہے۔ اس طول لاطائل سے بچنے کے لئے اصطلاح سازی ضروری ہے۔ تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ ناموزوں اور بے ضرورت اصطلاحیں مفقود ہو جاتی ہیں جیسے آکسیجن (OXYGEN) کا ترجمہ مائین ہائیڈروجن (HYDROGEN) کا ترجمہ حمضین مقبول نہیں ہوا۔ ان ناموں کے ترجمے کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں یہ نام بجنسہٖ مستعمل ہیں اصطلاح اور معمولی طرزِ اظہار میں فرق بھی ضروری ہے۔ مثال کے طور پر پچھلے صفحات میں اصطلاحات کا جو ترجمہ درج کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض صحیح معنے میں اصطلاحیں نہیں ہیں اور اُن سے مشتقات بھی نہیں نکل سکتے جیسے "پیدا کرنے والی محنت" "غیر پیدا کرنے والی محنت" اور اب انکی بجائے "محنتِ پیدا آور" اور "محنت غیر پیدا آور" کی اصطلاحیں مروّج ہیں۔ "پولیٹیکل اکانومی (POLITICAL ECONOMY) کا ترجمہ ابتداً علمِ انتظام مدن" کیا گیا پھر اس کے لئے "علم سیاست مدن" "علم الاقتصاد" اور "اقتصادیات" کی اصطلاحیں بنیں۔ اور بالآخر "معاشیات" کی اصطلاح مقبول ہوئی ایسڈ (ACID) ترجمہ بھی ارتقا کی منزلیں طے کر کے کھٹّے سے تُرشہ اور بالآخر تیزاب بن گیا۔ تھرمامیٹر (THERMOMETER) کا ترجمہ ابتدا میں

تابدرجتھا اس کے بعد "مقیاس الحرارت" ہوا پھر "حرارت پیما" اور بالآخر "تپش پیما" لیکن تھرمامیٹر اپنی اصلی شکل میں زیادہ قابل قبول ثابت ہوا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے ۔ کہ چیزوں کے نام کا ترجمہ ضروری نہیں جب تک یہ نام اردو کے لئے قطعاً ناقابل قبول نہ ہوں اور کثیر یونٹ کے ساتھ زبان پر رواں نہ ہو سکتے ہوں ۔ اس سلسلے میں ٹرمرک پیپر کا ترجمہ بھی قابل ذکر ہے جو ابتدا میں "ہلدی کے پتے کے رس میں بھگایا ہوا کاغذ" کیا گیا ۔ پھر "ہلدی رس کاغذ" ہوا ۔ اور بالآخر جامعہ عثمانیہ میں "ہلدی کا غذ" ہو گیا ۔

غرض وضع اصطلاحات سے متعلقہ مسائل بہت سے ہیں ۔لیکن ہندی فارسی عربی جس زبان سے بھی موزوں مفید اور گوش آشنا مادہ مل سکے لیا جاسکتا ہے دقت زیادہ تر دو یا دو سے زیادہ لفظوں کے باہمی ربط کے معاملے میں پیش آتی ہے ۔ضرورت ہے کہ ہندی اور دوسری آریائی زبانوں اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مانوس اور موزوں الفاظ کے ساتھ عربی فارسی جوڑ جائز سمجھا جائے ان الفاظ کے ساتھ عربی ، فارسی سابقے اور لاحقے بے تکلف استعمال کئے جائیں جس کی مثالیں اردو میں موجود ہیں ۔ جیسے سمجھدار ، بے کل ، بے چین اگالدان وغیرہ ۔ جو اصطلاحیں مروج ہیں ان کو برقرار رکھنے کا اہتمام بھی ضروری ہے کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو اس وقت تک جو کتابیں شائع ہو چکی ہیں وہ بے کار ہو جائیں گی ۔ ان سب سے پیشتر اصطلاحات کا پتہ دوسرے ذرائع کے علاوہ دارالترجمہ کی مطبوعات " فرہنگ اصطلاحات علمیہ" اور اصطلاحات پیشہ وراں" کے علاوہ جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل ماہرین سائنس عمرانیات

کی اردو تالیفات کی مدد سے چلایا جا سکتا ہے۔

موجودہ مرحلۂ اصطلاح سازی میں اگر یہ امر بھی ملحوظ رہے تو مناسب ہوگا کہ جو مادّے منتخب کئے جائیں وہ ممکنہ تک ہندوستان کی زبانوں اور خصوصاً آریائی زبانوں میں مشترک ہوں۔ اگر اس سمت میں سلیقے کے ساتھ قدم اٹھایا گیا تو زبانوں کی گوناگونی کے باوجود اصطلاحات کے کُل ہند رُوپ کے لیے بنیادیں استوار ہو سکیں گی۔

رب لامکاں کا صد شکر ہے کہ اس نے ہمیں توفیق دی کہ ہم اردو ادب کی کتب کو سافٹ میں تبدیل کر سکے۔ اسی صورت میں یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ مزید اس طرح کی عمدہ کتب حاصل کرنے کے لئے ہمارے گروپ میں شمولیت اختیار کریں۔

انتظامیہ برقی کتب

گروپ میں شمولیت کے لئے:

محمد ذوالقرنین حیدر: 3123050300-92+

اسکالر سدرہ طاہر صاحبہ: 0120123 334 -92+

ڈاکٹر اصغر عباس

سرسیّد کی سائنٹفک سوسائٹی کے تراجم

سرسید کے مصلحانہ کارناموں کا حرف آغاز سائنٹفک سوسائٹی ہے شمالی ہند میں انیسویں صدی کے نصف آخر پر اس علمی اور سیکولر انجمن کی پرچھائیں اتنی لمبی ہے کہ غالباً کسی اور انجمن کی نہیں۔ اس انجمن کے قیام سے یہاں سوچ اور اظہار کے نئے اسالیب اور عمل کے نئے طریقوں کا در باز ہوا ہے۔ یہی سوسائٹی تھی جس نے مغرب سے لائی ہوئی برکتوں سے ہم آہنگ کرنے اور خاص طور پر شمالی ہند میں ایک تہذیبی نشاۃ ثانیہ کو بروئے کار لانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ سائنٹفک سوسائٹی کی تاسیس سے قبل شمالی ہند میں اس نوع کی علمی انجمنوں کی تشکیل ہوئی وہ انگریزوں کی یا ان کے زیر اثر قائم ہوتی تھیں اسی لئے عام طور پر ہندوستانی انھیں مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ اگر ان کی سرگرمیوں میں حصہ لیا گیا تو عیسائی ہو جانا ناگزیر ہے۔ اس کے علاوہ بنگالی دانشوروں کی قائم کردہ انجمنوں کا طریقہ کار سیکولر نہیں تھا اور محدود اپیل رکھتا تھا اس لحاظ سے شمالی

ہند میں سائنٹفک سوسائٹی پہلی انجمن تھی جو اپنے معنی اور مقاصد کے لحاظ سے سیکولر اور ہمہ گیر پروگرام رکھتی تھی یہی وہ انجمن تھی جہاں ہندو مسلمان اور انگریز ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر دوبدو ہوئے اور اس کے ذریعہ باہمی افہام وتفہیم کی فضا سازگار ہوئی۔ اس ادارہ کا بڑا کارنامہ اردو میں انگریزی کی علمی کتابوں کے تراجم کو رواج دینا اور ایک نیا علمی اور عقلی انداز نظر پیدا کرنا تھا۔

سائنٹفک سوسائٹی کا پہلا جلسہ ۹ جنوری ۱۸۶۴ء کو غازی پور میں ہوا۔ لیکن ۱۸۶۳ء ہی میں سرسید ایک تحریر "التماس بخدمت ساکنان ہندوستان درباب ترقی تعلیم اہل ہند" کے ذریعہ تعلیم کے مسئلہ پر غور کرنے کی دعوت دے چکے تھے۔ انھوں نے ساکنان ہندوستان سے کہا۔

"دنیا کے اس دور میں جس میں ہم اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں ملک کے دور کا وہ زمانہ ہے کہ جب ہم اس پر بہ لحاظ مضمون تعلیم کے لحاظ کرتے ہیں تو اس کو چمکتا ہوا نہیں پاتے۔"

تعلیم کا مسئلہ شمالی ہند میں ہندوستان کے دوسرے حصوں سے زیادہ پیچیدہ تھا۔ یہاں دہلی کالج کو مجہلہ قرار دے دیا گیا تھا۔ اور خاص طور پر سرسید کے ہم کیش تیار نہیں تھے! ورنہ پسماندگی قومی زندگی کا ایک افسوسناک باب بنتی جارہی تھی۔ اس صورت حال سے نکالنے کے لئے محولا بالا تحریر میں سرسید نے یہ حل پیش کیا:

"ایسی بدبخت حالت کے علاج کی راہ نکالنی اور ہمارے ہم وطنوں ہندوؤں اور مسلم قوموں میں علم کے پھیلانے اور ترقی دینے کے لئے ایک سوسائٹی کا مقرر ہونا

تجویز ہوتا ہے جس کا مقصود یہ ہوگا اول تلاش کرنا اور چھاپنا ہمارے قدیم مصنفوں کی بہت عمدہ کتابوں کا دوسرے انگریزی زبان سے اور زبانوں سے ایسی کتابوں کا ترجمہ کرنا اور چھاپنا جو سب کے لئے مفید ہوں" دراصل یہی تحریر سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کا پیش خیمہ تھی۔

سوسائٹی کے پہلے جلسہ میں اس کا نام سائنٹفک سوسائٹی تجویز ہوا لیکن بعد میں سوسائٹی کے بعض ارکان اور ملک کے کچھ انگریزی اخبارات نے اعتراض کرنا شروع کر دیا کہ یہ سوسائٹی نام بڑے اور درشن چھوٹے کے مصداق ہے لہذا سرسید نے ۱۱ اپریل ۱۹۶۴ کے جلسہ میں تجویز پیش کی کہ انجمن بجائے سائنٹفک سوسائٹی

"Society for the Better Diffusion of Useful Knowledge"

سے موسوم کی جائے لیکن سوسائٹی کے ارکان کی بڑی تعداد نے اس تجویز کی تائید نہیں کی اور یہ فیصلہ کیا کہ سوسائٹی کا پہلا نام برقرار رہنا چاہئے اور سائنٹفک سوسائٹی کے اغراض و مقاصد یہ تھے۔

۱۔ "ان علوم اور فنون کی کتابوں کا جن کو انگریزی زبان میں یا یورپ کی کسی زبان میں ہونے کے سبب ہندوستانی نہیں سمجھ سکتے ایسی زبانوں میں ترجمہ کرنا جو ہندوستانیوں کے عام استعمال میں ہوں؛

۲۔ ایشیا کے قدیم مصنفوں کی کمیاب اور نفیس کتابوں کا تلاش کر کر بہم پہنچانا اور چھاپنا۔

سوسائٹی کو کسی مذہبی کتاب سے سروکار نہ ہوگا" سرسید کے کارناموں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ انھیں زمانہ اور حقیقت دونوں کا عرفان تھا قوم کی کمزوریوں اور خامیوں کی دھندلی اور روشن تصویریں ان کے سامنے تھیں تو

دوسری طرف انگریزی اقتدار کا بھاری جوا اور ان کے لائے ہوئے علوم وفنون کی بڑھتی ہوئی طاقت بھی تھی ان کی نگاہوں میں تھا کہ ہندوستانیوں کو ازمنہ وسطیٰ کے سرد رازلی کے دلدل سے نکالنا اور انھیں یورپ کے عقلی تجزیئے کی خشکی میں لا کھڑا کرنا بغیر مغربی علوم کے استفادہ کے ممکن نہیں۔ سرسید کا یہ بھی خیال تھا کہ ہماری ہمہ جہت ترقی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک یہ کوششیں عوامی بنیادیں نہ رکھتی ہوں۔ اسی لئے انھوں نے ترجمہ کے کام کو اولین اہمیت دی کہ اس کے ذریعے بڑے پیمانے پر قوم کو ان حقائق اور محرکات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ جس نے یورپ کے لوگوں کو ایک حرکی اور فعال طاقت بنا دیا ہے۔ اس لئے سرسید نے سوسائٹی کے اشاعتی پروگرام کو اس طور پر ترتیب دیا کہ ایک طرف تو وہ اعلیٰ سطح پر مستند و معیاری کتابوں کے ترجمے پر توجہ کرے تو دوسری طرف جدید سائنس کے عملی نتائج سے بھی عوام کو روشناس کرائے۔ سرسیّد کا خیال تھا کہ: "اگر ہندوستان کو کتابی تعلیم سے فائدہ پہونچانا چاہیں تو وہ اس طرح پر ہو کہ جس طرح ہم اس کو اپنی سلطنت یا قوانین سے فائدہ پہونچاتے یعنی ہم کو لازم ہے کہ اکثروں تک رسائی کر کے کتابی علم کو شائع کریں اور اس رکاوٹ سے جس میں وہ پڑا ہے اس کو آزاد کریں اور اس سے اپنا اصلی ارادہ اور مقصد یہ ٹھہرائیں کہ ان مقصدوں مذکورہ بالا سے ہندوستانیوں کی حالت اصلی تبدیل ہو جاوے مناسب یہ ہے کہ علم کو ایسی شے ٹھہراؤ جس سے ہر روز فائدہ حاصل ہو اور اس کی تحصیل میں جہاں تک ممکن ہو آسانی ہو یہ سب میری خواہشیں اور اس لئے میں ملکی زبان کے ذریعہ کو علم پہونچانے کے لئے حد سے زیادہ ترجیح دیتا ہوں کیونکہ وہ آسان ہے اور جو علم اس کے ذریعہ سے پہونچایا جاتا ہے وہ عملی طور سے بہت

موثر ہوتا ہے اور اس کے وسیلے سے علم کثرت سے پھیلتا ہے۔"

غازی پور میں سرسید مغربی علوم کی اہم کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے اور اپنے مقاصد کی ترویج و اشاعت میں سرگرم تھے کہ اسی اثنا میں ان کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا تو سوسائٹی کا دفتر بھی علی گڑھ آ گیا۔ ۶ جون ۱۸۶۴ کی میٹنگ میں سوسائٹی کی علمی مجلس (جسے کونسل شیر کہتے تھے) کے ارکان کی کثرت رائے سے مندرجہ ذیل کتابوں کا ترجمہ اور تالیف بترتیب ذیل شروع کرنے کی تجویز ہوئی:

۱۔ ایک مختصر رسالہ بیان میں یورپ کے علوم و فنون کے جو بانڈ صاحب کے خزانہ علم میں سے تالیف کیا جاوے گا۔

۲۔ پہلا، دوسرا، تیسرا اور چوتھا باب آدم اسمتھ صاحب کی کتاب کا جو قوموں کی ترقی دولت کے بیان میں ہے۔

۳۔ تاریخ ہندوستان مؤلفہ الفنسٹن صاحب۔

۴۔ رسالہ بھاپ کے کلوں کے بیان میں مصنفہ ڈبلو۔ جے۔ ایم۔ کورین کا صاحب۔

۵۔ تاریخ جدید ہندوستان مؤلفہ مارشمین صاحب۔

۶۔ ایک اچھا بڑا نسخہ جغرافیہ کا جو کئی انگریزی جغرافیوں سے تالیف کیا جاوے۔

۷۔ رسالہ یورپ کے آلات کشت کاری کے بیان میں جو کئی انگریزی کتابوں سے تالیف کیا جاوے۔

۸۔ تاریخ چین زبان فارسی ترجمہ محمد زمان عرف فرنگی خاں اصل انگریزی مصنفہ ایک پادری صاحب کے جس میں بیان ہے چین کی صورت اور پیداواریوں اور علوم و

فنون اور مذہب اور رسومات سلطنت مورخہ چھٹی صدی۔

۹۔ ایک کتاب بطور فہرست کے جس میں عمدہ عمدہ مشرقی کتابوں کے نام ہوں گے اور مصنفوں کے نام اور تاریخ تصنیف اور نام زبان جس میں وہ کتاب ہو اور کچھ اس کے مضمون سے اور ان لوگوں کے نام جن کے کتب خانہ میں وہ ہوں۔

۱۰۔ رسالہ اثر کہربائی جس میں عملی اور علمی دونوں مذکور ہیں معہ بہت سی تصویروں کے مصنفہ بسیکول صاحب۔

۱۱۔ رسالہ جیالوجی یعنی اس علم کا جس میں انقلابات زمین کا بیان ہے معہ بہت سی تصویروں کے مصنفہ جان فلپس صاحب۔

۱۲۔ تاریخ ایران مصنفہ سر جان مالکوم صاحب

۱۳۔ تاریخ بھوپال مصنفہ سر جان مالکوم صاحب جس کا انتخاب کیا جاوے گا۔ ان کی تاریخ ہندوستان سے۔

۱۴۔ مسلمانوں کے عہد کی تاریخ اسپین جو تالیف کی جاوے گی تاریخ عربوں کا اسپین مصنفہ کانڈ صاحب اور اسپین کے عربوں کی تاریخ مصنفہ شیخ ابی العباس المقری اور تاریخ اسپین مصنفہ کالی کٹ صاحب میں سے۔

۱۵۔ رسالہ علم فلاحت یعنی کشت کاری مصنفہ لائی صاحب

۱۶۔ تاریخ اسکندر اعظم مصنفہ ایرین صاحب

۱۷۔ مغلیہ دربار کا بیان مصنفہ برنیر صاحب۔

۱۸۔ رسالہ علم طبیعات جو نہایت پسندیدہ اور آزمودہ ہے مصنفہ جے۔ جے گرنفن صاحب۔

گرلفن صاحب۔

۱۹۔ کلک صاحب کے آخری نسخہ کی چوتھی اور پانچویں فصل

۲۰۔ واٹلی صاحب کی کتاب منطق

۲۱۔ متعدد رسالہ حکمت قدرت کے ویل صاحب کے سلسلہ میں سے۔

۲۲۔ جنرل کنگھم صاحب کی رپورٹ ان تلاشوں کی جو انھوں نے صوبہ بہار اور گورکھپور میں کیں۔

۲۳۔ رسالہ ہیئت یا کئی دنیاؤں کا ثبوت مصنّفہ دی ول صاحب

۲۴۔ رسالہ پہاڑوں کی شہادت مصنّفہ ملر صاحب

۲۵۔ بکل صاحب کی دوسری جلد کا چھٹا باب جس میں نتیجے نکالنے کی حکمت کی عظمت کا بیان ہے۔

۲۶۔ میکس مولر صاحب کی کتابیں درباب علم سنسکرت

۲۷۔ مواعظ سکندر مصنّفہ ارسطو۔

۲۸۔ پولٹیکل اکونومی یعنی انتظام مدن مصنّفہ شینیر صاحب

اس کے علاوہ عبدالغفور نسّاخ کے بھائی مولوی عبداللّطیف خاں جو مجلس مذاکرہ علمیہ کلکتہ کے ناظم اور سائنٹفک سوسائٹی کے ممبر تھے ۸ جنوری ۱۸۶۵ کے سوسائٹی کے نام ایک خط میں مندرجہ ذیل کتابوں کے ترجمے شائع کرنے کی تجویز پیش کی:

۱۔ رسالہ ہیئت اور علم جہاز رانی جو اور صاحب کے دائرہ علوم میں سے لئے جاویں۔

۲۔ رابرٹسن اور پرسکٹ صاحب کا رسالہ درباب تحقیق ہونے امریکہ یعنی نئی دنیا کے۔

۳۔ ہمبولٹ صاحب کی سیّاحی کے حالات اور نیز حالات سیّاحی اور کسی مصنّف کے۔

۴۔ تاریخ خلفاء عباسیہ

۵۔ گلیک صاحب کی تاریخ انگلستان۔

۶۔ رسالہ درباب ترکیب اور نظام سلطنت انگریزی۔

۷۔ رسالہ درباب سڑک ریل

۸۔ لیک پرلیس صاحب کا رسالہ درباب فن من فاٹک گرافی یعنی سورج کے عکس سے تصویر کھینچنے کا فن۔

۹۔ رسالہ درباب امریکہ کی ترکیب اور انتظام سلطنت موجودہ کے۔

۱۰۔ تھارنٹن صاحب کی تاریخ ہندوستان۔

۱۱۔ حیات نامے مشہور مشہور زندہ لوگوں کے جن کا انتخاب اس کتاب میں سے کیا جاوے جو زمانے کے لوگوں کے نام سے مشہور ہے۔

۱۲۔ انگریزی اور سنسکرت کی کتابوں میں سے وہ رسالہ جو فن سلنگ اور اشعار سانگ سے متعلق ہے۔

۱۳۔ کانب صاحب ہ رسالہ درباب ترکیب جسم انسانی کے۔

۱۴۔ ڈاکٹر اے کانب صاحب کی طبیعات متعلقہ تندرستی اور تعلیم

۱۵۔ ڈاکٹر سومنر کا رسالہ درباب سلامتی عقل۔

۱۶- ہربٹ صاحب کا رسالہ درباب حقوق انسانی اور ان حقوق کی حفاظتوں ملکی کے۔

۱۷- ڈاکٹر جارج ولسن صاحب کا رسالہ درباب تار برقی کے۔

۱۸- مسمی پاینیر صاحب کا رسالہ درباب استعمال بجلی متعلقہ ملمہ کرنے کے"۔

مندرجہ بالا کتابوں کے ترجمہ و تالیف کی تجویز کے قبل رولن صاحب کی قدیم تاریخ مصر اور مل صاحب کی پولٹیکل اکونمی کے ترجمہ کی تجویز سر سید یکم فروری ۱۸۶۴ء کے سوسائٹی کے جلسے میں منظور کرا چکے تھے۔ اور ۱۲ مارچ ۱۸۶۴ء تک تاریخ مصر کا ترجمہ مکمل ہو چکا تھا۔

سوسائٹی جب علی گڑھ آئی تو اس کی سرگرمیوں اور مقبولیت میں خاصا اضافہ ہوا غازی پور میں یہ اگر ایک قطرہ کی حیثیت رکھتی تھی تو یہاں وہ ایک موج رواں بن گئی۔ اس لیے جب کام کی رفتار بڑھی تو نئی ضرورتوں کا احساس بھی بڑھا اور سوسائٹی کی ایک اپنی عمارت کا ہونا از بس ضروری قرار دیا گیا۔ سوسائٹی کے جلسہ میں یہ تجاویز پیش ہوئیں۔

۱- "اول یہ کہ مکان وسیع واسطے اجلاس سوسائٹی کے بنایا جائے کہ جس میں سوسائٹی کا اجلاس ہوا کرے اور تمام کتابیں اور اسباب متعلق سوسائٹی کا بہ حفاظت اور آراستگی اس میں رکھا رہے۔

۲- دوسرے یہ کہ سوسائٹی کے متعلق ایک عام ذخیرہ ہر قسم کے علوم و فنون کی کتابوں انگریزی اور فارسی اور عربی اور اردو اور سنسکرت کا کیا قلمی اور کیا چھپا ہوا جمع کرنا چاہئے اور یہ کتب خانہ بطور عام کتب خانہ کے رہے گا! ور ہر شخص کو جو جب

ان قواعد کے جو کونسل کار پرداز مقرر کرے گی ان کتابوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل رہے گا۔

۳۔ تیسرے یہ کہ جمیع قسم کے علوم وفنون کے آلات جو یورپ میں مروج ہیں اور جن کے ذریعے سے طالب علموں کو ہر قسم کے علوم وفنون کے تجربے دکھائے جاتے ہیں۔ سوسائٹی کو جمع کرنا چاہئیں کیونکہ ابتدا سے سوسائٹی کی خواہش ہے کہ ہر مہینہ میں دو تین دفعہ بذریعہ لکچروں کے اور دکھانے تجربوں کے ہندوستانیوں کو یورپ کے علوم وفنون کی نئی تحقیقاتیں بخوبی سمجھائی جاویں۹۔"

علی گڑھ اور بلند شہر کے زمینداروں کی مدد اور سوسائٹی کے ارکان کے تعاون سے مجوزہ عمارت کے لئے رقم جمع ہونے لگی۔ ۳ نومبر ۱۸۶۴ کو سوسائٹی کی عمارت کی رسم تنصیب لفٹنٹ گورنر اضلاع شمال ومغرب مسٹر اے ریمنڈ کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ تیس ہزار کی لاگت سے یہ عمارت سرسید کے اہتمام اور نگرانی میں تیار ہوئی اور ۱۴ فروری ۱۸۶۶ کو اس کا افتتاح ہوا۔ اس عمارت میں سب سے پہلے سرسید نے قانون پر لیکچروں کا سلسلہ شروع کیا اس کی برائے نام فیس بھی تھی۔ جو سوسائٹی کے فنڈ میں جمع کر دی جاتی۔ سوسائٹی کے کونسل کار پرداز نے جب ان لیکچروں کی افادیت محسوس کی تو عام پبلک کے لئے ایسے موضوعات پر لیکچروں کا انتظام کیا جن سے معلومات اور فکر ونظر میں وسعت پیدا ہو ساتھ ہی دلچسپ اور معنی خیز بھی ہوں۔ ان لیکچروں کی کوئی فیس نہیں تھی۔

اس کے علاوہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے راہ ورسم پردہ تعصب، تعلیم نسواں اور ہندوستان کے باشعور لوگوں کو فلاح وبہبود کے کاموں پر متوجہ

کرنے کے لئے سوسائٹی میں لکچر دئے گئے۔ ۲۸ جون ۱۸۶۴ء سے علم طبیعات پر علی گڑھ کے انگریزی مدرسہ کے ہیڈ ماسٹر نے لکچروں کا سلسلہ شروع کیا۔ ڈاکٹر کلکلی جن کے سپرد سوسائٹی کے سعل کا انتظام و انصرام تھا ہر ماہ سائنس کے کسی موضوع پر لکچر دیتے اور آلات سائنس جو سوسائٹی میں موجود تھے ان سے حاضرین کو تجربے دکھاتے تھے۔

۲۸ جنوری ۱۸۶۵ء سے سوسائٹی کے مجوزہ کتب خانہ کی تنظیم کا آغاز ہوا۔ سر سیّد نے چھ سو روپیہ کی کتابیں کتب خانہ کو دیں اس کے علاوہ ایشیاٹک سوسائٹی میں اشرف علی کمسن صاحب، عبداللہ عبیدی، منشی نولکشور، ولیم ناسولس، عبدالرحمن کپتان فلر آئی ایف ۔ آئی ۔ گراہم کے عطیات شامل ہیں۔ سوسائٹی کے دارالمطالعہ میں ۱۸۶۶ء میں چالیس اخبارات آتے تھے جن میں انگریزی اور اردو کے علاوہ سنسکرت عربی اور فارسی کے اخبارات بھی تھے۔

۱۴ فروری ۱۸۶۶ء کو سوسائٹی کی جانب سے ایک اخبار نکالنے کی تجویز ہوئی۔ مجوزہ اخبار کا اجرا ۳ مارچ ۱۸۶۶ء سے ہوا۔ پہلے یہ اخبار ہفتہ وار تھا لیکن بعد میں مسدود ہو گیا تھا انیسویں صدی کے آخری عشرہ میں یہ اخبار پھر ہفتہ وار ہو گیا۔ اس اخبار کی صحافتی اہمیت سے قطع نظر اس نے اردو نثر کو جو نیا اسلوب دیا وہ خود اظہار کے لئے نئے قالب کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۵ اگست ۱۸۶۷ء کو سر سید کا تبادلہ علی گڑھ سے بنارس ہوا۔ بنارس سے بھی سر سید سوسائٹی کے کاموں میں امداد دیتے رہے اور اس کی مستقل آمدنی کے وسائل تلاش کرتے رہے۔ انھوں نے ایک تجویز کی کہ اس ضلع (علی گڑھ) کے تمام دیہات

سے کم از کم ایک روپیہ سالانہ ہمیشہ کے لئے سوسائٹی کے قیام کے واسطے مقرر کیا جائے۔
بنارس سے سرسید جب انگلستان روانہ ہوئے تو راستہ میں بھی سائنٹفک سوسائٹی کا خیال برابر لگا رہا۔ عدن کے قریب کسی مقام سے مہدی علی (محسن الملک) کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"مجھ کو علاوہ مفارقت احباب کے یہ رنج بڑا ہے کہ میرے پیچھے لوگ عقل کے دشمن سائنٹفک سوسائٹی کی بڑی مخالفت کریں گے۔ اور کوئی درجہ سعی وکوشش کے واسطے شکست دینے سائنٹفک سوسائٹی کے باقی نہ رکھیں گے پس میں چاہتا ہوں کہ آپ سوسائٹی کی طرف زیادہ متوجہ ہوں اور اس کو سنبھال لیں اور ممبروں کے بڑھانے میں زیادہ کوشش فرما دیں۔ مرزاپور کے لوگوں نے اگر چندہ نہیں دیا تو ان کو ممبر بنایئے بہرحال سوسائٹی کے معاملہ میں حد سے زیادہ خیال وکوشش فرمائے۔"

لندن کے زمانہ قیام میں بھی وہ سائنٹفک سوسائٹی کے خیال سے غافل نہیں رہے بلکہ انہیں سوسائٹی کے قرضہ کا خیال لگا رہا۔ وہاں سے وہ برابر اخبار سائنٹفک سوسائٹی میں اپنے سفر کے حالات وکوائف لکھتے رہے۔ لندن ہی سے انھوں نے مختلف علوم کی اہم کتابوں کی ایک فہرست علمائے لندن سے انتخاب کرا کر سوسائٹی کو ترجمہ کے لئے بھیجی۔ انھیں کتابوں میں علم ریاضی کی کتابیں بھی شامل تھیں جن میں بیشتر کا ترجمہ مولوی ذکا اللہ نے کیا ہے۔

سرسید کے بنارس چلے جانے کے باعث سائنٹفک سوسائٹی کے سکریٹری راجہ جے کشن داس ہوئے۔ انھوں نے سوسائٹی کے کاموں میں دلچسپی لی لیکن سرسید کی ذات سوسائٹی کی سرگرمیوں میں اس طرح گھل مل گئی تھی کہ ان کے چلے جانے پر

اس کمی کا احساس ہونا لازمی تھا۔ راجہ جے کشن داس کے زمانہ نظامت میں رسالہ
علم برقی، اصول سیاست مدن اور تاریخ ایران کے حصے سوسائٹی سے شائع ہوئے
انھوں نے ترجموں کے علاوہ مستقل تصانیف کے اشاعت کی طرف بھی توجہ دی۔
اور اس سلسلہ میں ملک کے اہل علم کی خدمات حاصل کیں اور ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم
کی ضروریات پوری کرنے کے لئے موضوعات کی فہرست تیار کرائی۔ جن کا مقصد
جدید تقاضوں اور اصولوں کے تحت اردو ادب کی تدریس تھا۔

اس کے علاوہ تاریخ یمینی، تاریخ خواجہ ابوالفضل بیہقی، تاریخ المآثر، طبقات
ناصری۔ تاریخ فیروز شاہی، تاریخ تیمور اور تاریخ ابن خلدون کا انتخاب شائع کرنے
کی بھی تجویز تھی[۲۲]۔ کتابوں کی اشاعت کا یہ پروگرام پوری طرح روبہ عمل نہ آسکا اس کی
ایک وجہ سوسائٹی کے منتظمین کی جلد جلد تبدیلیاں بھی تھیں ۲۱، فروری ۱۸۷۴ء کو راجہ
جے کشن داس کا تبادلہ الہ آباد ہوگیا ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر انھیں
سوسائٹی کا آنریری لائف کو پریسیڈنٹ بنایا گیا راجہ جے کشن داس کے بعد مولوی
سمیع اللہ خاں سکریٹری مقرر ہوئے ۱۱، جون ۱۸۷۴ء کو نظامت کے فرائض سے
وہ عارضی طور پر سبکدوش ہوئے ان کی جگہ زین العابدین اور پنڈت رادھا کشن
سکریٹری مقرر ہوئے۔ ۲۵ اگست ۱۸۷۴ء کو مولوی سمیع اللہ خاں نے اس عہدہ کا
دوبارہ جائزہ لیا۔ ۲ مئی ۱۸۷۷ء تک مولوی سمیع اللہ اور پنڈت رادھا کشن دونوں
سوسائٹی کے سکریٹری رہے اس زمانہ میں سرسید بنارس سے علی گڑھ میں سکونت
اختیار کر چکے تھے لہذا نظامت کے فرائض کا بار بھی سرسید پر پڑا۔ اس زمانہ میں سوسائٹی
پر قرضہ کا بوجھ تھا۔ ممبروں کی تعداد دن بدن گھٹتی جا رہی تھی کتابوں کے ترجمہ کا کام

بند پڑا تھا اس صورت حالات سے نکالنے کے لئے سرسید نے ۲۶ ستمبر ۱۸۷۸ء کو سوسائٹی کے لئے جدید بائی لاز بنائے لیکن اس کے باوجود سوسائٹی کی گرتی ہوئی حالت میں کوئی معتدبہ فرق نہ آیا - ۱۸۷۸ء ہی میں سرسید وائسرائے کی کونسل کے ممبر نامزد ہوئے لہذا ۱۸۷۸ء کے اواخر میں خواجہ محمد یوسف سائنٹفک سوسائٹی کے سکریٹری منتخب ہوئے ان کے زمانہ میں بھی سوسائٹی کی اصلاح نہ ہو سکی - ۱۸۸۲ء میں سوسائٹی میں صرف دس ممبر اور چار آنریری ممبر (عہدہ دار) رہ گئے عجب کہ سوسائٹی کے ابتدائی زمانہ میں ممبروں کی تعداد تقریباً ڈھائی سو تھی...... ۱۸۸۶ء میں ممبران کی تعداد تین رہ گئی۔ اور ۱۸۸۷ء میں وہ بھی نہ رہے چنانچہ ۱۰ جولائی ۱۸۸۷ء کو سائنٹفک سوسائٹی کو مدرسۃ العلوم میں ضم کر دیا گیا۔ نومبر ۱۸۸۷ء کو سائنٹفک سوسائٹی کی عمارت میں ایک کلب قائم کر دیا گیا۔

حالی نے لکھا ہے کہ قطع نظر ان اہم مقاصد کے جن کے لئے یہ سوسائٹی قائم ہوئی تھی اس سے اور بہت سے ضمنی فائدے نہ صرف شمالی ہندوستان بلکہ ملک کے اکثر حصوں کو پہنچے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں جہاں تک ہم کو معلوم ہے کوئی انسٹی ٹیوشن یا قومی مجلس جو ذکر کے قابل ہو اس سوسائٹی سے پہلے قائم نہیں ہوئی تھی پھر ۲۵ برس کے عرصہ میں جس قدر سوسائٹیاں انجمنیں اور سبھائیں تمام ملک میں پھیلیں وہ سب اس کے بعد اسی کی ریس سے قائم ہوئیں[۳] حالی کا یہ خیال حرف بہ حرف صحیح ہے کہ اس سوسائٹی کے قیام کے بعد ملک کے طول و عرض میں انجمنوں کا جال سا بچھ گیا۔ جنہوں نے فکر و نظر کے نئے قالب تیار کرنے میں اپنا حصہ ادا کیا۔ بنارس انسٹی ٹیوٹ "اٹاوہ ریڈنگ اینڈ ڈبیٹنگ کلب" سائنٹفک

سوسائٹی مظفرپور بہار، انجمن تہذیب لکھنؤ، سروجنک سبھا پونا، کٹک سوسائٹی اڑیسہ اور انجمن راجپوتانہ وغیرہ کا قیام سرسید کی اسی سوسائٹی کے زیر اثر عمل میں آیا۔

مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ سائنٹفک سوسائٹی نے تقریباً چالیس کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں" لیکن یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ سائنٹفک سوسائٹی کی مطبوعات پر سلسلہ کا نمبر بھی درج ہوتا تھا اور انھیں سوسائٹی کے سرپرست ڈیوک آف ارگل کے نام منسوب کیا جاتا تھا۔ سرسید کی یہ تجویز سوسائٹی کے ارکان نے متفقہ طور پر منظور کر لی تھی کہ "ہماری سوسائٹی جو کتاب چھاپے اس کا سرنامہ ہمیشہ ہز گریس ڈیوک آف ارگل پیٹرن سوسائٹی کے نام سے زینت پاوے تاکہ ایسے جلیل القدر حاکم کی جس نے ہم ہندوستانیوں کی بہتری کے لئے اپنی فیاض مہربانی کو پیٹرن ہونے سے ظاہر کیا ہے ہمیشہ کو یادگاری رہے" اس لحاظ سے دیکھا جائے تو سائنٹفک سوسائٹی سے صرف پندرہ کتابیں شائع ہوئیں جن میں گیارہ ہمیں دستیاب ہوئی ہیں۔ یہاں ان کتابوں کی فہرست پر ان کے ٹائٹل پیج کی عبارت درج کی جا رہی ہے۔

۱۔ نمبر ۱ مصر کی قدیم تاریخ جو رولن صاحب کی تاریخ قدیم میں سے باضافہ چند مضامین تالیف ہوئی۔ ترجمہ کیا اور مشتہر کیا، سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس ۔ ۱۸۷۰ء مصر کی قدیم تاریخ کا یہ دوسرا ایڈیشن ہے۔

۲۔ نمبر ۲ تاریخ چین مصنفہ پادری ایکرس کر آنرا محمد زماں خاں مشہور بہ فرنگی خاں باشارہ پادری پورتو صاحب بزبان فارسی ترجمہ نمودہ بود بہ تائید سینٹیفک سوسائٹی بہ قالب طبع در آمد۔ کلکتہ۔ بالپٹسٹ مشن پریس۔ ۱۸۶۴ء۔

۳- نمبر ۳ یونان کے قدیم زمانہ کی تاریخ جو ردلن صاحب کی تاریخ قدیم سے باضافہ چند مفید حاشیوں کی تالیف ہوئی - پہلا حصہ ترجمہ کیا اور مشتہر کیا۔ سائنٹفک سوسائٹی نے علی گڑھ۔ سید احمد پرائیویٹ پریس - ۱۹۶۵

۴- نمبر ۴ یونان کے قدیم زمانہ کی تاریخ جو رولن صاحب کی تاریخ قدیم میں سے باضافہ چند مفید حاشیوں کی تالیف ہوئی - دوسرا حصہ ترجمہ کیا اور مشتہر کیا۔ سائنٹفک سوسائٹی نے علی گڑھ - سید احمد پرائیویٹ پریس - ۱۸۶۵

۵- نمبر ۵ یونان کے قدیم زمانہ کی تاریخ جو رولن صاحب کی تاریخ قدیمہ میں سے باضافہ چند مفید حاشیوں کے تالیف ہوئی تیسرا حصہ ترجمہ کیا اور مشتہر کیا۔ سائنٹفک سوسائٹی نے علی گڑھ - سید احمد پرائیویٹ پریس ۱۸۶۵- اس کتاب کے تین حصے اور تھے جنہیں شائع کرنے کی تجویز تھی - سائنٹفک سوسائٹی کی روئداد دیکھنے سے یہ پتہ چلتا ہے یہ حصے شائع نہ ہو سکے۔

۶- نمبر ۷ رسالہ علم فلاحت یعنی فرنگستان کے طریقہ پر فن کشت کاری کا بیان معہ تصویرات کے - مولفہ رابرٹ اسکاٹ برن صاحب جو مسٹر ول صاحب کی علمی کتابوں کے سلسلہ میں شامل ہے اور جس کو باضافہ چند مفید حاشیوں کے سائنٹفک سوسائٹی نے اردو میں ترجمہ کر کر مشتہر کیا - علی گڑھ سید احمد پرائیویٹ پریس - ۱۸۶۵

۷- نمبر ۸ رسالہ علم انتظام مدن مؤلفہ ناسا ولیم سینیر صاحب ایم - اے سابق پروفیسر علم انتظام مدن یونیورسٹی آکسفورڈ جس کو باضافہ چند مفید حاشیوں کے سائنٹفک سوسائٹی نے اردو میں ترجمہ کر کر مشتہر کیا، علی گڑھ سید احمد پرائیویٹ پریس ۱۹۶۵-

۸۔ نمبر ۹۔ تاریخ ہندوستان۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے عہد کی ابتدا سے ۱۸۶۱ء مطابق ۱۱۷۵ھ تک مؤلفہ انریبل مونٹ اسٹورٹ الفنسٹن صاحب بہادر سابق گورنر بمبئی معہ تتموں اور حواشی اور نقشہ ہندوستان جس کو سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ نے ترجمہ کر کر مشتہر کیا، علی گڑھ۔ سید احمد پرائیویٹ پریس۔ ۱۸۶۶ -

۹۔ نمبر ۱۰۔ رسالہ علم برقی مؤلفہ سر ولیم اسنو ہیرس صاحب جس کو باضافہ مفید حاشیوں کے سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ نے اردو زبان میں ترجمہ کر کے مشتہر کیا۔ علی گڑھ۔ مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس۔ ۱۸۹۶

۱۰۔ نمبر ۱۲۔ اصول سیاست مدن۔ مقالہ اول مؤلفہ رائے بہادر پنڈت دھرم نرائن دہلوی از کتاب عدیل عمدۃ الحکما جون سٹورٹ مل صاحب سلمہ الرحمٰن و دیگر ماخذ جس کا حق طبع مؤلف نے سائنٹفک سوسائٹی کو مرحمت فرمایا اور سوسائٹی نے اس کو بہ نظر افادہ عام چھاپ کر مشتہر کیا۔

۱۱۔ نمبر ۱۵۔ تاریخ ایران۔ حصہ اول۔ جس میں نہایت قدیم زمانہ سے حال تک سلطنت مذکور کے باشندوں کے مذہب اور طرز حکومت اور راہ و رسم اور خصلت کا ذکر ہے۔ مؤلفہ میجر سر جان میلکام صاحب۔ جی۔ سی۔ بی۔ کے۔ ایل۔ ایس گورنر سابق بمبئی۔ جس کو سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ نے اردو زبان میں ترجمہ کر کر مشتہر کیا، علی گڑھ۔ مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس۔ ۱۸۷۲

سائنٹفک سوسائٹی کی ساری مطبوعات علاوہ تاریخ ایران کے چاروں حصوں کے ٹائپ میں طبع ہوئیں۔ مذکورہ کتابوں کے علاوہ سائنٹفک سوسائٹی کی روئدادوں سے اور گزٹ میں سوسائٹی کی مطبوعات کے اشتہارات سے پتہ چلتا

ہے کہ ذیل کی کتابیں بھی سوسائٹی کی مطبوعات میں شامل ہیں جو ہمیں دستیاب نہ ہو سکیں

۱۔ رسالہ علم جغرافیہ حصہ اول، دوم، سوم اور چہارم۔ مولفہ مسٹر ولکنسن ۲۔ رسالہ نیچرل فلاسفی مصنفہ چارلیس ٹامنس ۳ رسالہ علم آب و ہوا مصنفہ چارلیس ٹامنس ۴۔ رسالہ جر ثقیل مصنفہ چارلس ٹامنس۔

مولوی عبدالحق نے مولوی ذکاء اللہ کی ترجمہ کردہ تیرہ کتابوں کو سائنٹفک سوسائٹی کی مطبوعات میں شامل کر دیا ہے لیکن حقیقت صرف اتنی ہے کہ یہ کتابیں سائنٹفک سوسائٹی کے مقاصد کی تائید میں مطبع مرتضوی دہلی میں طبع ہوئی ہیں مثال کے طور پر رسالہ مسائل معادلات کے ٹائیٹل پیج کی یہ عبارت دیکھیے

"رسالہ مسائل معادلات مع بہت سی مثالوں کے۔ مولفہ ٹاڈ ھنٹر صاحب ایم اے۔ الف۔ آر۔ ایس۔ جس کو منشی محمد ذکاء اللہ صاحب ہیڈ ماسٹر نارمل اسکول دہلی نے بتائید مقاصد سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ، سائنٹفک سوسائٹی بہار، اردو میں ترجمہ کیا اور بمقام دہلی مطبع مرتضوی میں باہتمام حاجی محمد عزیز الدین کے مطبوع ہوا۔ ۱۸۷۱ء ٹائیٹل پیج مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ۔

"قوموں کی زندگی میں کبھی ایسا بھی لمحہ آتا ہے جب علوم و فنون کی تخلیقی قوت مدھم پڑ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اپنے بائیں بہ انحطاط علوم کو دوسری بڑھتی ہوئی یا ترقی یافتہ قوموں کے علوم سے توانا بنائیں انیسویں صدی میں شمالی ہندوستان میں یورپ کے علمی ورثہ کو جذب کرنے کا عمل باقاعدہ طور پر دہلی ورناکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے ذریعہ شروع ہوا۔ اس کے معاونین میں شاہ اودھ اور شمس الامراء امیر کبیر بھی شامل تھے۔ خود ان لوگوں نے بھی اپنے اپنے حلقوں میں یورپ کے تہذیبی ورثہ کو اردو میں منتقل کرانے کا سلسلہ شروع

کیا لیکن ان کوششوں کا حال پہلی رات کے چاند کا سا تھا کہ کسی نے دیکھا کسی نے نہ دیکھا۔ لیکن سائنٹفک سوسائٹی کی کوششیں مذکورہ کوششوں سے اس لئے زیادہ اہمیت کی حامل ہیں کہ اس نے تمام ذرائع اور وسائل کو منظم طور پر یک جا اور مربوط کر کے ترجمہ کا کام شروع کیا یہ کام وقت کے تقاضوں کے عین مطابق تھا۔ لہٰذا اس کی اہمیت کا احساس پیدا کر دیا۔ اسی لئے سائنٹفک سوسائٹی کے کارنامے کمیت کے اعتبار سے کم سہی کیفیت کے لحاظ سے عظمت کے حامل ہیں"

سائنٹفک سوسائٹی کے ترجموں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید کو تاریخ سے خاص دلچسپی تھی وہ تاریخ کو شہنشاہوں کے کارناموں کا بیان نہیں بلکہ انسانیت کے عروج و زوال کی کہانی سمجھتے تھے۔ رولن کی کتاب اسی لئے ان کی پسندیدہ کتابوں میں تھی کہ اس سے ذہنی اور معاشرتی کارناموں کی تہوں تک رسائی ہوتی ہے۔ یہاں تاریخ زندہ حقیقت معلوم ہوتی ہے خود سرسید کی بنوائی ہوئی عمارتوں میں جہاں جائیے تاریخ سے مفر نہیں ان میں اس بات کا شدید احساس ہے کہ ان کا ماضی ان کے حال کا حصہ ہے وہ اپنے ماضی سے بے زار نہیں بلکہ اپنے دور کے مزاج سے بے زار تھے۔ تاریخ کی کتابوں کے ترجمے سے وہ یہ چاہتے تھے کہ قوم میں حقیقت پسندی کا جذبہ اور معروضی اندازِ نظر پیدا ہو۔

سوسائٹی نے جن کتابوں کا ترجمہ کرایا ان کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ حواشی کی مدد سے متن کے ایسے اشارات اور اصطلاحات کی وضاحت کی جاتی تھی جن سے عام طور پر ہندوستانی ناواقف ہوتے تھے۔ سوسائٹی کے یہ ترجمے عام فہم ہیں

اور اس لئے انھیں مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان ترجموں سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ایک طرف تو مغربی افکار و خیالات اردو کے سانچے میں ڈھل رہے تھے دوسری طرف تخلیقات یا طبع زاد تحریریں بھی ان ترجموں کا اثر قبول کر رہی تھیں اور ان کا ایک مزاج متعین ہو رہا تھا۔ انیسویں صدی میں شمالی ہند میں ترجموں کے سلسلہ میں سائنٹفک سوسائٹی کی یہ آخری کوشش تھی جو بروئے کار آئی۔ یہاں سے کتابیں کم ترجمہ ہوئیں لیکن ان کتابوں نے ملک کو اندھیرے سے نکالنے کیلئے جو فضا تیار کی اس کی اہمیت مسلمہ حقیقت ہے۔ سائنٹفک سوسائٹی کے منصوبوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ علی گڑھ تحریک کا خواب بھی سرسید نے اس کام کے دوران دیکھا گو اس کے تمام خط و خال ان کے ذہن میں پورے طور پر انگلستان کے سفر کے بعد متعین ہوئے اس لئے علی گڑھ تحریک کو سمجھنے کے لئے بھی... سائنٹفک سوسائٹی کا مطالعہ ازبس ضروری ہے کہ یہی سوسائٹی علی گڈھ تحریک کا نقطۂ آغاز ہے۔

ماخذ و مصادر | ۱-۲- التماس بخدمت ساکنان ہندوستان درباب ترقی تعلیم اہل ہند۔ سرسید۔ سید احمد پرائیویٹ پریس۔ غازی پور ۱۸۶۳ ص ۱-۷

۳- قانون واسطے سین ٹیفک سوسائٹی کے غازی پور ۱۸۶۴

۴- روئیداد سین ٹیفک سوسائٹی نمبر ۱ غازی پور ۱۸۶۴

۵- روئیداد سین ٹیفک نمبر ۵۔ گورنمنٹ پریس الہ آباد ۱۸۶۴

۶- روئیداد سین ٹیفک سوسائٹی نمبر ۷

۷- روئیداد سین ٹیفک سوسائٹی نمبر ۲

۸- روئیداد سین ٹفک سوسائٹی نمبر ۳

۹- روئیداد سین ٹفک سوسائٹی نمبر ۶

۱۰- اخبار سین ٹفک سوسائٹی علی گڑھ ۲۵ مئی ۱۸۶۶ء

۱۱- حیات جاوید- حالی- ص ۱۹۱

۱۲- مکتوبات سر سید- مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی ص ۴۱

۱۳- اخبار سین ٹفک سوسائٹی ۲۲ مئی ۱۸۶۷ء

۱۴- حیات جاوید ـــــ حالی- ص ۲۹۷

۱۵- سید احمد خاں، حالات و افکار- عبدالحق ص ۱۵۱

۱۶- روئداد سین ٹفک سوسائٹی نمبر ۴

ڈاکٹر عبدالحق

مذہبی تصانیف کے اردو تراجم

ترجمہ کا مفہوم کسی خیال کا دوسرے تک منتقل کیا جاتا ہے اس اعتبار سے اس کا آغاز انسانی تہذیب کی ابتدا سے ہوتا ہے۔ سب سے پہلے انسان نے اپنے مافی الضمیر کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے لکڑی اور لکیر کا سہارا لیا۔ بعدازاں ان ٹوٹتی اور ابھرتی لکیروں کو مربوط کر کے تصویروں کو استعمال کیا۔ یہ تصویریں Hieroglyphics یا مقدس تحریریں قرار پائیں۔ ان سے حروف تہجی ایجاد ہوئے۔ رفتہ رفتہ زبان وجود میں آئی جو مفروضہ صوتی علامات کا مجموعہ ہے گویا عقیدہ و افکار نے زبان کو جنم دیا اور اسے پروان چڑھایا۔

انسانی فطرت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنے نظریہ و خیال کی اشاعت چاہتا ہے۔ وہ ہم خیال و ہم عقیدہ کا حلقہ وسیع بنانے کی فکر میں ہمہ تن مصروف رہتا ہے۔ دوسروں کو ہم مشرب اور ہم راز بنانے کی جدوجہد میں دیوانگی کی حد تک بڑھ جاتا ہے اور اسے باعث فخر اور موجب نجات سمجھتا ہے یہی جدوجہد اور خواہش ترجمہ کی تحریک پیدا کرتی ہے گر

مخاطب ہم زبان اور ہم قلم نہیں ہے۔ تو کسی اشتراک زبان اور ذریعۂ اظہار کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

ہماری زبان میں لسانی سطح پر مترادفات سے ترجمہ کا آغاز ہوا۔ ان مترادفات میں تصرفات بھی ہوئے۔ گویا اردو کے عناصر ترکیبی میں ترجمہ کا خمیر شامل ہوا۔ جب زبان اظہار کے قابل ہوئی تو فارسی کے مختلف اصنافِ سخن کو جوں کا توں اردو میں منتقل کیا گیا۔ ترجمے کے ساتھ کہیں تصرف اور پھر تخلیق کا دور شروع ہوا۔ لیکن تخلیق کے مقابلہ میں ترجمہ کا ذخیرۂ ادب کہیں زیادہ وقیع اور قابلِ قدر ہے۔ کبھی کبھی یہ اندیشہ بھی ہوتا ہے کہ شاید ترجمہ کا ہی بول بالا رہے۔

ایک عام فہرست سازی کے مطابق ہماری زبان میں اب تک تقریباً اٹھارہ ہزار سے زائد کتابیں تراجم کی صورت میں موجود ہیں ــــــ عبید اللہ قدسی نے اپنی تصنیف "پاکستان میں ذہنی رجحان" (۱۹۵۸ء) میں تراجم کی ایک ناتمام فہرست اس طرح پیش کی ہے۔ یہی جریدہ (کراچی یونیورسٹی) میں بھی نقل کیا گیا ہے۔

قرآن پاک کے تراجم تقریباً	۵۲
احادیث	۱۵۰
اسماء رجال	۵۰
کتب فقہ	۱۵۰
سیر و تاریخ	۵۰۰
فلسفہ اور منطق	۱۰۰
مختلف علوم و فنون	۵۰۰۰

یہ ایک ناتمام فہرست ہے۔ کیوں کہ ہندوستان کے تراجم کا ایک حصہ اس میں شامل نہیں ہے اور نہ بعد کے تراجم کے اعداد و شمار شامل ہیں۔ اس پندرہ سال کی مدت میں تراجم کا قابلِ ذکر ذخیرہ اردو میں منتقل ہوا ہے۔

اردو میں سب سے بڑا سرمایہ عربی کے تراجم کا ہے تفسیر و احادیث کے علاوہ سفرنامہ ابن بطوطہ، ابن جبیر، ابن خلدون، تاریخ طبری، ابن اثیر، فصوص الحکم، حکمت الاشراق، الملل والنحل، قانون شیخ الرئیس، اخوان الصفا، غزالی و رازی کے ساتھ تقریباً ہر بنیادی کتاب کا اردو ترجمہ موجود ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ عربی علم و فن کی زبان ہے۔ اس کا اثر و نفوذ اتنا گہرا اور دیرپا تھا کہ اس نے بیشتر زبانوں کو اپنی تہذیب کے ساتھ ساتھ مغلوب کیا۔ پروفیسر ای جی۔ براؤن نے تاریخِ ادبیاتِ ایران میں اس امر کی طرف بڑی صراحت سے گفتگو کی ہے۔ فارسی زبان کی پوری تربیت عربی کے زیرِ سایہ ہوئی۔ اور فارسی نے اردو کی سرپرستی کی۔ ایران میں علم و فضل کی زبان عربی ہی تھی فارسی نہیں۔ اور تقریباً یہی صورتِ حال ہندوستان میں تھی۔

کم سے کم اکبر کے زمانے تک عربی کا ہی بول بالا تھا۔ علم و فضل کا معیار بھی اس کو سمجھا جاتا تھا۔ بیشتر علما کی کتابیں اسی زبان میں ملتی ہیں۔ حافظ محمود شیرانی کا خیال صحیح ہے کہ مغلیہ سلطنت سے پہلے فارسی کے کارنامے قابلِ ذکر نہیں۔ ابن حوقل اور اصطخری کے قول کے مطابق چوتھی صدی ہجری کے وسط اور آخر تک ملتان اور منصورہ، سندھ کے لوگ عربی اور سندھی بولتے تھے اس کے بعد بھی تقریباً چھ سو سال تک یعنی عہدِ اکبر تک عربی کا رواج ملتا ہے۔ صرف زبان ہی نہیں بلکہ فنونِ لطیفہ کے

دوسرے ارکان میں بھی حجازی آہنگ نمایاں ہے خود فارسی میں عربی تصانیف کے تراجم کا سب سے بیش بہا ادب موجود ہے۔ فارسی زبان شاعری، انشاپردازی داستان سرائی اور تاریخ نگاری کے لئے زیادہ مستعمل دکھائی دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں ترجموں کا آغاز داستانوں اور تاریخی تصانیف سے ہوتا ہے۔ امیر خسرو کی مشہور مثنوی ہشت بہشت کا ترجمہ ملک خوشنود نے ۱۰۵۶ھ میں مکمل کیا۔ نظامی کی ہفت پیکر کا ترجمہ بہرام وگل اندام کے نام سے ۱۰۸۱ھ میں تکمیل کو پہونچا۔ چھاپے خانے کی ایجاد نے تراجم کو کافی فروغ دیا۔ اخلاق ہندی (مفرح القلوب) فارسی سے پہلا مطبوعہ اردو ترجمہ ہے جو ۱۸۰۳ء میں فورٹ ولیم کالج کی سرپرستی میں شائع ہوا۔

عتیق احمد صدیقی کی تالیف صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات میں ان حسب ذیل کتابوں کے تراجم کا ذکر ملتا ہے۔

گلستان ۱۸۴۹ء

مفتاح الدقائق ارسطو، طبی رسالہ (عربی سے) ۱۸۴۹ھ

اخلاق جلالی (فارسی سے) ۱۸۵۰ء

تحریر اقلیدس (عربی سے) ۱۸۰۱ء

میزان الطب (عربی سے) ۱۸۰۱ء

اخوان الصفا (عربی سے) ۱۸۰۱ء

مگر اس بیش بہا ذخیرہ پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ شاید تخلیق کے مقابلے میں اسے درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ اور ترجمہ نگاری کے فن پر بھی توجہ نہیں دی گئی ہمارے یہاں معیار سازی کا کوئی مرکزی ادارہ بھی نہیں رہا۔ جس کی وجہ سے یکساں آداب و

اصول کبھی نافذ نہیں کئے جا سکے۔ اسی لئے ترجموں میں یکسانیت اور اصطلاحات میں
ہم آہنگی خاطر خواہ پیدا نہ ہو سکی۔ مختلف افراد و ادارے حسب خواہش اصول وضوابط
پر کاربند رہے۔ فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج، عیسائی مشنریاں، علی گڈھ تحریک، امیر کبیر
ثانی، نول کشور پریس، دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ کے علاوہ بہت سے کم معروف اداروں نے
اردو زبان کو ترجمہ کے ذریعے نئی جہت سے روشناس کرایا۔ ان کی گراں مایہ خدمات
سے اردو کا دامن مختلف علوم سے بھر گیا۔ ان ترجموں پر تخلیق کا گمان ہونے لگا مگر
اس کے باوجود ناقدینِ ادب نے کم توجہ دی۔

ترجموں کے مذہبی ادب پر اور بھی کم توجہ دی گئی۔ شاید معاش و مادے کے
اس بحرانی دور میں ذہنِ انسانی اس طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ
اردو ادب کا سب سے گراں مایہ ذخیرہ مذہبی تراجم پر مشتمل ہے۔ یہ سلسلہ صوفیا
کے احوال و کوائف سے متعلق سینکڑوں رسالوں کی اشاعت و تبلیغ سے شروع ہوا۔
جس نے اردو زبان و ادب کی ترویج میں سب سے اہم رول ادا کیا۔ دکنی نظم و نثر
کا ایک قابلِ قدر حصہ اسی حقیقت کی ترجمانی کر رہا ہے۔ شمالی ہندوستان میں فضلی
کی کربل کتھا سنگِ میل کی حیثیت سے معروف ہے اس کے بعد شاہ عبد القادر اور
شاہ رفیع الدین کے تراجم قرآن کو اردو ادب کی تاریخ میں مہتم بالشان کارنامہ قرار
دے سکتے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج نے اس کام کو آگے بڑھایا۔ اسی زمانے میں عیسائی
مشینریوں کے زیرِ اہتمام انجیل مقدس کے تراجم شائع ہوتے اور مناظرہ و مباحث
کی پوری فضا میں ترجموں کی افادیت کا احساس پیدا ہوا۔

قرآن اسلام کا اصل الاصول ہے۔ عقائد و افکار کی بنیاد بھی اسی پر ہے عربی

زبان میں ہونے کی وجہ سے عام ہندوستانی کے لئے اس کا سمجھنا اور سمجھانا بہت مشکل ہے۔ اور ہندوستان میں عربی کو وہ مقام نہیں ملا جو فارسی کو حاصل تھا یا بعد میں اردو کو ملا۔ اس لئے اس اہم ترین صحیفۂ آسمانی کے مفاہیم کو عوام تک پہنچانے کے لئے ہمیشہ ان تھک محنت کی جاتی رہی ہے۔ قرآن کے تراجم پر سب سے زیادہ اہتمام ملتا ہے ہر دور میں تراجمِ قرآن پر سنجیدگی سے کام ہوتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں قرآن کے سینکڑوں تراجم دیکھنے میں آتے ہیں۔ ماہر علوم قرآنی ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق کے مطابق چودھویں صدی کے ربع چہارم تک قرآن کا دنیا کی سو سے زائد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے بعض زبانوں میں ایک سے زیادہ تراجم موجود ہیں۔ دنیا کی ساری زبانوں کے مقابلے میں اردو میں تراجم قرآن کی تعداد سب سے زیادہ ہے ان کی دریافت کے مطابق تقریباً نوے تراجم ملتے ہیں۔ ———— اس کے بعد فارسی کے تراجم ہیں جن کی مجموعی تعداد ۱ون ہے۔ (ملاحظہ ہو برگ گل (جریدہ) کراچی شمارہ ۵ ص ۲۵۶)

راقم السطور کے خیال میں یہ تعداد بھی ناکافی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ تراجم جزئی اور مکمل دیکھنے میں آتے ہیں ڈاکٹر محمد مسعود نے اپنے مقالے " اردو تراجم و تفاسیر قرآنی " میں مترجمین و مفسرین کی تعداد ایک سو چھپن بتائی ہے

(ملاحظہ ہو۔ فکر و نظر ماہ دسمبر ۱۹۷۴ء ص ۲۳۵)

مختلف گروہوں کے عقاید میں جزوی یا فروعی اختلاف کی وجہ سے بھی ترجمہ میں بوقلمونی پیدا ہوتی ہے۔ ان کثیر التعداد ترجموں میں چند زیادہ مقبول عام ہوئے۔ شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے علاوہ، سر سید احمد، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی عبدالحق شبیر احمد عثمانی، مولانا اشرف علی تھانوی، فتح محمد جالندھری، ابوالاعلیٰ مودودی، عبدالماجد

دریابادی، احمد رضا خاں بریلوی، احمد سعید دہلوی، کے اڈیشن اور تعداد اشاعت کی کثرت سے ان کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان میں بھی ایک اندازے کے مطابق فتح محمد جالندھری کا ترجمہ سب سے زیادہ شائع ہوا ہے اس کا اسلوب معیاری اردو سے بہت قریب ہے سادے اور مختصر جملوں میں ایک خاص دل کشی محسوس کی جاسکتی ہے۔ کہیں حاشیے سے بھی نفس مضمون کی وضاحت کی گئی ہے۔ ۱۹۱۵ء میں پادری ار شاہ نے بھی ترجمہ شائع کیا تھا۔ عیسائی اہل قلم کا یہ دوسرا ترجمہ ہے۔

قرآن کے مخاطب اول عرب تھے بعد میں عجم بھی شامل ہوا۔ قرآن کی تفسیریں بھی پہلے عربی اور بعد میں فارسی میں لکھی گئیں۔ ان تفسیروں میں تلاش و تعبیر کے علاوہ ذہن و فکر کا اختلاف بھی دیکھنے میں آتا ہے ان چند گرانمایہ تفسیروں کے اردو تراجم بھی ملتے ہیں۔ تفسیر ابن کثیر کو موضوعات کی جامعیت نکات آفرینی، تفسیر بالحدیث اور وضاحتی انداز نگارش کی وجہ سے ممتاز کہا جاتا ہے۔ اس تفسیر کے دو ترجمے ہوئے آزادی سے قبل تفسیر محمدی کے نام سے مولوی محمد جوناگڈھی نے اور آزادی کے بعد انظر شاہ کشمیری نے مکتبہ فیض القرآن دیوبند نے ایک خاص اشاعتی پروگرام کے تحت تیس حصوں میں شائع کیا ہے۔ اسی سلسلے کا ایک انتہائی خوشگوار اور حیرت انگیز اضافہ تفسیر حضرت ابن عباس کا سلسلہ وار ترجمہ ہے۔ آں حضرت رسالت مآبؐ کے چچا زاد بھائی امام المفسرین حضرت عبداللہ ابن عباس کی روح پرور تفسیر ہے۔ یہ نادر تفسیر علامہ سیوطیؒ کے مرتبہ شان نزول کے ساتھ پیش کی جارہی ہے۔ اب تک آٹھ پاروں کی تفسیر ادارۂ درس قرآن دیوبند سے شائع ہوچکی ہے۔

تفسیر مظہری قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی مشہور تفسیر ہے اسے مولانا عبدالدائم الجلالی

منتقل کیا ہے آٹھ جلدوں کے صفحات کی مجموعی تعداد ۲۱۰۸ ہے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی کی بیس مختلف سورتوں کی تفسیر رشیدی اور مولانا قاسم نانوتوی کی چند مختلف سورتوں کی تفسیر المعوذتین اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کی سورہ کہف کی عربی تفسیر کا اردو ترجمہ معرکۂ ایمان و مادیت کے نام سے شائع ہوا ہے۔

ملا حسین واعظ کاشفی کی تفسیر حسینی فارسی زبان میں مشہور تفسیر ہے تفسیر قادری کے نام سے اس کا ترجمہ نولکشور نے دو جلدوں میں شائع کیا تھا ۱۹۷۶ میں اس کا تیرھواں اڈیشن سامنے آیا ہے۔ مولوی فقیر الدین کے اس دلکش ترجمہ کے صفحات کی مجموعی تعداد لمبی تقطیع کے ۱۴۰۵ صفحات ہیں قرآن کی ایک دلچسپ منظوم تفسیر مولوی عبدالسلام کے قلم کا نتیجہ ہے جو تفسیر زلزال آخرت کے نام سے مشہور و معروف تھی۔ ۱۷۶۱ صفحات ہیں اس منظوم تفسیر کی موجودگی سے قرآن پر کام کرنے والوں کی عرق ریزی اور ان کے بے پناہ ذوق و شوق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ قرآن کی بہت سی سورتوں کی تفسیر میں علیحدہ کتابی صورتوں میں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ قرآن کو ادب و انشا کے اسالیب میں ڈھالنے کی برابر کوشش رہی ہے۔ قرآن کے منظوم ترجمے اور تفسیر میں بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں اگرچہ علماء نے اسے مستحسن نظروں سے نہیں دیکھا۔ اردو کے مشہور ادیب سیماب اکبرآبادی نے جب ترجمے کو نظم کی صورت میں پیش کرنا چاہا تو علماء نے اسے تحریف قرار دے کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ یہی صورت حال دسویں صدی ہجری میں پیش آئی۔ جب شیخ بدرالدین محمد بن رضی الدین الغزی دمشقی نے عربی میں منظوم قرآن کی سب سے پہلی تفسیر لکھی۔ تاریخ التفسیر کے مصنف پروفیسر عبدالصمد صارم الازہری کے مطابق اس تفسیر میں ایک لاکھ اشعار تھے فارسی میں شیخ ابو محمد عبدالوہاب بن محمد شافعی کی تفسیر الشیرازی فارسی

زبان میں پہلی منظوم تفسیر ہے اس میں بھی تقریباً ایک لاکھ اشعار ہیں۔ اردو کی قدیم ترین منظوم تفسیر شیخ بہاء الدین باجن (ولادت ۷۹۰ھ) کی ہے۔ جو مکمل نہیں بلکہ جز کی ہے۔ اور قدیم ترین زبان یعنی اردو گجری میں ہے۔ منیر نیازی نے نوائے ادب بمبئی اکتوبر ۱۹۷۵ء کے شمارہ میں "کلام پاک کے اولین منظوم ترجمہ اور تفسیر" کے عنوان سے مقالہ لکھا ہے اس میں چودہ مکمل تراجم و تفسیر کی فہرست اس طرح دی ہے۔

۱۔ تفسیر مرتضوی	غلام مرتضی جنوں الہ آبادی	۱۱۹۴ھ
۲۔ تفسیر اکسیر	شاہ غلام محی الدین قریشی مرہتوی	۱۲۰۹ھ
۳۔ زاد الآخرت	عبد السلام بدایونی	۱۲۲۴ھ
۴۔ نظم البیان فی مطالب القرآن	شمس الدین شائق ایزدی	۱۳۱۶ھ
۵۔ نظم مقدس	آغا شاعر قزلباش	۱۹۰۱ء
۶۔ تفسیر چغتائی	مرزا ابراہیم بیگ چغتائی	۱۹۳۶
۷۔ وحی منظوم	سیماب اکبر آبادی	۱۹۴۰
۸۔ نظم المعانی	مطیع الرحمن خادم	۱۹۴۶ء
۹۔ تفسیر غضنفر	سید غضنفر علی سونی پتی قبل از	۱۹۴۷
۱۰۔ تفسیر محمد	ابراہیم پانی پتی قبل	۱۹۴۷ء
۱۱۔ تفسیر عرشی	آغا عبد الرحیم عرشی گوالیاری	۱۹۴۹ء
۱۲۔ سحر البیان	حمید الدین اثر نیری	۱۹۵۱ء
۱۳۔ مفہوم القرآن	محمد اویس کیفی بھوپالی	۱۹۵۹ء
۱۴۔ آب روان	سید شمیم اختر	۱۹۶۰ء

ان کے علاوہ بیسیوں جزئی ہیں۔ جس زبان میں ایک کتاب کے تراجم کی یہ حیرت انگیز صورت ہو۔ اس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے

مختلف صورتوں آیتوں پنج سوروں، دعاؤں اور وظیفوں کے مجموعے بہت ہی دیدہ زیب اڈیشن صنائی اور رنگین اہتمام کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔ جو لاکھوں نہیں کروڑوں تک چھپے ہیں۔ مکتبۂ الحسنات رامپور نے بیسویں اور تیسویں پاروں کا آسان فہم ترجمہ کتابی سائز میں شائع کیا ہے۔ اب تک ۸ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اسی طرح مولانا مودودی کی تفہیم القرآن کے تیسویں پارہ کی تفسیر و ترجمہ کو علیحدہ کتابی صورت میں خاص اشاعتی پروگرام کے تحت پہلے ہی اڈیشن کو بیس ہزار کی تعداد میں شائع کیا گیا ہے۔

قرآن کی مقبولیت اور حسنِ طلب کو دیکھ کر بعض ناشرین نے اس کی اشاعت پر خاص توجہ دی ہے۔ تاج کمپنی لاہور کو اشاعتِ قرآن کے لئے سب سے بڑا فخر حاصل ہے۔ ہندوستان میں ادارہ اشاعتِ دینیات نظام الدین دہلی نے اب تک دس سے زیادہ اشاعتی قسمیں پیش کی ہیں تجارتی نفع کی وجہ سے ایسے ناشرین نے بھی توجہ دی ہے جو اس کلام الٰہی کو الہامی صحیفہ تسلیم نہیں کرتے۔ اور آج وہی اشاعتِ قرآن میں سرفہرست ہیں۔

قرآن آخری صحیفہ آسمانی ہے۔ کائناتِ عالم کے لئے رشد و ہدایت کا آخری ذریعہ بھی ہے اس لئے شش جہات کی اس دنیا میں اس کے پیغام کو گھر گھر پہونچانا اس کے پیروؤں کی ذمہ داری ہے۔ غالباً اسی لئے دنیا کی ہر زبان میں اس کے ترجمہ و تفسیر پر بہت ہی سنجیدگی سے توجہ دی جاتی رہی ہے۔ اور ہر دور میں ایک نئی تعبیر و تشریح کو ضروری سمجھا گیا اور اس ضرورت کے پیشِ نظر اسلاف نے اصولِ تفسیر کے ضابطے

اور حدود مقرر کئے ہیں۔ علامہ سیوطی کی الاتقان فی علوم القرآن، شاہ ولی اللہ کی الفوز الکبیر امام مالک اور امام ابن تیمیہ کی اصولِ تفسیر اسی سلسلے کی ناقابلِ فراموش کڑیاں ہیں۔

ترجمہ کے محرک عوامل میں بہت سے اسباب کارفرما ہوتے ہیں ان میں ایمان و عقیدہ یا فکر و نظر کی اشاعت کا رجحان سب سے زیادہ حاوی ہوتا ہے۔ انسانی کمزوری ہے کہ اپنے افکار سے عالم کو روشناس ہی نہیں کرانا چاہتا بلکہ منوانا بھی چاہتا ہے۔ یا اپنے حلقۂ خیال کو وسیع تر بنانے کی مہم جوئی میں سرگرداں اور خدمتِ دین یا خدمتِ خلق کے ذوق سے سرشار ہوتا ہے۔ اس مخصوص لٹریچر کی نشر و اشاعت میں پوری تن دہی سے مصروفِ کار دکھائی دیتا ہے۔ دوسرا محرک جذبہ مال و منافع بھی ہے۔ مادی نقطۂ نظر سے بھرپور اس دنیا میں سود و زیاں سے بے نیاز نہیں رہا جا سکتا۔ افراد اور اداروں کی نظر بازار اور عوام کی قوتِ خرید پر ہوتی ہے اصل کتاب کے موضوع اور مبادیات پر خاص توجہ دی جاتی ہے اسی لئے کتابوں کی اسمگلنگ بھی ہوتی ہے۔ اور ان کی اشاعت پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ سنسنی خیز کتابیں بھی اسی زمرے میں آتی ہیں جن پر بعض وقت کئی ناشرین کی توجہ ہوتی ہے یہ کتابیں کثیر الاشاعت ہوتی ہیں۔ ہمارے ادب میں اس طرح کے ادبی ذخیرے کی کمی نہیں ہے بہ قول انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی اور سب سے زیادہ چھپنے والی کتاب قرآن ہے اور اس کتاب سے متعلق ادبیات کا ایک گراں مایہ ذخیرہ موجود ہے اور اس ذخیرے نے ترجمہ میں خاصا اضافہ کیا ہے، اور ان ترجموں نے علوم و آگہی میں سب سے زیادہ توسیع کے ساتھ انسانی ذکر و فکر کے رخ و رفتار کو تیز تر کیا ہے۔

قرآن اسلام کا اصل الاصول ہے، احادیث اس کی توضیح و تشریح اور جزئیات

وتفصیلات کا سب سے بیش بہا ذخیرہ ہیں۔ دنیائے ادب میں یہ ایک لازوال ذخیرہ ادب ہے۔ جس کی ضخامت تخیل و تصور سے بھی بالاتر ہے۔ اور پھر اس عظیم سرمایہ سے پیدا ہونے علوم فنون سے متعلق دوسری تصانیف کا بھی ایک وافر مجموعہ موجود ہے۔ تراجم قرآن کے بعد علما احادیث کی طرف متوجہ ہوئے اب تقریباً ہر مجموعہ حدیث کا اردو ترجمہ موجود ہے اور عوام و خواص کی رسائی میں ہے۔ صحاح ستہ کے مجموعے کچھ پہلے اور کچھ بعد میں اردو میں منتقل ہوئے۔ بخاری شریف، تجرید بخاری، تلخیص بخاری، مشکوۃ شریف کامل، ترمذی شریف کامل، ترمذی شریف، شمائل ترمذی، سنن ابن ماجہ، صحیح مسلم شریف، موطا امام مالک، موطا امام محمد، مسند امام مسلم، کتاب الآثار کے علاوہ زاد سفر جلد اوّل۔ امام نووی شارح صحیح مسلم کی مشہور کتاب ریاض الصالحین کا عام فہم ترجمہ ہے یہ احادیث کا پہلا اردو ترجمہ ہے۔ جسے ایک خاتون مولانا ابوالحسن علی ندوی کی خواہر عزیزہ امت اللہ تسنیم نے انجام دیا ہے۔ حصن حصین وظائف اور دعاؤں کا مشہور ترین مجموعہ ہے اس کے دو ترجمے ہوئے ہیں۔ صحیفہ ہمام بن منبہ اور جامع بیان العلم وفضلہ نادر کتابوں کا ترجمہ بھی ملتا ہے۔

خدمت حدیث میں مولانا بدر عالم میرٹھی کا کارنامہ قابل رشک ہے انہوں نے ترجمان السنہ (چار جلدیں) کے نام سے ایک نیا انتخاب ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے صفحات کی کل تعداد بڑی سائز کے ۲۱۷۸ ہے۔

اسی طرح کلام نبوت، الدین الحنیف، معارف الحدیث (چار جلدیں) کے انتخاب صحاح ستہ انتخاب الترغیب والترہیب، اردو حدیث وغیرہ احادیث تراجم ہیں۔ اس عہد کے سب سے مشہور بزرگ حضرت مولانا محمد زکریا شیخ الحدیث نے احادیث کے انتخاب

و ترجمہ کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا جو تبلیغی نصاب کے نام سے مشہورِ عام ہے یہ براہ راست کسی کتاب کا ترجمہ نہیں لیکن اس میں احادیث کے تراجم کا خاصا ذخیرہ موجود ہے حکایاتِ صحابہ، فضائلِ نماز، فضائلِ رمضان، فضائلِ ذکر، فضائلِ تبلیغ، فضائلِ قرآن، فضائلِ درود شریف، علیحدہ صورتوں میں بھی ملتے ہیں یہ امر قابلِ ذکر ہے۔ موجودہ دور میں قرآن کے بعد سب زیادہ شائع ہونے والی یہی کتاب ہے۔ صحیح تعداد کا علم نہیں کیونکہ ناشر سن اشاعت اور تعدادِ اشاعت نہیں بتاتا۔ اس میں اس کی اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں۔

مشکوٰۃ شریف کا ترجمہ مظاہر حق کے نام سے نولکشور نے چار جلدوں میں شائع کیا تھا اب تتمہ جلد چہارم ملا کر پانچ جلدیں شائع ہیں کل صفحات کی تعداد ۲۲۴۸ ہوتی ہے۔ آٹھواں نقش ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا ہے، الجواہر والزواہر کا ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ مشکوٰۃ الانوار کا ترجمہ تحفۃ الاخیار کے نام سے ہوا ہے۔ نماز و دعا اور اوراد و وظائف پر مشتمل قرآن و احادیث کے کئی ایک انتخاب ترجموں کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں اور کئی ہزار کی تعداد میں مولانا محمد عاشق الٰہی کی مسنون دعائیں سب سے زیادہ مقبول ہوئی ہیں الجواہر الزواہر بھی انقیس کا کیا ہوا ترجمہ ہے اذکارِ مسنونہ مجموعہ اوراد بھی اردو میں موجود ہے۔

حالات کے بدلتے ہوئے تقاضوں کی وجہ سے اسالیبِ فکر میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جمعہ کے خطبات کے بارے دو نقطہ ہائے نظر کار فرما تھے۔ کچھ لوگ صرف عربی متن کی قرات پر اصرار کرتے تھے دوسرا طبقہ اردو ترجمہ کا بھی حامی تھا ہندوستان میں عام طور پر مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، شاہ اسمٰعیل شہید، مولانا اشرف علی

تھانوی، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا علی کے خطبے رائج ہیں۔ آخرالذکر دیہات و قصبات میں زیادہ معروف ہے۔ ان خطبوں کے تراجم بھی دستیاب ہیں۔

قرآن اور احادیث سے شب و روز کی زندگی اور سماج کے لئے ایک ضابطۂ حیات مقرر کیا گیا ہے فرد اور جماعتی زندگی کے قوانین مرتب کئے گئے ہیں انھیں تشریعی قوانین پر عمل پیرا ہو کر دونوں عالم میں سرخرو ہوا جا سکتا ہے۔ اسے فقہ اسلامی اور تاریخ فقہ اسلامی کہتے ہیں۔ تاریخ فقہِ اسلامی، زہرہ ریاض الابرار، فتاویٰ عالمگیری۔ فتاویٰ عزیزیہ، فتاویٰ نذیریہ، عین الہدایہ، غایۃ الاوطار کی ضخیم جلدیں اسی سلسلے کی یادگارِ زمانہ تراجم ہیں۔ فقہی احکام و مسائل سے متعلق شیخ الحدیث عبدالجلیل سامرودی کی عربی تالیف زہرہ ریاض الابرار کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

اسلامی آئین و آثار میں قرآن و احادیث کے بعد تاریخ و سیر کو فوقیت حاصل ہے سیرت نگاروں کو اس موضوع سے جو والہانہ عقیدت رہی ہے اس کی نظیر قلب مومن کے سوا دوسری جگہ ناپید ہے۔ اس گراں قدر اور بے مثل خدمت ادب سے پوری انسانیت زیر بار ہے۔ سیرت نگاروں نے اسے سیرت یا سوانح نگاری کے اعلیٰ ترین فن کی صورت ہی نہیں بخشی بلکہ اسے انسانی علم و ادب کی معراج بنا دیا۔ سیرت رسول سیرتِ کائناتِ عالم ہے اس سیرت پاک کے شایان شان بھی یہی تھا کہ زندگی کے تمام احوال و کوائف، جلوت و خلوت کے سارے پہلو، شب و روز کی پوری تفصیلات ذکر و فکر کے تمام اقوال و اسالیب اس طرح محفوظ ہو جائیں کہ رہتی دنیا کے لئے رشد و ہدایت کا سرچشمۂ فیض بنے رہیں۔ ذہنِ اسلاف کی ندرت کا یہ اختراعی کارنامہ پوری انسانیت کے لئے باعثِ افتخار و امتیاز ہے اردو میں سیرت

نبوی پر ایک گرانمایہ ذخیرہ موجود ہے۔ لیکن مولانا شبلی کی سیرۃ النبی اور زمانۂ حال میں نعیم صدیقی کی تصنیف محسن انسانیت کو سب سے زیادہ شہرت ملی ان کے انگریزی تراجم بھی ملتے ہیں۔ ــــــ آنحضرتؐ کی سیرت پر سیرتِ حلبیہ مشہور تصنیف تسلیم کی جاتی ہے اسے خاص اشاعتی پروگرام کے تحت اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔

سیرۃ النبیؐ کامل ۔ عبد الجلیل صدیقی اور غلام رسول مہر کا ترجمہ سیرت ابن ہشام ہے۔ منہاج النبوۃ مدارج النبوہ کا ترجمہ ہے۔ اس کی ضخامت ۱۸۴۷ صفحات پر مشتمل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبات و معاہدات، بلوغ المرام، منہاج النبوۃ بلاغ المبین۔ سیرتِ نبوی کی اولین کتابیں اور ان کے مولفین، النبی الامی، اسوہ حسنہ اثبات النبوۃ وغیرہ کتابیں اسی سے متعلق تصانیف ہیں۔

سیرت نگاروں نے پیغمبر اسلام کے بعد صحابہ کرام کی سیرت پر توجہ دی ہے صحابیات کا یہ حصہ کافی ضخیم متنوع اور دلکش تراجم کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ "حیات الصحابہ" دعوت و تبلیغ کی عالمگیر تحریک کی امیر ثانی مولانا محمد یوسف کاندھلوی مرحوم کی بے نظیر کتاب ہے اردو میں تین جلدوں میں منتقل کیا گیا ہے۔ صفحات کی کل تعداد ۲۲۷۲ ہے میری رائے میں اردو ترجموں میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا یہی ترجمہ ہے۔ اب تک چھ اڈیشن نکل چکے ہیں اور ناشر کے بیان کے مطابق ہر اڈیشن پانچ ہزار پر مشتمل ہوتا ہے آفسٹ کی کتابت و طباعت کا اہتمام بھی موضوع کے شایانِ شان ہے۔ عثمانؓ اور علیؓ زمانۂ حال کے مشہور مصری عالم ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی یادگار ہیں۔ ابوبکر صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقِ اعظمؓ محمد حسین ہیکل کی مشہور زمانہ تصانیف ہیں۔ الموافقۃ بین اہل البیت والصحابہ علامہ زمخشریؒ کی

کی کتاب کا ترجمہ ہے۔

غزواتِ حیدری، لسان المتقین، جامع جعفری، رشید المومنین سراج السالکین بھی اسی سلسلے کے تراجم ہیں۔

زمانۂ جدید میں چند عظیم المرتبت شخصیتوں نے اپنی فکر انگیز اور انقلاب آفریں تحریروں سے متاثر کیا ہے۔ ایسی برگزیدہ ہستیوں میں سید قطب شہید کا نام سرِ فہرست ہے ان کی تصانیف کے ترجمے کئی زبانوں میں دستیاب ہیں ان کی مشہور تصنیف "اسلام میں عدلِ اجتماعی کا سادہ مگر دلکش ترجمہ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی نے کیا ہے۔ اسلام کا روشن مستقبل" اسلام ایک ضرورت، نقوشِ راہ، کیا مسلمان متعصب ہوتے ہیں وغیرہ، ان کی دوسری تصنیف کا ترجمہ بھی ملتا ہے۔ فلپ حتی کی مشہور کتاب "عرب اور اسلام کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ سید مبارز الدین رفعت اس کے مترجم ہیں مشہور مورخ ڈاکٹر تارا چند کی معروف کتاب Impact of Islam on Indian Culture کا دو ترجمہ دیکھنے میں آتا ہے ایک ہندوستان کا دوسرا پاکستان کا۔ محمد بن علی بن طباطبا کی الفخری کا ترجمہ تاریخ الفخری کے نام سے شائع ہوا ہے۔ شاہ ولی اللہ کی حجت اللہ البالغہ، ازالۃ الخفا، اسلامی نظام معیشت وغیرہ اب اردو میں بھی دستیاب ہیں۔ حافظ ابن قیم کی "اعتدال کی راہ، افکارِ مسنونہ کا ترجمہ مرکزی جماعت اسلامی ہند نے شائع کیا ہے۔

عالم اسلام کے مایۂ ناز مفکر سید ابو الحسن علی ندوی کی کئی تصانیف پہلے عربی میں لکھی گئیں۔ اس کے بعد ان کا دنیا کی دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ان کی مشہور ترین تصنیف ہے جس کے اب تک

آٹھ قانونی اڈیشن عربی میں شائع ہو چکے ہیں - انگریزی میں دو، فارسی میں دو، ترکی میں ایک اور اردو میں سات اڈیشن شائع ہو چکے ہیں - مذہبی تصانیف کی ہمہ گیری اور مقبولیت کا راز ان اعداد و شمار میں دریافت کیا جا سکتا ہے - مولانا کی دوسری کتاب ارکانِ اربع ہے جس کے عربی میں چار، ترکی میں دو اردو میں دو اور انگریزی میں ایک اڈیشن نکل چکا ہے - "ہندوستانی مسلمان"

مولانا کے عربی خطبات کا اردو ترجمہ ہے - دوسرا نقش میرے پیشِ نظر ہے مولانا کی ایک ادبی کتاب "روائعِ اقبال" عربی میں تھی نقوشِ اقبال کے نام سے اردو ترجمے کے دو اڈیشن ختم ہو چکے ہیں - شمس تبریز خاں نے ترجمے کو تخلیق کا حریف بنا دیا ہے ڈاکٹر محمد آصف قدوائی نے اس کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے - مولانا محترم کے عربی خطبات کے تراجم کی کئی جلدیں ہو سکتی ہیں جو وقتاً فوقتاً ندائے ملت اور تعمیر حیات میں شائع ہوتے رہتے ہیں - شمس تبریز خاں نے امام ابن تیمیہ کی کتاب اقتضاء الصراط المستقیم کا ترجمہ شائع کرایا ہے - جرمنی کے مشہور نومسلم محمد اسد کی طوفان سے ساحل تک "فکری سرگذشت کی داستان حیرت خیز ہے پروفیسر خورشید احمد فارق کے دو تراجم" اسلامی دنیا" دسویں صدی عیسوی میں" اور تاریخ ردہ قابلِ ذکر ہیں - سید امیر علی کی مشہور انگریزی کتاب تاریخ اسلام کے نام سے شائع ہوتی ہے - دھرتی پر انسان شیخ عبدالقادر عودہ کی کتاب کا ترجمہ ہے -

قصیدہ بردہ شریف ایک ادبی شاہکار ہے - امام شرف الدین البوصیری الدلاصی کے عربی قصیدہ کو مولانا جامی نے فارسی میں منظوم کیا تھا - محمد فیاض الدین نظامی نے اردو منظوم ترجمے کو بہت ہی دیدہ زیب کتابت و طباعت کے اہتمام سے آراستہ کیا ہے

عربی اور فارسی متن بھی ساتھ ساتھ ہیں۔ ارمغانِ حجاز دانائے راز کا نذرانۂ عقیدت ہے جسے بارگاہ رسالت مآب میں گدائے بے نوا نے پیش کیا ہے اردو کے کہنہ مشق شاعر منور لکھنوی نے اسے نظم کی صورت دی ہے اقبال کی تمام فارسی اور انگریزی تصانیف کے تراجم بھی اردو میں موجود ہیں۔ ان کی شرحیں علیحدہ ہیں۔ کبیر بانی کبیر داس کی ۱۲۸ منتخب نظموں کا ترجمہ و تشریح ہے۔ مثنوی مولانا روم اور سعدی کی گلستاں بوستاں کے کئی تراجم دیکھنے میں آئے ہیں۔ یہ اردو کی جامعیت اور ہر دلعزیزی کی مثالیں۔ مثنوی معنوی کا ترجمہ پیراہنِ یوسفی کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوا تھا جس کے صفحات کی کل تعداد ۱۲۳۰ ہے۔

النظم الاسلامیہ، الاسلام والحضارۃ العربیہ، تاریخ التشریع الاسلامی الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند طبقات الامم جیسی مستند اور بنیادی کتابوں کے تراجم پورے اہتمام سے شائع ہو چکے ہیں۔ اور ان کے سہارے اردو خواں فکر و نظر کی بالیدگی اور علم و آگہی کا عرفان حاصل کر سکتا ہے۔ اور ان اصل ماخذ تک رسائی ہو سکتی ہے۔

حکومتِ الٰہیہ علامہ حمید الدین فراہی کی کتاب ملکوت اللہ کا ترجمہ ہے۔ مذاق العارفین (احیائے علوم الدین) اور اکسیر ہدایت (کیمیائے سعادت) کا ترجمہ ہے۔ اول الذکر کتاب کی ضخامت ۱۸۱۲ اور آخر الذکر کے صفحات کی تعداد ۶۲۹ ہے۔ کیمیائے سعادت کا ایک دوسرا بھی ترجمہ ہے جو گنجینۂ ہدایت کے نام سے معروف ہے اور اس میں ۸۵۲ صفحات ہیں۔ المرشد الامین احیائے علوم، دوسرا ترجمہ نہیں بلکہ تلخیص ہے اس کا تیسرا ترجمہ دورِ حاضر کی یادگار ہے۔ اس کا نام اسلام کی اخلاقی تعلیم ہے۔

فکر ساز اور برگزیدہ ہستیوں کی تحریر و تقریر کو محفوظ کرنے کا محترم جذبہ ہمیشہ کارفرما

رہا ہے ۔ ان کے ملفوظات، مکاتیب اور خطبات کا ایک بیش قیمتی ذخیرۂ ادب کا گراں بہا حصہ بن چکا ہے اسی حصۂ ادب کو بھی اردو میں بڑی سرعت سے منتقل کیا گیا ہے مکاتیب کی نوعیت، تاریخی اور تہذیبی نیز علمی ہی نہیں ہے بلکہ ادبی سماجی اور فکری بھی ہے ۔ اسی افادیت کے پیش نظر ان کے تراجم کی ضرورت محسوس کی گئی ۔ اس موضوع کے تراجم میں پروفیسر خورشید احمد فارق کے تراجم قابل ذکر ہیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سرکاری خطوط، حضرت عمر فاروق رضؓ کے سرکاری خطوط، اور حضرت عثمان رضؓ کے سرکاری خطوط ندوۃ المصنفین دہلی شائع کر چکا ہے ۔ مکتوبات امام ربانی، مکتوبات خواجہ معصوم سرہندی کو مولانا نسیم امروہوی نے شائع کرایا ہے ۔ ان کے سو مکاتیب جو ازواج مطہرات کی صفات عالیہ اور مناصب جلیلہ سے متعلق ہیں ان کا بھی ترجمہ علیحدہ کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے ۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات کو اردو قالب دیا ہے ۔ بانیٔ دیوبند مولانا قاسم نانوتوی کے مجموعۂ مکاتیب کا ترجمہ بھی حال ہی میں تشریح کے ساتھ شائع ہوا ہے ۔ ان کے افادات حجت السلام کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے ۔ براہین قاسمیہ مولانا قاسم نانوتوی کے ارشادات کا اردو ترجمہ ہے ۔ مرزا جان جاناں کے خطوط بھی ترجمہ کی صورت میں ملتے ہیں ۔

تصوف دنیائے علم و عرفان اور فکر و دانش کا دلچسپ موضوع رہا ہے آج کے دور ابتلا میں بھی ذہن انسانی اور سماجی شعور کو کسی نہ کسی حد تک متاثر کر رہا ہے عربی و فارسی میں اس موضوع اور اس کی جزئیات سے متعلق ادب کا سرمایہ خاصا ضخیم ہے اس کی تاویل و توجیہہ، تذکرہ و تاریخ، مطالعہ و مشاہدات کو قلم بند کیا گیا ہے ۔ ان کلاسیکی

کتابوں کو استفادۂ عام کے لئے اردو صورت دی گئی ہے۔ روضۃ الاصفیاء، تذکرۃ الاولیا روضۃ الاولیاء، کشف المحجوب، خیر المجالس، تاریخ تصوف اسلام کے اردو تراجم ملتے ہیں ڈاکٹر تنویر علوی نے صحائف معرفت، اور صحیفہ ابرار جیسی کم معروف مگر مفید تصانیف کے تراجم پیش کئے ہیں۔ علم کی بڑی خدمت ہے اور قابل ستائش بھی۔ شیخ عبدالقادر جیلانی کی غنیۃ الطالبین، فتوح الغیب اور خطبات کے اردو تراجم ملتے ہیں بحر العلوم علامہ عبدالعلیم انصاری کی کتاب "وحدت الوجود" اردو میں دستیاب ہے اسمٰعیل شہید کی عبقات کا ترجمہ مولانا مناظر احسن گیلانی نے مکمل کیا ہے۔ بچن سنگھ طالب نے بابا فرید گنج شکر پر انگریزی میں ایک مختصر رسالہ لکھا تھا۔ ابھی حال ہی میں اس کا اردو ترجمہ منظر عام پر آیا ہے۔ دارا شکوہ کی مشہور تصنیف مجمع البحرین کے اردو ترجمہ کا نام نور العین ہے۔ مخزن الانوار گنج الاسرار کا ترجمہ ہے۔

تصوف تزکیہ نفس، اور تطہیر باطن کا دوسرا نام ہے دھیان گیان اور مشق و مزاولت کا زور انھیں پر صرف کیا جاتا ہے۔ اچھے اخلاق اور اقدار کی تربیت اس کا موضوع ہے یہ جذبہ فرد سے بیدار ہو کر سماج کی پہنائیوں میں گم ہو جاتا ہے اخلاقی ادب مشرقی ادبیات کا بہت ہی پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ یہ جذبہ اسے نہ تو سرتاپا مذہبی کہہ سکتے ہیں۔ اور نہ غیر مذہبی، کیف و کم، موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے یہ حصہ ادب مذہب سے زیادہ قریب ہے۔

اخلاقی ادب کا خاطر خواہ حصہ اردو میں منتقل ہو چکا ہے۔ اخلاق جلالی، اخلاق ناصری، اخلاق محسنی کے تراجم فورٹ ولیم کالج کے قیام سے شروع ہو جاتے ہیں۔ اور آج یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ دنیا کے قابل قدر مذاہب اور بوستاں کے اخلاق آداب و

افکار سے اردو کے ذریعہ اچھی طرح واقفیت بہم پہونچائی جا سکتی ہے،

نفسیاتِ واردات روحانی

تاریخ اخلاق یورپ جلد اول و جلد دوم

غزالی کا تصور اخلاق

فرض شناسی، ضبطِ نفس اور نفس پرستی، نظامِ حیات انسانی، علم اخلاق، اخلاقیات، تاریخ اخلاقیات، علم الاخلاق، مکالمات برکلے اخلاق لقوماجس وغیرہ کتابیں اسی ذہنی رجحان اور شعوری احساس کا پتہ دیتی ہیں۔

اردو صوت و آہنگ کی ادائیگی کے لئے مشہور ہے اور دنیا کی بیشتر آوازوں کے اظہار پر قدرت رکھتی ہے صوت و صدا کے اعتبار سے یہ ایک آفاقی زبان کی خصوصیات رکھتی ہیں۔ انسانی فکر جذبے اور تخیل کے لطیف ترین احساسات کو بھی بخوبی پیش کرنے کی صلاحیتوں سے مالا مال ہے یہ کئی مختلف تہذیبوں کے امتزاج کا خوب صورت مجموعہ ہے۔ یہ امتزاج اس کے خمیر، ساخت ترکیب اور ترویج کے ہر دور میں پایا جاتا۔ اس کی بنیاد اسی امتزاج پر قائم ہے۔

مشرقِ وسطی اور ہندوستان کی مختلف تہذیبی اکائیوں کا اتنا دلنشین امتزاج دوسری جگہ دیکھنے میں نہیں آتا۔ اسی لئے اردو کو صرف ایک زبان یا وسیلۂ اظہار نہیں کہہ سکتے بلکہ اسے ایک مکمل تہذیب کہنا چاہیئے۔ جس کے جلو میں مختلف ثقافتوں کی روح نے ایک نئی قالب اختیار کی ہے۔ اردو نے مشرقِ وسطی کے افکار و عقائد کی نشر و اشاعت میں بھی سب سے بڑا رول ادا کیا ہے اور یہ فخر یہاں کی کسی دوسری زبان کو حاصل نہیں ہے۔

اس امر کا بخوبی اندازہ ڈاکٹر محمد عزیز مرحوم کی تصنیف "اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں

اردو کا حصہ ٭ کے مطالعہ سے لگایا جا سکتا ہے اردو نے ہندو، بدھ، سکھ، جین، آریہ سماج، برہمو سماج کی یکساں خدمت کی ہے۔ ہندوستان مذہبی اور نیم مذہبی ادب اور ان سے متعلق اساطیری ادب کا ضخیم حصہ رکھتا ہے، جس کے صفحات کا شمار آسان نہیں ہے۔ وید، پران، مہا بھارت، گیتا، راماین اور پھران کی تفصیلات اور جزئیات پر مشتمل تصانیف کا کثیر لٹریچر قابلِ ذکر ہے ان میں گیتا کو سب سے اونچا مقام حاصل ہے یہ ہندو عقائد کی اساس ہے۔ اور ہر دور میں اس کے ترجمہ و تشریح پر توجہ دی جاتی رہی ہے اردو میں سب سے زیادہ ترجمہ اسی کتاب کا ملتا ہے یوں تو ایک عام اندازے کے مطابق رامائن کے مکمل اور نا تمام شامل کر کے تقریباً بیس ترجمے ہوتے ہیں لیکن گیتا کے تراجم کی تعداد اس سے زیادہ ہے راقم السطور کی نظر سے گذرے ہوئے ترجموں کی حسب ذیل فہرست سے اس امر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

گیان پرکاش	منشی کنھیا لال عرف الکھ دھاری
گوہر معرفت	گوری ناتھ منظوم
گلدستۂ حقیقت	سیتل پرشاد احقر منظوم
سکھ ساگر	رائے لکھن لال
سٹیک سری مدبھاگوت گیتا	تین جلدوں میں سوامی مترجین
دیدی بھاگوت	پنڈت پیارے لال
وشنو بھاگوت	منشی رگھبیر دیال
گیتا مہاتم	منشی رام سہائے تمنا
شری مدبھگوت گیتا،	موسوم بہ فلسفۂ الوہیت پنڈت جانکی ناتھ مدن

مخزنِ اسرار	پنڈت دینا ناتھ مدن منظوم
شری مد بھگوت گیتا	پنڈت جانکی ناتھ
بھگوت گیتا منظوم	منشی رام سہائے تمنا
سری مد بھگوت گیتا منظوم	منشی پنالال بھارگو
سری مد بھگوت گیتا	ترلیسن جی
بھگوت گیتا معہ ترجمہ اردو	بھگوان داس بھارگو
زیورِ ہند یا سری مد بھگوت گیتا	سید حبیب منظوم
نغمۂ رحمانی	گیتا نظم مد شرح ۔ منشی سورج نرائن مہر
نغمۂ الوہیت ۔	حسن الدین احمد
آہنگِ سرمدی	المظفر نگری منظوم
نسیمِ عرفانی	منور لکھنوی منظوم
دل کی گیتا	خواجہ دل محمد منظوم
منظوم دلآویز	سردار سنگھ بھارگو
بھگوت گیتا	منشی دیوی پرشاد
بھگوت گیتا یا نغمہ خداوندی	محمد اجمل خاں

گیتا پر دچن (ونوبا بھاوے کی تفسیر گیتا) خواجہ ذکریا فیاضی

کلامِ ربانی شری مد بھگوت گیتا منظوم، یوگی راج نظر سوہانسوی

شری مد بھگوت گیتا رہسیہ اور شری مد بھگوت گیتا کے نام سے لوک مانیہ تلک نے دو کتابیں لکھی تھیں ان کا ترجمہ شانتی نرائن نے کیا ہے اس کے علاوہ بھی

اور ترجمے ہوں گے جو ہنوز تحقیق طلب ہیں اس فہرست سے گیتا کے تراجم پر خصوصی توجہ
کے اسباب سمجھ میں آسکتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ صرف گیتا پر توجہ دی گئی ہے وید
پران اپنشد، منوسمرتی، درشن، یوگ، بھگتی، مہابھارت اور رامائن کے علاوہ دوسرے
اخلاقی، مذہبی تصانیف کے قابلِ ذکر تراجم موجود ہیں مگر اتنی کثرت سے نہیں۔ گیتا کے
علاوہ دوسری کتابوں کے تراجم میں ادبی اسلوب کاری کا فن تقریباً ناپید ہے۔ یہ
تراجم سیدھے سادے اور سپاٹ انداز لئے ہوئے ہیں ان میں جاذبیت
یا شعر و نغمہ کا فقدان ہے۔ اور مذہبی اصطلاحات کا کثرتِ استعمال ان کو بوجھل
بنادیتا ہے۔ گیتا کے بعض تراجم میں ادبیت اور پرکشش اسلوب نگارش ملتا ہے
ڈاکٹر محمد عزیر مرحوم نے لکھا ہے کہ گیتا کا سب سے اچھا ترجمہ پنڈت جانکی ناتھ مدن دہلوی
کا فلسفۂ الوہیت ہے لیکن میرا خیال ہے کہ سب سے اچھا ترجمہ خواجہ دل محمد کا ہے۔

ان کے علاوہ چاروں ویدوں کے خلاصے کا ترجمہ الکھ دھاری عرف منشی
کنھیالال نے الکھ پرکاش کے نام سے کیا تھا جو ۱۸۶۱ء میں شائع ہوا تھا۔ منشی
سورج نرائن مہر دہلوی نے اُپ نشد کا ترجمہ اور شرح چار جلدوں میں لکھی ہے۔ بابو
پیارے لال نے "مجموعۂ اُپ نشد" کے نام سے بارہ اپ نشدوں کا ترجمہ اور شرح ۱۹--ء
میں شائع کی تھی۔ سوامی وویکانند کی کتاب "بھگتی اور ویدانت" کا ترجمہ شانتی نرائن
نے کیا ہے۔ سوامی نسچل داس کی مشہور تصنیف کا آسان ترجمہ اردو وچار ساگر کے نام
سے شائع ہوا تھا۔ عملی ویدانت، یوگ شاستر، گیان یوگ، بھگتی رہسیہ، بھگت مال
وغیرہ تراجم اسی سلسلے کی مختلف النوع کڑیاں ہیں۔ ڈاکٹر محمد عزیر مرحوم نے مہابھارت
سری رام کرت مہابھارت، مہابھارت منظوم بو منشی طوطا رام شایاں کا ترجمہ ہے

دس ہزار اشعار پر مشتمل فیضی کے مہابھارت کا پہلا منظوم اردو ترجمہ ہے ۔ ۱۹۳۰ء میں پانچواں اڈیشن شائع ہوا یہ زبان و بیان کی دل کشی کی وجہ سے خوب مقبول ہوا آزادی کے بعد پنجابی پستک بھنڈار اور دیہاتی پستک بھنڈار دہلی نے ہندو مذہب کی بعض کلاسیکی کتابوں کے ترجمے شائع کئے ہیں، مگر ان کا معیار طباعت و کتابت بہت ہی افسوس ناک ہے، ترجمے بھی اچھے نہیں ہیں ۔ جیسے مہابھارت اور سمپورن مہابھارت اصولِ فلسفۂ ہنود وغیرہ ۔

ہندوستان کی سرزمین مذہبی رہنماؤں اور مصلحوں سے کبھی خالی نہیں رہی ۔ انھیں کی سرپرستی یا زیرِ اثر اکثر و بیشتر اصلاحی تحریکیں وجود میں آتی رہیں ۔ انھوں نے اپنے مشن کو عوام تک پہونچانے کے لئے ہمیشہ اردو کا سہارا لیا ۔ اردو کا یہ ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے وہ ہر خیال اور ہر مذہب کو فروغ دینے کے لئے ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ پیش پیش رہی ہے ۔ بدھ مذہب، جین مذہب، سکھ مذہب کے علاوہ کبیر پنتھی، بھگتی تحریک، برہمو سماج، آریہ سماج، رادھا سوامی مت، دیو سماج، وید سماج، وغیرہ سے متعلق اردو میں ترجمہ کا ذخیرہ موجود ہے ۔

ان تحریکوں میں سب سے زیادہ مقبولیت اور شہرت آریہ سماج کو حاصل ہوئی اس کے چند اسباب ہیں اس کا سرمایۂ ادب بھی دوسری تحریکوں سے کہیں زیادہ ہے اسی تحریک نے اردو زبان کو اپنے عقائد کی ترسیل کا وسیلہ قرار دیا ۔ بہت سی کتابیں اور رسالے جاری ہوئے ۔ عبادت کے طریقے بھی اردو کے سہارے عوام تک پہونچائے گئے ۔ آریہ سماج کی سب سے مشہور کتاب ستیارتھ پرکاش ہے جو تحریک کے بانی سوامی دیانند سرسوتی کی تصنیف ہے اس کتاب کے کئی اردو ترجمے ملتے ہیں جیسے آنند رام

رادھاکرشن مہتہ، لالہ جیون داس، پھوپتی وغیرہ۔ اس بنیادی کتاب کے علاوہ دوسری کتابوں کے تراجم بھی شائع ہوتے ۔ جیسے سورگباشی مہرشی سوامی دیانند سرسوتی جی کا جیون چرتر، اپدیش منجری، پرشارتھ پرکاش، رگ وید آدی بھاس بھومکا، یجر وید سنسکار ودھی، سندھیا منظوم، اصل ستیارتھ پرکاش وغیرہ اس تحریک سے متعلق کتابیں یا رسالے تراجم کی صورت میں کم ہیں اور طبع زاد زیادہ ہیں۔ لیکن ترجموں کا انداز بدلا نہیں بلکہ عبارت میں وہی ثقالت اور گراں باری ہے۔ جس کا اندازہ ان کتابوں کے ناموں سے ہوتا ہے ان تراجم کے مقابلے میں طبع زاد کتابوں کی عبارتیں زیادہ صاف اور رواں ہیں۔

جین مذہب سے متعلق بھی کتابیں لکھی گئیں مگر تراجم کا حصہ زیادہ نہیں۔ شری تادشک سوترا ردو، ویراگ پرکاش قابلِ ذکر ہیں۔ بدھ مذہب سے متعلق کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ چونکہ یہ مذہب تبلیغی مشن سے محروم اور قدیم دور کی یادگار ہے ہماری سرزمین سے بھی دور ہونے کی وجہ سے اردو سے اسے وہ قربت نہ رہی۔ بھگوان بدھ دھرما تند کوسیمی کی مراٹھی کلاسیک کا ترجمہ پرکاش پنڈت نے کیا ہے، دھمپد مہاتما گوتم بدھ کی تعلیمات سے متعلق اہم ترین کتاب ہے۔ اسے گیتا جیسا مقام حاصل ہے منور لکھنوی نے اس کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ دھمپد کا ایک نثری ترجمہ رنگ محل دہلی سے بھی شائع ہوا ہے مگر مترجم کا نام درج نہیں۔ اس دور کے مشہور شاعر منور لکھنوی کو ترجمے کی ادبیات میں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ آزادی کے بعد انھوں نے بہت سی اہم تصانیف کو اردو میں منتقل کیا اور نظم کی صورت دی ان کے منظوم تراجم دوسرے مترجمین سے بہتر ہیں، گیتا، شکنتلا اور ارمغانِ حجاز کے علاوہ آریہ ابھی نے سوامی دویکانند

کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ پرم بھگت جے دیو کی مشہور سنسکرت تصنیف کا گیت گوبند یا سرمدی نغمے کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ مالویہ کا گن منترے اور ساگر سنگیت یا بحر ترنم بھی انھیں کا ترجمہ ہے۔ موخرالذکر مشہور پیشوا۔ سی آر داس کی عشق و معرفت سے لبریز کتاب اروند گھوش نے اسے انگریزی میں منتقل کیا تھا۔ منور لکھنوی نے اسی انگریزی ترجمے کے سہارے اردو کا لباس دیا ہے۔

اردو شمالی ہندوستان میں بہ طور خاص مستعمل تھی۔ گنگا جمنا کے دوآبے کے ساتھ پورے شمال مغرب میں رائج تھی، اور اظہار و ابلاغ کے لئے سب سے زیادہ کارآمد اور ترقی یافتہ زبان تھی۔ مذہبی اعتبار سے یہی علاقہ مختلف عقائد کے مناظرے مباحثے کا میدان بھی تھا۔ عیسائی مشنریاں ہر عقیدے سے متصادم تھیں، بعد میں آریہ سماج برہمو سماج، قادیانی بہائی فرقوں کے درمیان بھی بحث و مباحثہ کا زور تھا، سکھ مذہب اسی علاقے میں بوجوہ پروان چڑھا اردو زبان نے اس مذہب کی ترویج و اشاعت میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر خدمت انجام دی، سکھ مذہب سے متعلق اردو میں وقیع سرمایہ موجود ہے۔

آمادی وار، پوتھی راہ راس، پوتھی سکھومنی صاحب، جپ جی صاحب سٹیک عطر روحانی (ترجمہ جپ جی)، پوتھی پنج گرنتھی، پوتھی سکھومتی سٹیک، پوتھی جپ جی اسٹیک، سری جپ جی سٹیک، پوتھی شبد نادیں محل، پھول پٹاری اردو، جنم ساکھی بھائی والا والی کے علاوہ کچھ اور تراجم بھی قابل ذکر ہیں۔ جیسے گرونانک صاحب کا عارفانہ کلام "جپ جی صاحب یا ذکرِ الٰہی گوپال سنگھ کی کتاب "گرونانک دیو" کا اردو ترجمہ مخمور جالندھری نے کیا ہے۔ گرو گوبند سنگھ انگریزی کتاب کا بہت ہی دلکش

سادہ اور رواں اردو ترجمہ پروفیسر محمد حسین نے کیا ہے جو عنقریب منظر عام پر آنے والا ہے گرو گوبند کے فارسی کلام ظفر نامہ کا بھی اردو ترجمہ موجود ہے۔ سلوک بابا فرید شکر گنج کا ترجمہ اردو کے مشہور افسانہ نگار رتن سنگھ نے کیا ہے۔

انگریزی حکومت مغربی تہذیب و ثقافت کے ساتھ داخل ہوئی۔ علم وفن کے ساتھ فکر و نظر اور مذہب و عقیدہ بھی ساتھ ساتھ آئے لیکن اس حکمت عملی میں مذہب کی تبلیغ و توسیع کو اولیت حاصل تھی۔ مذہبی عقائد کے فروغ کو حکومت کو سرپرستی حاصل تھی۔ اس سرپرستی کے نتیجے میں عیسائی مذہب کو پھیلانے کے لئے سنہری مواقع ملے۔ عیسائی مشنریاں دین کی اشاعت میں سرگرم کار تھیں ضرورت اس بات کی تھی کہ عوام تک اپنے مشن کو پہونچانے کے لئے عوام کی زبان بھی استعمال کی جائے اس لئے اردو زبان کا استعمال ناگزیر تھا انجیل مقدس کے ترجموں سے اس کام کا آغاز ہوا۔ بعد ازاں دوسری اہم ترین ضرورتوں کے ترجمے شائع کئے گئے۔ عیسائی مشنریوں کی تبلیغی دعوت کے لئے اردو نے یہاں کی تمام زبانوں سے کہیں زیادہ نتیجہ خیز خدمت کی۔ اسی لئے اردو میں عیسائی مذہب سے متعلق لٹریچر کے بیش بہا ذخیرے کی مثال دوسری جگہ نہیں ملتی۔ مناظرہ و مباحثہ نے اس لٹریچر میں بڑا اضافہ کیا۔ ہر شہر اور قریہ ان کی زد میں تھا اور یہ لٹریچر گھر گھر پہنچ رہا ہے۔ ڈاکٹر محمد عزیز نے ۱۱۰ کتابوں کا حوالہ دیا ہے ان میں ترجموں کی تعداد ۱۹ ہے۔ مسیحیت حقائق کی روشنی میں "عربی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ سیرت مسیح پر ہوریس بشنل کی تصنیف کیریکٹر آف جیسس" کا اردو ترجمہ محبوب خدا عرف سیرت کامل" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

دوسرے مذاہب کی بہ نسبت عیسائیت کے مبلغین اور متبعین نے اردو کو سب سے زیادہ اہمیت دی اور اسے ذریعۂ دعوت وارشاد بنایا یہی وجہ ہے کہ اردو میں عیسائیت سے متعلق سب سے زیادہ ذخیرۂ ادب موجود ہے اور ان تراجم کی تاریخ بھی بہت قدیم ہے۔ اب تک کی دریافت کے مطابق پہلا ترجمہ ۱۷۴۵ء کا ہے۔ جو کتاب پیدائش کے پہلے چار ابواب پر مشتمل ہے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عیسائی عقیدے کے متعلق تراجم میں ادبی رنگ و آہنگ موجود ہے۔ ان تحریروں میں صاف و رواں عبارت ملتی ہے۔ جو ہندو عقائد سے متعلق تراجم کے برعکس ہے یہاں اصطلاحات کی گراں باری اور عبارت کے بوجھل پن کا بہت کم احساس ہوتا ہے عیسائیت سے متعلق ابتدائی تراجم کی ایک فہرست گریرسن نے........ Linguistic Survey of India-vol. IX دی ہے برصغیر کے مختلف جغرافیائی علاقوں پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شمال مغرب کا علاقہ مختلف مذہبی و اصلاحی تحریکوں کا مرکز رہا ہے۔ اس کے علاوہ اردو کا بھی یہی علاقہ تھا اس لئے اس خطے میں مذہبی لٹریچر کی نشر و اشاعت کی جو قلمونی نظر آتی ہے۔ اسلام کے علاوہ عیسائی عقائد سے متعلق تراجم کا کثیر ذخیرہ لاہور سے شائع ہوا ہے توریت کا ایک اردو ترجمہ نولکشور نے بھی شائع کیا تھا جو نوسو پچاس صفحات تک پھیلا ہوا ہے۔

ان تراجم کی حیثیت مذہبی ہے ادبی نہیں یعنی لکھنے والے فنکار سے بہ اسلوب وانشا سے نہیں۔ لیکن ادب کے لئے موضوع کی تخصیص نہیں۔ ادب کا رشتہ اسلوب سے متعین ہوتا ہے آج بھی ادبی میراث کا بہترین حصہ مذہبی شہ پاروں پر ہی

مشتمل ہے۔ یہ ذخیرۂ تراجم ادبی اسلوب کی دلکشی کا ایک توانا احساس دلاتا ہے ہم انھیں کامیاب تراجم کے ذیل میں پیش کر سکتے ہیں۔ ان تراجم میں اصطلاحات سازی کا مسئلہ اتنا پیچیدہ نہیں۔ جتنا دوسرے علوم جدیدہ میں۔ ہاں اصطلاحات سازی سے زیادہ نازک مرحلہ درپیش ہوتا ہے جس کی معمولی کوتاہی یا لغزش سے ایمان کی سرحدیں کفر سے اور خیر کی شر سے ملنے لگتی ہیں۔ اسی لیے ان تراجم میں مترجمین نے کمالِ احتیاط کا ثبوت دیا ہے۔ ایسے موقعوں پر اصل الفاظ ہی نقل کیے گئے ہیں۔ اور حسبِ ضرورت محکمات و متشابہات کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے جس سے نفسِ مضمون کی وضاحت یا ترسیل میں کمی محسوس نہیں ہوتی اور نہ سیاق و سباق کا ربط ہی ٹوٹتا ہے۔ قاری مترجم کے بجائے مصنف کے ذہن سے قربت محسوس کرتا ہے یہ اصطلاحات چوں کہ تہذیبی میراث اور روزمرہ کی زندگی میں شامل ہو چکی ہیں اس لیے اجنبی نہیں لگتیں۔

ان ترجموں کا محرک جذبہ اپنے نظریہ، مشن، عقائد کی ترویج و اشاعت، خدمتِ خلق، ہم خیال بنانے کی سعی اور علم کی توسیع ہے بیشتر تراجم انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہیں چند اداروں کی سرپرستی سے بھی تراجم کا ذخیرہ وجود میں آیا ہے۔ یہ افراد اور ادارے مالی مشکلات سے ہمیشہ دوچار رہتے ہیں، سرمایہ کی کمی سے کتابت و طباعت نیز جلد سازی کا معیار بہت ہی پست ہے۔ جب کہ بعض کتابوں کی قیمتیں کہیں زیادہ ہیں۔ یہی حال ادبی و سائنسی تراجم کا بھی ہے۔ معیشت کی تنگی اور ضروریاتِ زندگی کی گراں باری کی وجہ سے عام انسان قوتِ خرید سے محروم ہے پھر بھی ادبی کتابوں کے مقابلے میں مذہبی تصانیف کی مقبولیت کہیں زیادہ دکھائی دیتی ہے۔

ڈاکٹر اطہر پرویز

اردو میں بچوں کے ادب کے تراجم

جب کسی نئی زبان کے اندر اتنی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس میں ادبی تخلیقات کی جا سکیں تو تخلیقی ادب سے زیادہ اس امر کی طرف توجہ دی جاتی ہے کہ دوسری زبانوں کی اہم تصانیف کو اس زبان میں منتقل کیا جائے۔ ترجمے کے کام کو اردو میں نہ جانے کیوں حقیر سمجھا جاتا رہا ہے۔ حالانکہ اس کی اہمیت غیر معمولی ہے۔ آج دنیا کے تمام ترقی یافتہ ملکوں میں علم، ادب اور دانشوری کو سب سے زیادہ فروغ تراجم کی بنا پر ہی ہوا۔ اس لئے کہ یہ لسانی تہذیب کی اساس ہیں۔ سقراط، افلاطون، ارسطو، شیکسپیئر، دانتے وغیرہ کسی ایک ملک سے ہی متعلق نہیں۔ دنیا کے ہر ملک کے بسنے والوں کا ان پر حق ہے۔ ترجمہ کر کے ہی ہم دوسری زبانوں کے خزانوں کو کھنگالتے اور ان میں سے اپنے لئے جواہر چنتے ہیں۔ افکار و اقدار کے بیش بہا خزانے حاصل کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عنوان چشتی نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں انتقالِ خیال کا سادہ عمل ہوتے ہوئے بھی ایک پیچیدہ عمل ہے۔ یہ عمل خالص فنی ادبی

اور کسی قدر تخلیقی نوعیت کا ہے، ترجمہ کرتے وقت مترجم ابلاغ اور ترسیل کے مسائل سے دوچار ہوتا ہے۔ اس لئے ترجمے کے عمل کے لئے تحقیقی ریاضت، تنقیدی بصیرت اور تخلیقی صلاحیت کی ضرورت ہے۔ اس مثلث کا ہر زاویہ اور ہر خط اپنی جگہ موزوں اور متوازن ہونا بھی ضروری ہے۔

کسی زبان میں تخلیقی ادب کی اہمیت مسلّم ہے لیکن دوسرے اور تیسرے درجے کی تصانیف کے مقابلے میں اگر ہم کسی زبان کے اول درجے کی تصانیف کو اپنی زبان میں منتقل کرلیں اور اس سے استفادہ کریں تو کیا یہ ہمارے لئے قابل قدر اور قابل فخر نہ ہوگا۔ دانشوری اسی طرح نشو و نما پاتی ہے۔

نشاۃ الثانیہ کے بعد یورپی زبانوں کے ادب نے غیر معمولی طور پر فروغ حاصل کیا اس نے ہر ایک کی نظر مغربی ادبیات پر پڑی۔ ہم نے یہ استفادہ انگریزی زبان کے توسط سے کیا اس لئے کہ انگریزی زبان میں یورپ کی مختلف زبانوں کی اہم تصانیف منتقل ہو چکی تھیں اور ہم ان کا بالواسطہ مطالعہ کرسکتے تھے۔ بیسویں صدی کی ابتدا ہی سے اردو میں یہ کام شروع ہو گیا تھا۔ پھر دارالترجمہ حیدرآباد نے اس کام کو بڑے پیمانے پر کیا۔ بچوں کے ادب پر کبھی بھی توجہ نہیں دی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو میں بچوں کا ادب وقعت حاصل نہ کرسکا۔ جن لوگوں نے اس کی طرف توجہ دی ان کا انداز بھی بالآخر معذرت کا سا ہو گیا۔ اور وقعت حاصل کرنے کے لئے انھوں نے بڑوں کے لئے ادب کی تخلیق شروع کردی۔ جب تخلیقی ادب کا یہ حال ہو تو پھر ترجمے کی طرف کون دھیان دیتا۔ ذاکر صاحب کی کوششوں سے جامعہ نے اس کام کو مشنری جذبے کے ساتھ شروع کرنا چاہا۔ لیکن پھر تجارتی مصلحتیں وہاں بھی آڑے آگئیں۔ یہ ضرور

ہے کہ درمیان میں اکا دکا کتابیں چھپتی رہیں جن کا خاطر خواہ اثر نہ پڑ سکا۔ اب ترقی اردو بورڈ سے کچھ امیدیں بندھی ہیں، دیکھئے اس کا کیا انجام ہوتا ہے۔

ہم بڑوں کے ادب کی طرف جتنی توجہ دے رہے ہیں اگر اس کا ایک فیصد حصہ بھی بچوں کے ادب کی طرف منتقل کر دیں تو بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ بڑوں کے ادب کے تراجم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کی وقتی افادیت ضرور شبہ کی نظر سے دیکھی جا سکتی ہے۔ آج جو لوگ ڈارون، مارکس، ہیگل اور آئن اسٹائن وغیرہ کی اصل تصانیف کو پڑھنا چاہتے ہیں۔ وہ ان کو انگریزی ہی میں پڑھنا پسند کریں گے اس لئے ان کتابوں کا ترجمہ نہ تو فوری افادیت رکھتا ہے اور نہ کسی فوری ضرورت کو پورا کرتا ہے، یہ تو اس لئے ضروری ہے کہ دنیا کی بڑی کتابیں اردو زبان میں بھی مل سکیں اور ہماری زبان کے خزانے میں وسعت ہو۔ لیکن بچوں کے لئے دوسری زبانوں کی کتابیں مادری زبان میں اس لئے ضروری ہیں کہ عام طور پر بچے صرف اپنی زبان کے ذریعے ان کتابوں تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ادبیات عالم کی وہ کتابیں جنھیں بچے سمجھ سکتے ــــ اور ان سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں یا ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، وہ زیادہ تر اردو میں بچوں کے لئے منتقل کر لی جائیں۔

اس وقت یہ بات عام طور محسوس کی جا رہی ہے کہ ہمارے یہاں بچوں کے لئے معلومات کی کتابیں بہت کم ہیں۔ اب ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ایسی کتابیں براہِ راست اردو میں لکھوائی جائیں، لیکن یہ بات اس لئے مشکل ہے کہ جو لوگ علوم سے واقف ہیں وہ زبان لکھنے کے آداب سے واقف نہیں۔ مثلاً اگر ہم چاہتے ہیں کہ بچوں

کے لئے ایک کتاب ایٹمی توانائی پر لکھی جائے تو ضروری ہے کہ اس کا لکھنے والا فزکس کا اچھا طالب علم ہو۔ لیکن اس کے لئے یہ مشکل ہے کہ وہ عام طور پر زبان وادب سے ناآشنا ہوتا ہے۔ لیکن اگر یہ کام اردو زبان وادب کے طالب علم سے لیا جائے جو بچوں کے لئے صاف ستھری زبان لکھ سکتا ہو۔ اور فزکس سے بھی آشنا ہو تو اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں۔

عام فہم انداز میں کسی مسئلے کے اور خاص طور پر سائنسی مسئلے کی مبادیات کو بیان کرنا اسی وقت ممکن ہے جب کہ ایک طرف مترجم اس سائنسی مسئلے پر عبور رکھتا ہو اور دوسری جانب وہ اظہار بیان پر قدرت رکھتا ہو یہاں اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ اگر کتابیں طالب علموں کی درسی ضروریات کے پیش نظر لکھی گئی ہیں تو جہاں نفس مضمون پر دھیان دیں وہاں اس کا بھی خیال رکھیں کہ جن طالب علموں کے لئے وہ کتابیں لکھی گئی ہیں وہ ان کی عمر اور ان کی ذہنی صلاحیت کے مطابق ہے یا نہیں۔

اس لئے بہتر یہی ہے کہ دوسری زبانوں میں بچوں کے لئے ایسی کتابوں کا جو ذخیرہ ہے اسے کھنگالا جائے۔ یہ کتابیں بڑی محنت اور بڑا کثیر سرمایہ خرچ کر کے تیار کی گئی ہیں۔ ہم ان کتابوں کو اپنی زبان میں منتقل کریں۔ معلومات کی کتابوں کے موضوعات عالمگیر اہمیت رکھتے ہیں اس لئے ان موضوعات کا مقامی ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ روس، انگلستان امریکہ اور مشرقی یورپ کے ممالک میں بچوں کے لئے سائنسی معلومات کی کتابیں سیریز کی شکل میں بڑے پیمانے پر رنگین تصویروں کے ساتھ چھاپی گئی ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو یہ کتابیں اردو میں بھی ان تصاویر کے ساتھ شائع کی جاسکتی ہیں اور ان کے ناشرین بڑی خوشی کے ساتھ اجازت دے سکتے ہیں۔

ان کتابوں کا ترجمہ کس طرح کیا جائے اس سلسلے میں میری معروضات مندرجہ ذیل ہیں:

سائنسی موضوعات کا ترجمہ کرتے وقت اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جائے کہ سائنس کے مخصوص الفاظ کا اردو میں ترجمہ نہ کیا جائے بلکہ اس کے بجائے ان کو جوں کا توں اردو میں لے لیا جائے۔ اردو زبان کی ایک خصوصیت یہ بھی تو ہے کہ یہ دوسری زبان کے الفاظ کو بڑی آسانی سے جذب کر لیتی ہے اور پھر جب وہ استعمال ہونے لگتے ہیں تو ان کی اجنبیت باقی نہیں رہتی۔ دراصل مشکل تو یہ ہے کہ زبان اور لغت کے ماہرین اس کام میں لگے رہتے ہیں کہ کسی طرح ان الفاظ کا اردو میں ترجمہ کر دیا جائے۔ اگر یہ الفاظ اردو میں لے لئے جائیں تو اس سے زبان کو نقصان نہیں پہونچے گا۔ زبان تو سمجھنے اور سمجھانے والے کے درمیان پل کا کام دیتی ہے۔ اس کو جتنا عام فہم بنایا جا سکتا ہے بنانا چاہئے۔ یہ ضروری نہیں کہ ایٹم، سیل، پنسیلین انجکشن، مالیکیول، ایکسرے، ہائڈروجن، آکسیجن، پٹرول میل وغیرہ کا اردو میں معرّب اور مفرّس طریقے سے ترجمہ کریں۔ یہ ترجمہ بچے اور لکھنے والے کے درمیان ایک دیوار بن جائے گا۔ مجھے ہندی کے ایک بڑے پبلشر نے بتایا کہ ہندی میں بچوں کے ادیب اسی زبان کی مشکل میں مبتلا ہیں کہ وہ سنسکرت کی رائج ترکیبوں سے بنائے ہوئے الفاظ کو انگریزی کے رائج الفاظ کے مقابلے میں ترجیح دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی زبان دشوار ہو جاتی ہے چنانچہ جب ہم ان سے آسان زبان لکھنے کیلئے کہتے ہیں تو وہ انگریزی اصطلاحوں کو برقرار رکھتے ہیں اور اردو میں لکھنے لگتے ہیں۔ ان کو فکر لاحق ہوتی ہے کہ بچوں کے لئے اگر آسان ہندی لکھی جائے تو اردو ہو جاتی ہے۔

یہ مسئلہ ہندی کے بچوں کے ادیبوں کو پریشان کرتا ہے۔ دراصل وجہ یہ ہے کہ بچوں کے لکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم لکھتے وقت اپنے ذہن میں بچوں کا تصوّر کر کے لکھیں۔ اگر ہم اس کے بجائے اپنے مخصوص طرز فکر اور ذاتی تعصب کو فروغ دینے کے لئے لکھیں گے تو یہ ممکن ہے کہ ہمارے خیالات اور انداز کی تبلیغ ہو لیکن یہ ادب صحیح معنوں میں بچوں تک رسائی حاصل نہ کر سکے گا۔ اور یہ کتابیں اسکولوں کی لائبریریوں کی زینت بنی رہیں گی۔ اس لئے اگر یہ طریقہ کہیں اردو میں چل پڑا تو نہ صرف بچوں کے ادب کو نقصان پہونچے گا بلکہ زبان کی ترقی کے راستے بھی مسدود ہو جائیں گے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ مترجم کو اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ وہ جس موضوع کی کتاب کا ترجمہ کرے اس سے خود بھی اچھی طرح واقف ہو جائے اور جن باتوں کا ان میں ذکر کیا گیا ہے انکو خود بھی اچھی طرح سمجھ لے۔ میں اس کو ضروری نہیں سمجھتا کہ ایسی کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لئے مترجم خود اس کا ماہر ہو۔ بلکہ یہ مہارت ترجمے کے حق میں مضر بھی ہو سکتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ بچہ بن کر اس موضوع کو خود سمجھنے کی کوشش کرے اور جب خوب اچھی طرح سمجھ لے تو اس کام کو اپنے ذمے لے اور یہ دیکھے کہ وہ جن خیالات کا ترجمہ کر رہا ہے ان کو خود بھی سمجھ سکتا ہے یا نہیں۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ بچوں کے ادب کے ترجمے کے لئے اس مخصوص علم کا ماہر ہونا اتنا ضروری نہیں جتنا یہ ضروری ہے کہ وہ بچوں کا ادیب ہو۔ اگر وہ محض ماہر ہوگا۔ اور بچوں کی زبان لکھنے پر قادر نہ ہوگا تو اس

کی ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔ میں اس بات کو اپنے تجربے کی بنا پر زیادہ زور دے کر کہہ رہا ہوں کہ میں نے چند کتابیں بڑی کامیابی کے ساتھ اردو میں منتقل کی ہیں، جو بچوں میں بے حد مقبول ہوئیں۔ ہم چاہے بچوں کو بہت زیادہ معلومات نہ دیں لیکن ان کے لئے جتنی بھی معلومات فراہم کریں وہ ان تک بہت اچھی طرح پہونچائیں۔ احتیاط کے طور پر ہم یہ بھی کر سکتے ہیں کہ ایسے ترجموں کو نظر ثانی کیلئے کسی ماہر کے پاس بھیج دیں تاکہ اگر کوئی واقعاتی غلطی ہو جائے تو اس کی تصحیح بروقت ہو جائے۔

تیسری اہم بات جو اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے وہ یہ ہے کہ بچوں کی معلوماتی کتابوں کا ترجمہ لفظ بہ لفظ نہ ہونا چاہیئے بلکہ ترجمہ کرنے والے کو اس کا حق بھی دیا جائے کہ وہ آزاد ترجمہ کرے۔ یہ بات ضروری ہے کہ پڑھنے والے بچے کو اس کا احساس نہ ہونا چاہیئے کہ وہ کسی دوسری زبان کی کتاب پڑھ رہا ہے بچے کو خیال سے اس طرح مانوس کیا جائے کہ اسے ایک لمحے کے لئے بھی اجنبیت کا احساس نہ ہو۔ بچوں کے لئے ہر لکھنے والا جانتا ہے کہ وہ جس عمر کے بچے کے لئے لکھ رہا ہے اس کا ذخیرہ الفاظ کیا ہے۔

بچوں کی کتابوں کے مترجم کی ذمہ داریاں عام طور بڑوں کی کتابوں کے ترجمے کرنے والوں سے زیادہ ہوتی ہیں۔ مترجم کو اس کا شدید طور پر احساس ہونا چاہیئے۔ حسین حسان صاحب نے روسی ادیب ایلین کی کتاب ـــــــ ONE MILLION WHYS کا ترجمہ اردو میں بڑی کامیابی سے کیا ہے اور ہمیں ایک لمحے کے لئے بھی اس کا احساس نہیں ہوتا کہ یہ کتاب اصل میں

کسی دوسری زبان میں لکھی گئی ہے اور یہی اس کتاب کی مقبولیت کا راز ہے۔

مذکورہ بالا باتیں میں نے سائنس کی کتابوں کے بارے میں لکھیں

۔ عام ادبی کتابوں کے سلسلے میں یہ رویہ رکھنا چاہیے کہ اگر ہم کسی کتاب کو بچوں کے لئے منتقل کر رہے ہیں تو وہ بچوں کے لئے ہی ہو لیا ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ جن خیالات کو ہم بچوں کے لئے پیش کر رہے انھیں بچے کس حد تک سمجھ سکتے ہیں ۔ جذبات اور احساسات اس کام میں ممد و معاون ہو سکتے ہیں ۔ ترجمہ تو ہم بڑوں کے لئے کر ہی سکتے ہیں لیکن جب ہم اپنے بچوں کو ان سے روشناس کرانا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ ہم اس کی پوری اسپرٹ اپنے اوپر طاری کر لیں ۔ ہم خود یہ سمجھ لیں کہ یہ کتاب ہماری ہے ہم اس کے مصنف ہیں اور اسے ہم بچوں کے لئے از سر نو لکھ رہے ہیں ۔ پروفیسر آل احمد سرور نے بجا طور پر ترجمے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے ۔ "ترجمے کی اہمیت کسی طرح تخلیق سے کم نہیں ۔ ترجمے میں تخلیق کو از سر نو پانا ہوتا ہے ۔ اس لئے امریکہ میں ترجمے کے لئے دوبارہ تخلیق (Recreation) کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے " یہ کام جہاں دوسری زبانوں کی کتابوں کے سلسلے میں کریں گے وہاں یہ عمل ہمیں خود اپنی ادبیات کے سلسلے میں بھی کرنا چاہیے ۔ ہمیں عالمی ادب میں بچوں کی معیاری کتابوں کو اردو میں منتقل کرنا چاہیے ۔ بچوں کے لئے دنیا کے مختلف ملکوں میں ادبی کتابیں لکھی گئی ہیں مثال کے طور پر ہنس کرسچین انڈرسن کی کہانیاں ادبیات عالم میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں ۔ ان میں تخیل کی فراوانی ہے ۔ یہ کہانیاں اور اسی قبیل کی کہانیاں ہمارے

بچوں کے لئے بھی مفید ہو سکتی ہیں۔

بچوں کے لئے تخیلی ادب کی اہمیت اس لئے غیر معمولی ہے کہ اس کے توسط سے بچوں کی ذہنی نشو و نما ہوتی ہے۔ جب بچوں کا ذہن اپنے ماحول سے ذرا مختلف ماحول دیکھتا ہے تو وہ نہ صرف ایک نیا پن محسوس کرتا ہے بلکہ اس کے تخیل میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ "گلیور کا سفر نامہ" جہاں ایک طرف ایک بڑی طنزیہ کتاب ہے۔ وہاں اس میں بچوں کے لئے تخیل کی فراوانی ہے۔ وہ چاہے بونوں کا دیس ہو، جہاں چھنگلیا کے برابر کے انسان ملتے ہیں جنہیں گلیلیور بآسانی جیب میں رکھ لیتا ہے اور خود ان کے مقابلے میں اپنے آپ کو دیوزاد سمجھتا ہے یا پھر وہ دیوزاد انسانوں کا دیس ہو جہاں وہ دیو پانچ چھے فٹ کے گلیلیور کو اس طرح پنجرے میں رکھتے ہیں جیسے ہم چڑیاں پالتے ہیں اور اسے اپنے ہتھیلی پر رکھ لیتے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے نہ صرف ہمارے تخیل کی آبیاری ہوتی ہے بلکہ ہم یہ سمجھتے ہیں بڑا یا چھوٹا ہمیشہ نسبتی حیثیت رکھتا ہے۔

ڈیفو کا رابنسن کروسو ہمارے لئے نہ صرف ایک دلچسپ کہانی ہے بلکہ اس کے مطالعے سے انسان دوستی کے جذبے میں غیر معمولی اضافہ ہوتا ہے۔ ذوالفقار بخاری کا شعر ؎

مہر و ماہ و انجم کی بے نیازیاں تو بہ

دوست ہو کہ دشمن ہو آدمی غنیمت ہے

دنیا کے ادب میں بچوں کے لئے دیووں، پریوں کی کہانیاں بھی لکھی گئی ہیں اور تاریخی و تہذیبی قصے بھی۔ لوک کتھائیں بھی ہیں جن کی مدد سے انسانی تہذیب

نے غوں غاں کرنا سیکھا تھا۔ ان کہانیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے یہ کہانیاں تقریباً دنیا کے ہر ملک میں ملتی ہیں۔ ان کے مصنفوں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں اس لئے یہ جب جب بھی دوبارہ کہی گئی ہیں تو ان میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور ہو گئی ہے بعض اوقات یہ تبدیلیاں کسی جذبے کے تحت ہوتی ہیں۔

لوک کہانیوں کی بڑائی ان کی سادگی میں چھپی ہوتی ہے۔ ان میں اختصار بھی ہوتا ہے اور جامعیت بھی۔ ان میں حق و صداقت کا بول بالا ہوتا ہے۔ یہاں جزئیات کی طرف دھیان نہیں دیا جاتا بلکہ انہیں پڑھنے والے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ خود خانہ پری کرے۔ والٹر ڈیلا میئر نے صحیح لکھا ہے کہ ہمیں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ کہانی کے کردار، واقعات اور مناظر چاہے کتنے ہی اصلی اور حقیقی معلوم ہوں وہ اصل میں خیالی معلوم ہوتے ہیں ہم سے جو کچھ کہا جائے ہم تھوڑی دیر کے لئے اسے مان لیں اور اس کا اثر بھی قبول کر لیں۔ یہ دونوں باتیں اس پر مبنی ہیں کہ ہماری تخیل کی قوت کتنی ہے یہ کہنا کوئی عقلمندی کی بات نہیں کہ فلاں فلاں بات نہیں ہو سکتی۔ کہانی میں تو یہ سب چیزیں تصور کی جاتی ہیں اور اسی لحاظ سے واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔"

انسانی تہذیب کے لئے یہ قابل فخر بات ہے کہ ادبیات عالم میں لوک کہانیوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ یہ وہ کہانیاں ہیں جنہوں نے انسانی ذہن کو نہ صرف کچھ سوچنے بلکہ عمل کرنے پر بھی اکسایا ہے۔ ننھے منے تخیل کو پہلے آسمان پر اڑتے ہوئے قالین اور کل کے گھوڑے نظر آئے اور پھر اس کے بعد اس کے تعمیری ذہن نے ہوائی جہاز کا خاکہ مرتب کیا پہلے اس نے سرمہ لگا کر زمین کے چھپے ہوئے خزانوں کو تخیل کی آنکھوں اور فریب کی نظر سے دیکھا لیکن پھر جب اس نے زمین کے

سینے کو چیر کر دیکھا تو اس نے...... سونا چاندی، لوہا، کوئلہ اور بہتے ہوئے تیل کے چشمے نظر آئے۔ ہم اگر عالمی ادب سے اپنے بچوں کے لئے ایسی کہانیوں کو اردو میں منتقل کریں تو ہمارے بچوں کو یقیناً ان میں تخلیقی ادب کا لطف آئے گا۔

لوک کہانیوں ہی کے ذیل میں پریوں اور دیووں کی کہانی بھی آتی ہیں۔ ان قصوں کی فضا عام طور پر مقامی نہیں ہوتی کیونکہ لکھنے والے کا ذہن زمین پر قدم نہیں جماتا لیکن جہاں کہیں مقامی رنگ پایا جاتا ہے۔ تو وہاں ترجمہ کرنے والے کا فرض ہو جاتا ہے کہ ان فنی خصوصیات کو برقرار رکھے اور اس ارضیت کو ختم نہ ہونے دے۔ اینی امور کے بقول "پریوں کے قصے میں تنقید نگاروں کو کہانی کی بناوٹ، ڈرامائی..... کردار نگاری، مضمون کی سادگی، اداکاری پر زور، مکالمات اور دوسری نمایاں خصوصیات کو تلاش کرنا چاہیئے: بچوں کے ادب کے ماہرین کو یہ بات جاننا چاہیئے کہ یہ کہانیاں جو زمانہ دراز سے بچوں کے ادب کا ذخیرہ ہیں ان کی مقبولیت کی کیا وجہ ہے۔؟"

البتہ ان قدیم کہانیوں کا ترجمہ کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ اگر ہم اس کو آج کی تکنیک اور آج کی بول چال کی زبان میں منتقل کر دیں تو کیا اس سے نفس قصہ پر کوئی اثر تو نہیں پڑتا۔ مشیر فاطمہ نے اپنی کتاب "بچوں کے ادب کی خصوصیات" میں بڑی بات کہی ہے کہ "ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ پریوں کے قصے ہماری ادبی میراث ہیں۔ جن کا اپنا ایک طرز اور تیکنیک ہے کہانی کا طرز جدید یا روایتی جو بھی ہو اس کا مقصد لوک کہانیوں کی خوبیوں کو بچوں تک پہنچانا ہونا چاہیئے۔ جس طرح کرم برادرز نے ہم تک پہونچانے کی کوشش کی ہے۔ وہ

کہانیاں جن میں زندگی، خوبصورتی اور تخیّل تھا۔"

پریوں کے قصے جو بھی دنیا کے مختلف ممالک میں لکھے گئے ہیں ان میں ایک خاص مماثلت ہوتی ہے۔ ان میں ایک حکایتی طرزِ بیان ہوتا ہے۔

ساری دنیا کے بچوں کے ادب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں غیر معمولی مماثلت ملتی ہے گویا انسان جب بچوں کی طرح سوچتا ہے تو وہ ایران و تاتار و زنگ کی دیواروں کو توڑتا ہوا پھلانگتا نکل جاتا ہے اور دنیا کے تمام بچے ایک برادری میں نظر آتے ہیں اور ان میں نسلی اور قومی امتیاز کا مصنوعی پن ختم ہو جاتا ہے۔ آج جب کہ ہمارے دانشور "ایک دنیا" کے خواب دیکھ رہے ہیں جب سائنسی ایجادات نے دنیا کے مختلف اور دور دراز ملکوں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا ہے تو یہ لوک کہانیاں ان کے ذہنی فاصلوں کو کم کر سکتی ہیں۔

بچے ایک ہی قسم کی کہانیاں سننا پسند نہیں کرتے وہ تنوع چاہتے ہیں اس لئے کبھی انسانوں کی کہانیاں سنتے ہیں تو کبھی جانوروں کی، کبھی تاریخی کہانیاں پڑھنا چاہتے ہیں تو کبھی محض تخیّل کی دنیا کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔

والٹر ڈی لا میئر نے اپنی "جانوروں کی کہانیوں" کے دیباچے میں لکھا ہے۔

"یہ ضروری نہیں کہ تمام اچھی کہانیاں خوشی کی کہانیاں ہوں۔ دکھ سے بھری ہوئی افسوسناک اور ہیبت دلانے والی کہانی تصویر یا نظم بھی اچھی ہو سکتی ہے۔ یہ سب دماغ کو مالا مال کرتی ہیں اور خود بینی کو دعوت دیتی ہیں۔ ان کو پڑھنے سے خواہ ہمیں تکلیف ہو یا دہشت ہو پھر بھی ہم ان کہانیوں کو دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ ان کہانیوں

کی فضا اور اُن کے کردار، واقعات اور مناظر ہمارے سامنے رہتے ہیں۔ ان کے خوبصورت الفاظ اور موسیقی ہمارے ذہنوں کو روشن کرتی رہتی ہے ایک چھوٹا بچہ ان ہیبتناک کہانیوں کو سننے کے بعد سوتے وقت ڈر سکتا ہے۔ میں خود ڈرا کرتا تھا لیکن مجھے ان کو بار بار سننے میں مزا بھی آتا تھا گو کہ ان کا بہت کچھ انحصار کہانی سنانے والے پر ہوتا ہے۔ بچپن میں ڈراونے دیو کی شکل اکثر سوتے وقت میرے سامنے آجاتی تھی۔ مرجانہ کے ساتھ میں ہر تیل کے پیپے کے پاس جاتا تھا اور اس وقت تک اس کے ساتھ رہتا تھا جب کہ چالیس چوروں کو مار کر ختم نہ کر دیے۔ میں ان کہانیوں سے محض کہانیوں کا لطف لیتا تھا۔ اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان ڈراونے قصوں کو سننے اور ان سے ڈرنے کے باوجود مجھے کوئی نقصان نہیں پہونچا۔"

○
○

مذکورہ بالا اصولوں کے پیش نظر ہم عالمی ادب سے بچوں کے ادب کے علاوہ بڑوں کے ادب سے بچوں کو روشناس کر سکتے ہیں۔ اور انھیں آسان اور عام فہم انداز میں لکھ سکتے ہیں۔ یہ کام جہاں ہم دوسری زبانوں کے سلسلے میں کریں گے۔ وہاں ہمیں یہ عمل خود اپنے ادبیات کے سلسلے میں کرنا چاہیے یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی بعض ادبی کتابوں کو بچوں کے لئے بھی فراہم کریں۔ انگریزی میں شیکسپیر، ڈکنس، سوئفٹ، موپاساں، چیخوف اور دوسرے ممتاز ادیب ہر عمر کے بچوں کے لئے آسانی سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ ہم بڑی آسانی سے باغ و بہار، فسانہ آزاد، مذہب عشق (گل بکاؤلی)، توبۃ النصوح، فسانہ عجائب، آرائش محفل (قصۂ حاتم طائی)، گئودان، شریف زادہ وغیرہ کو بچوں کے لئے لکھ سکتے ہیں یہ

طریقہ ہم دوسری زبانوں کی اہم کتابوں کے ساتھ بھی برت سکتے ہیں جیسے الف
لیلہ ولیلہ، حاجی بابا اصفہانی، چارلس ڈکنس کے ناول، ڈیفو کا رابن سن کروسو،
گلیور ٹریول، وغیرہ وغیرہ ۔
اس طرح ہم اپنے بچوں کو دنیا کے ادب سے اور خاص طور پر بڑی کتابوں
سے روشناس کرتے ہیں۔

یہاں اس تجویز کو پیش کرتے ہوئے میرا یہ کہنا مقصود نہیں کہ اردو میں یہ کام سرے
سے ہوا ہی نہیں - ترقی اردو بورڈ نے اس کام کو کافی حد تک اپنے ذمے لے لیا ہے
اور میرے علم میں ہے کہ بعض کتابیں طباعت کی منزلوں سے گذر رہی ہیں۔ قرۃ العین
حیدر نے بعض روسی کہانیوں کو بچوں کے لئے لکھا ہے جو بڑی مقبول ہیں۔ مکتبہ جامعہ
نے انھیں شائع کیا ہے ۔

آزادی کے بعد اردو میں بچوں کے لئے معلومات کی جو کتابیں شائع ہوئی ہیں
ان میں ترجموں کی تعداد خاصی ہے ۔ چلڈرن بک ٹرسٹ نے جہاں پنج تنتر کی
کہانیوں کو اردو میں منتقل کیا ہے ۔ وہاں انھوں نے اس کا بھی خیال رکھا ہے۔
کہ ہندوستان میں مختلف حصوں میں بسنے والوں، مختلف زبانوں کے جاننے والوں
کے لئے ایک سا ادب پیش کیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کے حالات سے
واقف ہو سکیں ۔ اور قومی ایکتا کے جذبے کو تقویت ملے۔ ان کتابوں کی قیمتیں
بھی کم ہیں اور یہ رنگین فوٹو آفسٹ سے شائع کی ہیں - ہمیں ان کتابوں میں
ہندوستان کی مختلف زبانوں کے مصنفوں کی کتابیں ملتی ہیں - جن میں چند ممتاز
ادیبوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں - اما شنکر جوشی ۔ بریگیڈیر گیان سنگھ، لیلا بھاگوت

لیلا مجمدار، شنو پربھاکر، منوہر داس چترویدی، راجندر اوستھی، شانتا رنگا چاری، تارا تیواری، ملک راج آنند، سریندر رسا نیال وغیرہ ــــ مجھے خوشی ہے کہ ایسی کتابوں کے ترجمہ کرنے والوں میں اردو کے جانے پہچانے ادیب بھی شامل ہیں جیسے محمد شفیع الدین نیّر، رضیہ سجاد ظہیر، انور کمال حسینی، رفیعہ منظور الامین، صالحہ عابد حسین، محمد ذاکر، عرش ملسیانی وغیرہ۔

ہماری زبان میں بچوں کے لئے کوئی انسائیکلوپیڈیا نہیں ہے یہ ایک بنیادی کام ہے لیکن ہمارا ذہن تو ابھی ان بڑوں کی طرف متوجہ ہے جو انگریزی جانتے ہیں اور انگریزی کی انسائیکلوپیڈیا سے مستفید ہو سکتے ہیں اس کام کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا لیکن میرے پیش نظر فوری افادیت ہے۔

میری رائے ہے کہ بچوں کے لئے انسائیکلوپیڈیا تیار کی جائے بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ آرتھر می (Arther Mee) کی چلڈرن انسائیکلوپیڈیا کو اردو میں آزادانہ طور سے منتقل کیا جائے۔ یہ کام کوئی بڑا ادارہ ہی کر سکتا ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ میری ایسی چند تجاویز پر ترقی اردو بورڈ کا چلڈرن پینل عمل کر رہا ہے اور پروفیسر عبد العلیم کی رہنمائی میں اس کام کی ابتدا بھی ہو چکی ہے۔ بچے ایک تہذیب کے بنیادی پتھر ہوتے ہیں۔ اگر ہم ان کو ابتدا ہی سے صحت مند ادب کی طرف متوجہ کر دیں گے تو پھر امریکہ سے آئے سستے، ہلکے پھلکے بازاری اور کاروباری ادب سے مقابلہ کرنے کے لئے ان میں آگے چل کر قوت مدافعت پیدا ہو جائے گی۔ مغرب سے آئے ہوئے جاسوسی ادب نے ہمارے ملک میں بھی اپنا جال پھیلانا شروع کر دیا ہے اور اس کا مقابلہ ہم اسی صورت سے کر

سکتے ہیں کہ بچوں کو پہلے ہی سے صحت مند ادب سے روشناس کریں۔

مشیہ فاطمہ نے صحیح بات کہی ہے "کہ آج کی ترقی یافتہ دنیا میں ہم نے پریوں کے قصوں اور روایتی داستانوں کو بے معنی سمجھ کر ٹھکرا تو دیا لیکن اس کے بدلے ہم نے اپنے بچوں کو کچھ نہیں دیا اپنے روایتی ادب کے ورثے کو نظر انداز کر کے امریکی قسم کے سستے اور اوچھے ادب کی نقل دی ہے۔ جس میں صرف ایک کارنامہ ہوتا ہے جس میں ہمارے قومی کردار کے صبر و تحمل کا ذرا بھی شائبہ نہیں جہاں انجام صرف کامیابی ہے جہاں صرف کامیاب انجام کے لئے ہیرو بہادری کے ہر کرتب دکھاتا ہے اور اپنا مقصد صحیح یا غلط کسی طریقے سے حاصل کر لیتا ہے۔

میں نے مذکورہ بالا سطروں میں نہ صرف چند مسائل پر بحث کی ہے۔ بلکہ ان کا حل اور طریقہ کار بھی پیش کیا ہے اس میں میں نے اپنے تجربے سے زیادہ مدد لی ہے اسلئے میری رایوں سے آسانی سے اختلاف کیا جا سکتا ہے میں امید کرتا ہوں کہ ہمارے قارئین بھی ان مسائل پر غور کریں گے اور اپنی رایوں سے مستفید فرمائیں گے تاکہ ہم سب کی مشترکہ کوششوں سے بچوں کے ادب کو اردو میں فروغ حاصل ہو اور ہم اپنے بچوں کو بڑے خلوص اور محبت کے ساتھ عالمی ادب کے نمونوں کو پیش کر سکیں یہی زمانہ انکی شخصیت کو ڈھالتا ہے اور اسی لئے سب سے زیادہ بچے بھی توجہ کے مستحق ہیں۔ یہ زمانہ بہت تھوڑے دنوں رہتا ہے اس لئے اس وقت کو ضائع نہ ہونے دینا چاہئے اس زمانے ہی میں ان کو بہترین ادب فراہم کر دینا چاہئے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب بچوں کے لئے سنجیدگی، خلوص، محبت اور محنت سے لکھا جائے گا یہ چاہے ترجمہ ہو یا تخلیقی ادب۔

عبدالقادر سروری

مہاراجہ رنبیر سنگھ اور ان کا دارالترجمہ

مہاراجہ رنبیر سنگھ ڈوگرا خاندان کے دوسرے حکمراں نے ۱۸۵۶-۱۸۵۷ء میں ریاست جموں وکشمیر کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور کوئی ۳۱ برس حکومت کرتے رہے ان کا زمانہ ریاست میں نئے عہد کے طلوع کا تھا - اور انھوں نے نئی تعلیم کو رائج کرنے اور نظم ونسق نئے تقاضوں کی سطح پر لانے میں اپنا فرض پوری طرح ادا کیا - لیکن ان کا ذاتی رجحان قدیم ویدی تہذیب اور سنسکرت علوم کی طرف زیادہ تھا - حالانکہ خود ان کی تعلیم قدیم علوم وفنون میں نہیں ہوئی تھی - وہ سناتن دھرم عقائد کے سختی سے پابند تھے' ان کا نام ڈوگرا عہد کی تاریخ میں نمایاں اور یادگار رہے۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ نے کئی مندر بنوائے اور پرانے مندروں کی نگہداشت اور مرمت اور توسیع کا بھی بڑا اچھا انتظام کیا تھا - جموں میں رگھوناتھ مندر تعمیر کرا کر اس سے ملحق ایک سنسکرت پاٹھ شالہ بنوائی تھی - انھوں نے مندر کے اطراف میں کئی اور مندر تعمیر کروائے اور اس ملک کو سنسکرت علوم وفنون کی تعلیم کے لئے مرکزی حیثیت دیدی اسی مندر کے احاطے میں سنسکرت ملفوظات اور کتب کو جمع کرنے اور انکے تحفظ کیلئے وسیع کتب خانہ بھی تعمیر کروایا تھا جس سے متعدد مستشرقین مثلاً بوہلر اسٹین وغیرہ نے استفادہ کیا تھا۔

نئی تعلیم اور نئے علوم و فنون جو ہندوستان میں رائج ہو رہے تھے انھیں ریاست میں روشناس کرانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ نئے نظم و نسق کے لئے نئی تربیت پائے ہوئے عہدہ داروں اور کلرکوں کی بھی ضرورت تھی۔ اسی بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے راجہ رنبیر نے انگریزی تعلیم کے مدرسے قائم کئے۔ درباری اور دفتری زبان ابھی تک فارسی مانی جاتی تھی۔ اور اکثر کارروائی بھی فارسی ہی میں ہوتی تھی۔ اور درباری احکام بھی عموماً فارسی میں صادر ہوتے تھے لیکن برصغیر ہند کی طرح اس "ایران صغیر" میں بھی اب کوئی زندہ اور نشو پذیر زبان نہیں رہی تھی۔ اور نئے عہد کے تقاضوں نے عوامی زبان اردو کو اس خلا کے پُر کرنے کے لئے آگے بڑھانا شروع کر دیا تھا جو فارسی زبان کے میدان سے ہٹنے کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے بارے میں، کشمیر کے مورخ، صوفی غلام محی الدین نے "کشمیر" میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کے پیش نظر اکبر اعظم کی علمی اور ادبی سرپرستیاں اور درباری شان و شوکت تھی، لیکن ان کے وسائل محدود اور ان کا مذاق عام پسند تھا۔ اس لئے، جن لوگوں کو انھوں نے اپنے دربار کے "نورتن" میں شامل کیا تھا ان میں دو ایک سنسکرت علما کے علاوہ سب اوسط علم اور اوسط ذہنی معیار کے پڑھے لکھے لوگ تھے۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ اس عبوری دور میں علم و فضل کے اگلے معیار اب تقویم پارینہ بن چکے تھے اور نئی تربیت کے عمدہ نمونوں کے ابھرنے میں ابھی دیر تھی۔ اس لئے یہ "نورتن" حقیقی روشنی نہیں رکھتے تھے۔

ان میں سب سے پہلی قابل ذکر شخصیت دیوان کرپارام، مہاراجہ کے دیوان اور معتمد علیہ کی ہے۔ وہ فارسی اچھی جانتے تھے بلکہ فارسی میں چار پانچ کتابوں

کے مصنف بھی ہیں ان میں ایک "گلاب نامہ" مہاراجہ گلاب سنگھ بانی خاندان ڈوگرا بہت مشہور ہے، ان کی دوسری تصانیف "ہدیۃ التحقیق" یا تحقیق التناسخ" اور "رد اسلام" ہیں، وہ مرصع اور مقفیٰ ہندوستانی طرز کی عبارت لکھتے تھے۔ صوفی نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار کے ابوالفضل سمجھے جاتے تھے لیکن ابوالفضل کی وسعت نظری کے مقابلہ میں ان میں ہندو مذہب کی پاسداری زیادہ تھی۔ اس پہلو سے وہ ابوالفضل کی گویا ضد تھے۔

دیوان کرپارام کے "گلاب نامہ" کی تاریخ تصنیف و طباعت پر سید اسمٰعیل حسین منیر اور ان کے فرزند اور شاگرد ابو محمد بدر نے کئی تاریخیں کہی تھیں دونوں کی ایک ایک تاریخ ملاحظہ ہو:

گلاب سنگھ مہاراجہ عظیم الشان! زمینِ ہند میں خورشیدِ آسمانِ خرد

"گلاب نامہ" میں احوال انکا ہے مرقوم اسی سبب سے یہ نسخہ ہے بوستانِ خرد

علاوہ ان کے ہے حال اور بھی رئیسوں کا جو تھے زمانہ پیشیں میں قدردانِ خرد

فدیوِ عصر مہاراجہ زمانہ حال کہ جن کے عہد میں عالی ہوئی ہے شانِ خرد

سپہر مرتبہ رنبیر سنگھ عالی جاہ! کہ انکی مدح میں دُرفشاں زبانِ خرد

منیرؔ میں نے یہ تاریخ پائی سمت میں

"گلاب نامہ، بہارِ بہشت، جانِ خرد"

(۱۹۲۲ھ ہجری)

واہ کیا تالیف کی دیوان کرپارام نے ہر ورق خوش آئینہ خوش جوہر نجابت ہے

بدرؔ نے تاریخ چھپنے کی یہ سمت میں کہی تحفہ اخبار بلاد کشور پنجاب ہے

دیوان کرپارام کی دوسری تصنیف "ہدیۃ التحقیق" پنڈت شیوناتھ کول منتظر نے (جن کا حال آگے آرہا ہے) حسب ذیل قطعہ تاریخ کہا تھا۔

واہ تحقیق تناسخ کیا چھپی　　　تیرگی کی دور جس نے جہل کی
کوئی کیا تاریخ اسکی لکھ سکے　　　ہاتف غیبی ہی جب خود یہ کہے

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار کے دوسرے علماء ڈاکٹر بخشی رام، پنڈت گنیش کول شاستری، پنڈت صاحب رام، مولوی غلام حسین طالب لکھنوی، مولوی عبداللہ مجتہد العصر حکیم ولی اللہ لکھنوی، حکیم نورالدین بھیروی ثم قادیانی، اور بابو نصراللہ عیسائی تھے "نورتن" کی یہ فہرست مکمل ہو جاتی ہے۔

اس فہرست پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان میں مختلف علوم اور مکتب خیال کے نمائندے شامل ہیں۔ پنڈت گنیش کول شاستری اور پنڈت صاحب رام سنسکرت کے اچھے عالم تھے، مشہور مستشرق سنسکرت داں فاضل سٹائن نے پنڈت صاحب رام کو "گزشتہ چند نسلوں میں کشمیر کا سب سے بلند پایہ عالم" بتایا ہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ریاست کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تیرتھوں کے جائزے اور ان کی توضیحی فہرست مرتب کرنے کی خدمت ان کے سپرد کی تھی۔ حکیم نورالدین، مرزا غلام احمد قادیانی کے پیرو تھے۔ اور بعد کو مرزا صاحب کے انتقال (۱۹۰۸ء) پر ان کے پہلے خلیفہ ہوئے۔ حکیم صاحب نے اپنی خود نوشت سوانح میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کی بڑی تعریف کی ہے۔ بابو نصراللہ عیسائی نے اِنس کی کشمیر کی ہینڈ بک کا ترجمہ کیا تھا۔ اس کی کچھ تفصیل آگے آئے گی۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کی یہ دلچسپیاں اپنی جگہ اہم ہیں، لیکن ایک مہتم بالشان کام

جو مہاراجہ کے عہد میں انجام پایا، وہ ان سب پر فوقیت رکھتا ہے اور ایک یادگار کی حیثیت رکھتا ہے، یہ ایک دارالترجمہ کا قیام تھا جس کے ذریعے انھوں نے مغربی علوم کو اردو اور ریاست کی دوسری زبانوں — ڈوگری، ہندی اور پنجابی میں منتقل کرانے کے علاوہ ان علوم اور فارسی اور عربی کی اہم علمی تصانیف کو سنسکرت میں منتقل کرنے کی سعی بلیغ کی تھی۔ اس طرح مہاراجہ کے قائم کیے ہوئے دارالترجمہ کا کام ایک سے زیادہ زبانوں سے تعلق رکھتا تھا۔ اور بعض کتابیں بیک وقت دو یا تین زبانوں میں ترجمہ کی گئیں۔

اس دارالترجمہ کی ساری تفصیلات اب ہماری دسترس میں نہیں ہیں تاہم اس کے کام کی جو باقیات الصالحات اب ملتی ہیں ان سے اور نظم و نسق کی ایک رپورٹ سے اس پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ یہ رپورٹ ۱۸۹۲ - ۱۸۸۳ء کی ہے جس میں دارالترجمہ سے متعلق صرف یہ دو جملے ملتے ہیں:

"۲۵۰۲ روپیہ اجرت ترجمہ پر اس سال میں صرف ہوا اور سال حال میں کوئی کتاب جو انگریزی سے شاستری میں اور شاستری میں سے بھاشا، اور عربی سے اردو میں ترجمہ ہوئی ہیں، ختم نہیں ہوئی ہیں۔"

آگے یہ بھی لکھا ہے کہ اس بارے میں تفصیلی رپورٹ سالِ آئندہ میں درج ہو گی۔ بدقسمتی سے یہ رپورٹ دستیاب نہیں ہو سکی۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے جانشین مہاراجہ سری پرتاپ سنگھ کو ان امور سے دلچسپی نہیں تھی، اس لئے یہ ادارہ بند ہو گیا۔ اور اس کا سارا ذخیرہ ریسرچ لائبریری سری نگر میں منتقل کر دیا گیا۔ لیکن اس منتقلی کے سلسلے میں احتیاط ملحوظ نہ رکھنے سے اور منتقل

کرنے والوں کو اس عظیم کام کی اہمیت کا اندازہ نہ ہونے کی وجہ سے کئی مخطوطات ضائع ہو گئے۔ جو بچ گئے۔ وہ اب ریسرچ لائبریری میں زبیر کلکشن کے زیر عنوان محفوظ ہیں ان مخطوطات کی تہذیب اور ترتیب میں لائبریری کے سابق ناظم صاحبزادہ حسن شاہ صاحب کی دلچسپی شامل رہی اور جہاں تک اردو مخطوطات کا تعلق ہے راقم الحروف نے کسی قدر تھوڑا بہت ہاتھ بٹایا۔

زبیر کلکشن میں مخطوطات کی بڑی تعداد علم طب سے متعلق ہے اور یہ زیادہ تر انگریزی ترجمے ہیں، کچھ عربی اور فارسی کے ترجمے بھی اردو اور مقامی زبانوں میں کئے گئے ہیں۔ طب میں میٹیریا میڈیکا، علم تشریح، امراض اطفال، علم قابلہ پر کئی ترجمے ہوتے ہیں۔ طب کے علاوہ ایک دو مخطوطات انجینیری اور فن حرب سے متعلق ہیں۔ ایک رسالہ منطق پر، کار آمد فنون میں کاغذ سازی اور طباخی پر بھی ایک ایک رسالہ ملتا ہے اس کے علاوہ تاریخ اور مشاہیر مذہب کے بارے میں بھی مخطوطات ہیں۔

میٹیریا میڈیکا پر تین مخطوطات ملتے ہیں جو انگریزی سے اردو میں ترجمے کئے گئے ہیں لیکن اصل کتابوں کے نام درج نہیں ہیں۔ مخطوطہ نمبر ۱۹۱ میں صرف اتنا ذکر ہے کہ یہ انگریزی کا ترجمہ ہے۔ مخطوطہ نمبر ۱۲۱۴ نہایت ضخیم اور تین جلدوں پر مشتمل ہے اسی موضوع پر ایک اور مخطوطہ نمبر ۱۹۰ بھی ہے۔ یہ تینوں ترجمے سادہ، سلیس اور عام فہم اردو میں ہیں اور اردو کے ساتھ ناگری حروف میں بھی لکھے گئے ہیں۔ ترجمہ میں انگریزی کی اصطلاحیں عموماً جوں کی توں رکھی گئی ہیں جیسے سپرٹ، ٹنکچر اور ان کی شرح اردو میں دے دی ہے۔ اصطلاحوں کے فارسی مترادفات بھی درج کئے گئے ہیں۔ مثلاً مخطوطہ نمبر ۱۹۱ سے ایک دو مثالیں ملاحظہ

ہوں:

ٹرائی ٹیوریشن ۔ اس لفظ کے معنی سفوف کرنے کے ہیں۔

گرانیولیشن ۔ بجلہ اشیاء از قسم دھات کے دانے اسی ترکیب سے بناتے ہیں کہ دانے بھی بنتے جاتے ہیں۔ اسی طرح "سفننگ" فلٹریشن" فاسفارک اسڈ" پوٹاسیم" غرض ساری اصطلاحوں کی شرح کردی گئی ہے۔ انگریزی اصطلاحوں کو اردو حروف میں لکھنے میں ایک خاص بات یہ ملحوظ رکھی گئی ہے کہ انھیں حتی الامکان "رکنی" (SYLLABIC) املا میں لکھا گیا ہے مثلاً ڈمیی کاک شن ۔ سبلی می شن ۔ ڈیکینی ٹیشن وغیرہ انگریزی کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں لاطینی اصطلاحیں بھی درج کی گئی ہیں مثلاً گارگل "گارگا" بعض مشکل اردو الفاظ کے معنی ہندی میں بھی لکھ دیئے گئے ہیں۔

مخطوطہ نمبر ۱۹۰ بھی اسی موضوع پر ہے، جس کے آغاز میں موضوع کے بارے میں تفصیل درج کی گئی ہے۔ انگریزی ناموں اور اصطلاحوں کے علاوہ اردو میں جو نام اور اصطلاحیں رائج ہیں وہ بھی لکھ دی گئی ہیں۔ جیسے تیزاب سونٹھ، تیلے کا فوذ مثلث وغیرہ جہاں انگریزی کے اوزان لکھے گئے ہیں، ان کے مقابل ہندوستانی اوزان بھی دیئے گئے ہیں۔

مخطوطہ نمبر ۱۴۳ کے آغاز کی عبارت سے ان ترجموں کی خصوصیات پر کچھ روشنی پڑتی ہے لکھا ہے:

"اس گرنتھ کا نام ہے "میٹریا میڈیکا" اس فن کا نام ہے، جس سے فائدہ اور استعمال دوا کا معلوم ہوتا ہے اور جب تک اس فن سے واقفیت کماحقہٗ نہ ہو، تب تک بیماری کا علاج نہیں کیا جاتا ہے لیکن

فقط دوا کی خاصیت، فائدہ اور استعمال کا جاننا کافی نہیں ہے، ان کے ملانے اور وزن کرنے کی ترکیب سے بھی واقفیت پیدا کرنی ضرور ہے۔"

مخطوطہ نمبر ۱۹۱ سے بھی ایک اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے، اس پر ہندی کا اثر نمایاں ہے:

"تیسری قسم کی گوند کی اکیشیا دردے کا نام ہے کہ جس کو سنسکرت میں "گرسندر" کہتے ہیں۔ اور ہندوستان میں جو دیخول کا درکسن وار ولیہ کر کے ہوتا ہے، اس کے گوند کی خاصیت بھی اسی طرح ہے۔"

اناٹومی پر ایک ترجمہ اردو میں ہے جس کی دو جلدیں ہیں (مخطوطہ نمبر ۴۵۸) یہ دیوناگری خط میں لکھا ہوا ہے۔ ایک اور مخطوطہ علم الامراض اردو اور دیوناگری دونوں خطوں میں ہے (مخطوطہ نمبر ۲۰۰) زبان دونوں خطوں میں عام طور پر ایک ہی ہے۔ صرف کہیں کہیں لفظ بدلے گئے ہیں، مثلاً اردو میں "انسان" کی جگہ ناگری میں "آدمی"۔ علم طب کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"طب وہ علم ہے جس سے انسان (ناگری آدمی) کی تندرستی اور بیماری کا حال دریافت ہوتا ہے اور اس کے قاعدوں پر عمل کرنے سے صحت کا قیام اور مرض کا زوال ہوتا ہے۔"

"تعریف تشریح۔ یہ تشریح وہ علم ہے جس کے ذریعے سے اعضا کی ساخت اور شکل اور مقدار اور عدد اور وضع دریافت کی جاتی ہے۔"

"تعریف فزیالوجی۔ فزیالوجی اس علم کا نام ہے جس میں انسان کی صحت کے احوال مثل پرورشِ جسم اور خروج رطوبات اور دورانِ خون اور حرکت

تنفس اور کیفیت قوتِ ہاضمہ اور جاذبہ اور حقیقت تولدِ انسان اور پیدائش ہر عضو بدن اور ان کے امکان وغیرہ بیان کئے جاتے ہیں۔"

"ترجمہ شرح اسباب" کا مخطوطہ دو جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد میں عام امراض کی تفصیل ہے اور دوسری میں امراض کبیر جیسے سوء مزاج جگر، ضعف الکبد وغیرہ کی تفصیلات شامل ہیں۔ اس کے مترجم حکیم فدا محمد خاں نے اس پر ایک طویل دیباچہ قلمبند کیا ہے۔ جس میں اپنے کچھ حالات اور ترجمے کے بارے میں تفصیلات دی ہیں اور مہاراجہ رنبیر سنگھ کی مدح سرائی کی ہے۔ اس کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

"اما بعد احقر العباد الی اللہ الصمد فدا محمد ابن اشرف الحکماء حکیم محمد یوسف خاں مرحوم ابن زبدۃ الحکماء بطلیموس دوراں حکیم غلام حسین خاں مغفور شاہجہاں آبادی بخدمت شائقان و ماہران علم طب کے التماس کرتا ہے کہ کتاب شرح اسباب علامات حکیم نجیب الدین سمرقندی کی شرح ہے اور شارح اس کے جالینوس وقت فیثا غورث ثانی حکیم نفیس الدین کرمانی ہیں یہ شرح غایت اشتہار سے محتاج تعریف و توصیف کی نہیں ہے۔ مگر چونکہ زبان عربی میں ہے اکثر عوام اس کے فوائد سے محروم تھے۔ لہذا حسب الحکم بندگان عالی مقامی، حضور فیض گنجور داد گستر عالی گوہر، رعیت پرور، قدردان علم و ہنر برجیس مرتبت کیوان منزلت، نیر اعظم آسمان عظمت، ماہ منیر سپہر رفعت، معدن الجود والاحسان، فیاض زماں، معلی قشان، راجۂ راجگاں، مہاراج دھیراج راجیشور سری مہاراجہ رنبیر سنگھ بہادر مالک جموں و کشمیر کی سخاوت و بخشش اون کی شہرۂ آفاق ہے اور سب سے

زیادہ اون کو شوق ترقی علم وکمالات ہے اور زین صاحب زادے، والا تبار، گردوں وقار، حضور لامع النور جوں موالید ثلاثہ عالم اجسام ضروری الوجود وجوں ہر سہ ارواح بدن انسان مطلوب ومقصود۔۔۔۔"

"اسباب امراض" (مخطوطہ نمبر ۱۹۵، ۱۹۶) بھی دیوناگری اور اردو دونوں رسم الخط میں ہے۔ ابتدا میں امراض صداع اور ان کی تفصیل فارسی میں لکھی ہے اور ماخذوں کا ذکر کیا ہے۔ امراض نزلہ کی شرح کے حصے سے ایک اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے:

"آتش یا گرمی، عام یا گرمی سونگھنے چیزوں گرم، مثل مشک وغیرہ وچندا وزعفران یا مالش کی جاوے سر کوں ساتھ کسی گرم چیز کے تو یہ عاید ہوتا ہے۔ فقط

علامات: علامت اوس کی ظاہر ہونا سرخی آنکھوں کی خارش اور سوزش ہونا بینی کو، زیادہ ہونا مرض کا باعث گرمی تپ سے اور ہونا پیاس زیادہ۔۔۔۔"

ایک اور مخطوطہ (نمبر ۳۹۸) "اسباب الامراض والعلاجات" (بسنت رائے) کے مرتب کیے ہوئے رسالے کا ہے، اور یہ بھی اردو اور ناگری خطوں میں لکھا ہوا ہے، زبان اردو، پوٹھواری (ڈیوگھواری، پہاڑی) اور ہندی کا آمیزہ ہے، کتاب کی ابتدا میں ایک دیباچہ ناگری میں ملتا ہے جس میں مرتب نے اپنے کچھ حالات بیان کیے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"مہاراجہ والی جموں وکشمیر دی آگیا تے میں نے وسنت رائے برہمن

بیٹے شری لالہ بھولا ناتھ داد ے دیش نورمل نگر باشی نے چار کتابوں یونانی چکتسا پوٹھو داری بھاشا میں ایک جگہ اسی پتک دیکھے ماس سموت ۱۹۲۵ پر آرمبھ کر کے میٹھ ماس ۱۹۲۹ ماس آشاڑھ ماس کے دے پورن کیا۔۔۔۔"

مخطوط حمد و ثنا سے شروع ہوتا ہے۔ حمد و ثنا کے بعد مرتب نے کتاب کی تالیف کا حال لکھا ہے۔

"علاج الامراض" (مخطوطہ نمبر ۱۹۶) بسنت رائے اور فضل الدین کا ترجمہ ہے۔ بسنت رائے کا ترجمہ پوٹھو داری میں اور فضل الدّین کا اردو میں ہے۔ دونوں ترجمے سطر بسطر درج ہیں۔ یہ ترجمہ سمت ۱۹۲۵-۱۹۲۶ بکری میں مکمل ہوا تھا۔ مخطوطے کا آغاز ادبھار اور بنجاروں کے بیان سے ہوتا ہے۔ اس کا اقتباس ہے:

"ان امراض میں اکثر میدانی زہر بدن کے اندر سرایت کر جاتا ہے اور وہ یہ بیماریاں ہیں۔ اول ویرا ولا یعنی چیچک دویم رولی روا یعنی خسرہ، سیوم اسکارلٹ فیور یعنی سرخ بخار چہارم ایلی سیلس یعنی حمرہ۔۔۔۔۔"

دیباچہ میں اس کا تذکرہ ہے کہ اس کتاب کی تصنیف و تالیف ترتیب و تصحیح اور طباعت میں درجہ اول کے "نیٹیو" ڈاکٹر مرزا امیر بیگ سے بڑی مدد ملی، طب میں ان کی مہارت کی بھی تعریف کی گئی ہے۔ اور لکھا ہے کہ اس کتاب میں جتنے یونانی علاج شامل کئے گئے ہیں، وہ حکیم فضل الدّین کے مجوزہ ہیں۔ تالیف میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے ان کی تفصیل بھی دی ہے۔ اس کے علاوہ سی پی یاد لس

ایلیٹ ڈپٹی کمشنر لدھیانہ اور میجر مرسر، ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ کی امداد اور دلچسپی کا بھی اعتراف کیا ہے۔

امراض، ان کی تفصیل اور تشخیص کے بیان کرنے کا انداز صاف اور سلیس ہے جو اصطلاحیں عربی اور فارسی کی اردو میں رائج ہیں وہ استعمال کی گئی ہیں اور کہیں کہیں اصل انگریزی اصطلاحیں بھی برقرار رکھی گئی ہیں، بعض الفاظ میں املا کا اختلاف ہے، جیسے چوتی (چوٹی)، ستی کہ (ستی کہ)، چہرا دیتا ہے (چڑھا آتا ہے) وغیرہ۔ اس کے علاوہ کچھ مقامی الفاظ بھی آگئے ہیں جیسا کہ ذیل کے اقتباس سے واضح ہوگا:

"ان دانوں کے نکلنے کے تیسرے روز ایک رطوبت مثال پانی کے جس کو سیلم بولتے ہیں، بھر جاتی ہے یہ رطوبت بھرے دانے طب انگریزی میں ویسی کل کہلاتے ہیں۔ جڑ ان دانوں کی نہایت سخت اور متفرق ہوتی ہیں۔ سرے ان دانوں کے ہمیشہ دبے ہوئے ہوتے ہیں، اور یہی خاص کر ان دانوں کی شناخت ہے۔ ان دانوں کے نکلنے کے پانچویں روز رنگ اس رطوبت کا مثال کھوسی کے جس میں آدھا پانی سیرم اور آدھی پیپ ہو جاتا۔ سرے جو دبے ہوئے تھے وہ باعث بدفی دانوں کے اوٹھ جاتے ہیں اور دانہ پکنے شروع ہو جاتے ہیں۔"

"ترجمہ تشریح البدن" (مخطوط نمبر ۱۹۰)، اردو اور دیوناگری دونوں رسم خط میں لکھا گیا ہے۔ اس کے مترجم بھی لالہ بسنت رائے ہیں۔ زبان میں کسی قدر گنجلک ہے آغاز اس طرح کرتے ہیں،

"بعد حمد وسپاس حکیم علی الاطلاق واضح ہو کہ یہ کتاب بیان تشریحات میں

ہے اور تشریح عبارت ہے اظہار سے اور کشف کرنے حقیقت اوس شئ کی تمامہ جو اس میں کچھ شبہ ہووے جیسا کہ تشریح ہے کہ اول نطفہ بنایا خون بستہ، پھر بنایا اس کو پارۂ گوشت پھر اوس میں بنائیں استخوان اور پہنایا ان پر گوشت اور پوست اور بخشی صورت فقط"

اس مخطوطے کے کاتب رام چندر رینہ ہیں اور اختتام کا سال ۱۲۸۵ھ۔ ترقیمہ کی عبارت ہے :

" بہ اتمام رسید و بہ انجام انجامید رسالہ ہذا فی التشریح بدن الانسان حسب الایمائے سید احمد شاہ کہ از صاحب حکمائے اجلہ و اکابر روزگار است .... تحریر بتاریخ دوم ماہ مبارک ہکر سمت ۱۹۲۸ مطابق ۱۲۸۵ سنہ ہجریہ مقدسہ راقم رام چندر رینہ"

فن طب کے دو اور مخطوطات " ہدایت پیدائش بچہ" (مخطوطہ نمبر ۲۴۶)، اور" امراض الصبیان (مخطوطہ نمبر ۲۳۶) میں سے ایک صرف اردو میں اور دوسرا اردو اور ناگری میں ہے۔ ان کے مرتبین یا مترجمین کے ناموں کا پتہ نہیں چلتا۔ قیاس یہ ہے کہ یہ کتابیں بھی انگریزی سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ "ہدایت پیدائش بچہ" نامکمل حالت میں ہے اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :

" فصل اول، جاننا چاہیے کہ جب لڑکا پیدا ہو تو اس کے بدن کو ہوائے سرد سے محفوظ رکھیں، بعدہٗ ناف کی آنت کہ جس کو نال بھی کہتے ہیں، اور وہ مشیمہ یعنی آنول سے لگی ہوتی ہے، اوس کو انگوٹھے اور سبابہ کی انگلی سے پکڑ کر بچے" کے پیٹ سے آنول کی طرف یہ نرمی و ملائمی

اچھی طرح سے دو منٹ تا خلط ریح وغیرہ سے جو کچھ کہ اس میں ہوتا ہے
خوب صاف ہو جاوے، پھر سوت کے نرم دھاگے کو کسی مناسب روغن
میں چرب کر کے ناف کی انتڑی کو دو جگہ سے بخوبی باندیں، ایک
ناف کے نزدیک، دوسرا اس سے ایک بالشت کے فاصلے پر۔"

"امراض الصبیان" بچوں کے امراض اور علاج کے بارے میں اردو اور دیوناگری دونوں رسم خط میں لکھا گیا ہے۔ اصطلاح میں اردو، فارسی، ہندی اور انگریزی سب استعمال کی گئی ہیں۔ بعض اردو لفظوں کے مترادف ہندی لفظ بھی دے دیے ہیں جیسے عورت، استری، بیان، ورنن وغیرہ۔ رسالہ چھ مقالوں اور چار حصوں پر مشتمل ہے زبان صاف اور سلیس ہے بچوں کی ہڈی ٹوٹ جانے اور اس کے علاج کی تفصیل کے بارے میں لکھا ہے۔

"ہڈی ٹوٹ جانا" اصطلاح میں اس کو فراکچر بولتے ہیں، بچوں کی
ہڈی مثل جوانوں کے ٹوٹ کر دو ٹکڑے نہیں ہو جاتی، بلکہ خم کھا کر آدھی
چیخ جاتی ہے اور آدھی بل کھا جاتی ہے۔ علاج اس کا معمولی طور پر کریں
اور اسپلنٹ کو دو یا تین ہفتے باندھ رکھیں، مگر چمڑے یا موٹے کاغذ
کا اسپلنٹ بہ نسبت لکڑی کے بہتر ہے۔"

"دستور قابلہ" (مخطوطہ نمبر ۱۹۴) بھی اردو اور دیوناگری دونوں رسم خط میں لکھا گیا ہے ابتدا میں ناگری خط میں عنوانات کی تفصیل درج ہے۔ اصل متن کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

"مقدمہ۔ پہلی فصل، پلوس کی ہڈیوں کے بیان میں۔
واضح ہو کہ کوکھا اور چوتر اور ریڑھ اور تتمن اور دمچی کی ہڈیوں سے

مل کر ایک مجموعی شکل سیلفی کے مانند بنتی ہے اس کو انگریزی میں پلوس

لیتے ہیں۔"

"پلوس کی تشریح۔ پلوس چار ہڈیاں ہیں۔ دو ہڈیاں کوٹے کی جسکو ورس انا غیا

کہتے ہیں، اور تیسری ہڈی قطن، جس کو انگریزی میں سیکرم بولتے ہیں اور

چوتھی ہڈی دمچی کی جس کو عربی میں عصعص اور فارسی میں استخوان نشستگاہ

اور انگریزی میں کاکیکس کہتے ہیں۔"

ایک رسالہ مدرسہ طبیہ کے طلبہ کے لئے ہدایتوں کے طور پر مرتب کیا گیا تھا

جو ہدایت الاطبا" کے نام سے موسوم ہے۔ (مخطوطہ نمبر ۱۹۲) یہ رسالہ ایک تقریر

پر مشتمل ہے جو غالباً کسی عہدیدار نے طلبہ کے سامنے ان کی تعلیم کے اختتام کے

موقع پر کی تھی۔ تقریر میں پیشۂ طب کی اہمیت اور طبیب کی ذمہ داریوں پر زور

دیا گیا ہے اور نوجوانوں کو مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ کسی بڑے مقصد کو پیش نظر رکھیں۔

رسالہ کے مطالب مفید اور اسلوب دلچسپ بلکہ ادبی ہے ایک اقتباس یہاں

درج کیا جاتا ہے:۔

"ہم زاہد ریاکار اور حاکم ظالم کی بہ نسبت طبیب نامعتبر کا منہ دیکھنا زیادہ

پسند نہیں کرتے ہیں اس لئے کہ زاہد ریاکار اپنے ظاہر کو پاکی کے لباس

سے آراستہ رکھتا ہے اور اس کے نزدیک ہر وقت دروازہ توبہ کا

کھلا رہتا ہے۔ لیکن طبیب کا کام بذات خود اس قدر مخفی ہے کہ اس

کے ہم پیشہ لوگوں کو بہت کم پتہ لگتا ہے کہ اس نے اپنی دیانت کو

کیونکر نباہا اور عوام بہ سبب نہ ہونے معتبر پہچان کے، جس کے ذریعہ سے

ادیں کے کام کی بخوبی دریافت کرلیں۔ اپنی کسی خیالی دلیل پر اکثر اس کی عزت کرتے ہیں بہ ایں لحاظ کہ وہ ان کو لائق معلوم ہوتا ہے۔ اور اویں کی گفتگو شائستہ ہے یا کسی شخص کو اتفاقاً ایسے مرض سے آرام ملا ہے کہ جب بعض اطبا دست بردار ہوئے ہوں۔"

آخر میں طلبہ کو نصیحت کی گئی ہے کہ ہسپتال میں دلدہی سے کام کریں اور رات کا بڑا حصہ مطالعے میں صرف کریں۔

طب سے ہٹ کر دوسرے مفید فنون میں دو رسالے انجینری یا فن حرب سے متعلق ہیں، جن میں ایک مخطوطہ نمبر ۲۸۰ع رسالہ "مورچہ بندی" ہے جو کسی انگریزی رسالے کا ترجمہ ہے۔ اس کے مترجم مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار کے رکن رکین پنڈت بخشی رام ہیں۔ یہ رسالہ ۱۴۱ اوراق پر مشتمل ہے اور اس کی تکمیل کی تاریخ ۲۶ ساون سمت ۱۹۲۵ بکرمی ہے۔ رسالے کی ابتدا میں اصطلاحوں کی تشریح کی گئی اور مسائل کو سمجھایا گیا ہے۔ بمثلاً

"۱۔ کل عمارت حفاظت سے مطلب یہ ہے کہ تھوڑی فوج ایسی مفید جگہ پر رکھی جائے کہ وہ بہت سی فوج کا مقابلہ کر سکے۔"

۱۔ نعلا بت کو نچہ ایک لمبی آڑ کو کہتے ہیں جس سے پیچھے کے آدمیوں کی حفاظت بہ آسانی ہو سکے یا اس سے دشمن دور رہ سکے۔ اور یہ دو طرح کی ہے۔ ایک قدرتی، دوسری تیار کی ہوئی۔۔۔"

رسالے کے سرنامے پر یہ عبارت درج ہے!

"کتاب ترجمہ کردۂ پنڈت بخشی رام جی از کتاب انجینری انگریزی"

فوجی فنون سے متعلق ایک دوسرا رسالہ "علم تیراندازی" (مخطوطہ نمبر ۳۲۵۴) ہے
غلام غوث خاں نے تصنیف کیا تھا۔ غلام غوث خاں جموں کے رہنے والے تھے۔
اور مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار میں ملازم تھے۔ علم تیراندازی میں غالباً وہ میاں پرتاپ
سنگھ ولی عہد ریاست کے اتالیق تھے اور مہاراجہ کے ایماء پر انھوں نے یہ رسالہ
لکھا تھا۔ ابتدا میں وہ جس انداز سے پرتاپ سنگھ کی تعریف کرتے ہیں، اس سے
یہی ظاہر ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"در صفت خورشید آسمان شجاعت و سخاوت، ماہ منیر سپہر رفعت و عدالت
سری میاں صاحب پرتاپ سنگھ جیو صاحب بہادر دام اقبالہ می گوید"

* میاں کا لقب راجگان ڈوگرہ خاص طور پر ولی عہد سلطنت کے لئے استعمال ہوتا
تھا۔ ایک نظم مہاراجہ رنبیر سنگھ کی تعریف میں بھی لکھی ہے۔ اور اس کا بھی تذکرہ کیا
ہے کہ مہاراجہ نے ان سے علم تیر و کمان پر ایک رسالہ لکھنے کی فرمائش کی تھی۔

رسالہ پچیس کلیات پر مشتمل ہے اور آغاز پیغمبر اسلام کی سنت سے۔ اس واقعے
سے ہوتا ہے کہ آپ اکثر منبر پر یہ آیت تلاوت فرمایا کرتے تھے "واعدوا لهم
ما استطعتم من قوة" اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے "الآن قوت الرمح" اس لئے
علماء کہتے ہیں کہ علم تیراندازی کا سیکھنا ادب بلکہ سنت ہے۔ وہ علم تیراندازی کا آغاز
حضرت آدم سے بتاتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

علم تیراندازی کا رب نے جو بھیجا در جہاں   ہوا نزول آدم کو یک کمان بے گماں
حضرت جبریل نے سکھلایا آدم کو یہ ہنر   تب سے رواج در جہاں ہوا ہنر تیر و کماں

غلام غوث خاں غالباً اس فن کے اچھے ماہر تھے لیکن وہ اپنے اشعار پر زبان نہیں

اور شاعر تو وہ بہت کم ہیں۔ کئی جگہ انھوں نے اردو اور فارسی اشعار بھرتی کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ سب تک بندی ہے۔

پکوان کی ہدایت پر مشتمل ایک رسالہ "رہنمائے رسوئیاں" (مخطوطہ نمبر ۴۵۵) ناقص الآخر ہے اس کے مصنف کا پتہ نہیں چلتا۔ رسالے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

"چونکہ یہ امر قابل لحاظ تصور کیا گیا ہے کہ جب کبھی کوئی لطیف یا نفیس یعنی تکلف دار اور مزے دار کھانا بنوانا ہو تو ایسے ہر طرح کے کھانے کے بنانے سے یخنی، شوربا، آب جوش اور آب گوشت کے بنانے کی بہت ضرورت ہے مگر جس حالت میں کہ روزمرہ کے طور پر کھانے بنوانا ہو تو اس حالت میں ان شوربوں کے بنانے کی ضرورت نہیں۔"

فنونِ مفیدہ میں کاغذ سازی پر ایک رسالہ (مخطوطہ نمبر ۴۴۴) اہم ہے جو کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے لیکن اصل کتاب اس کے مصنف اور مترجم میں سے کسی کا پتا نہیں چلتا۔ یہ رسالہ "کاغذ سازی" کے نام سے موسوم ہے اور کاغذ سازی میں جن مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ ان سب کی تفصیل اس میں لکھی گئی ہے۔ مشینوں کے نقشے بھی دیئے گئے ہیں، اور کیمفیر صاحب کے حوالے بھی جگہ جگہ دیئے گئے ہیں۔

"تذکرہ حالات انبیا" (مخطوطہ نمبر ۴۳۷) اور "ذکر اولیائے ہنود" (مخطوطہ نمبر ۴۵۶) دو کار نامے اہمیت کے حامل ہیں۔ "تذکرۂ حالاتِ انبیا" کے مصنف کا نام مخطوطے میں درج نہیں ہے۔ اس میں آدمؑ سے لے کر حضرت محمد اور ظہور دانیالؑ تک سارے اہم پیغمبروں کے مختصر حالات لکھے گئے ہیں۔ اس میں ان انبیا کے حالات شامل ہیں۔

"آدم، قابیل و ہابیل، شیث، عوج بن عنق، ادریس، نوح، ہود، صالح، ابراہیم، اسماعیل، داؤد، سلیمان، عزیر، خضر، یعقوب، یوسف، ایوب، عمران، موسیٰ، ہارون، عیسیٰ، یوشع، کالوب، سموئیل، محمد رسول اللہ صلعم، ظہور دانیال"

آدم کے حال میں لکھا ہے۔

"آدم علیہ السلام سب سے پہلے پیغمبر ہیں۔ محرم کی دسویں تاریخ جمعہ کے دن بعد زوال کے آپ کے جسم مبارک میں روح داخل ہوئی، بعد اس کے فرشتوں نے سجدہ کیا اور بہ سبب کھانے گیہوں کے بہشت سے نکالے گئے۔ ان کی پسلی کو چیر کر حوا کو نکالا ان ہی سے تمام دنیا کی آبادی ہوئی۔"

قابیل اور ہابیل کے واقعے کو تفصیل سے لکھا ہے اور یہ ایک دلچسپ مختصر قصہ بن گیا ہے۔ زبان اور اسلوب دونوں میں سادگی اور سلاست ہے۔

"ذکر اولیائے ہنود" نابھوداس کی "بھگت مال" کا ترجمہ ہے۔ مترجم کے نام کا پتا نہیں چلتا۔ کتاب کا اسلوبِ تحریر صاف اور سلیس ہے کہیں کہیں ادبی چاشنی بھی موجود ہے۔

آگے میر مادھو کی کرامات اور بھگوان کی اس پر عنایات کا ذکر ہے۔ ان کے ایک فارسی قصیدے کا مطلع بھی لکھا ہے۔

تا کے زخود رائی سخن سری کرشن گو سری کرشن گو
بگذار کبر باد من، سری کرشن گو سری کرشن گو

ایک رسالہ علم منطق پر "کتاب کبریٰ کا ترجمہ ہے اور کتاب کبریٰ اور علم منطق کے"

نام سے موسوم ہے (مخطوطہ نمبر ۲۲۶) یہ ترجمہ سنسکرت اور اردو میں ہے اور دونوں ترجمے سطر بہ سطر لکھے گئے ہیں۔ سب سے پہلے فارسی ہے جو نہایت خوشخط ہے۔ اس کے نیچے سنسکرت اور سنسکرت کے نیچے ہندوستانی ا[illegible]تانی ترجمے میں ڈوگری اور پنجابی کی اتنی ملاوٹ ہے کہ قدیم اردو یا دکھنی کا انداز معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً یہ اقتباس ملاحظہ ہے:-

"جانو! سادھان ہووے کہ منشیہ کو ایسا چیتنا واجب ہے، کیسا کہ جیسا تس میں دستوؤں کیاں مورتیاں لکھنے آوتیاں ہیں جس پرکار درپنا میں مورتیاں لکھنے آوتیاں ہیں۔ پر تو دپن میں محسوساتوں کیاں مورتیاں کیوں دیکھنے میں آوتیاں ہیں......"

یہ رسالہ اپنے مطالب اور ترجمے کے طریقے کے لحاظ سے تو اہم ہے ہی اس کے علاوہ لسانی مطالعے کے لئے بھی مفید مواد فراہم کرتا ہے۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے درباری، بابو نصر اللہ عیسائی نے، جن کے بارے میں اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ انکی کشمیر سے متعلق تصنیف "ہینڈ بک" کو تاریخ رہنمائے کشمیر کے نام سے منتقل کیا تھا (مخطوطہ نمبر ۳۴۴) اس کے دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں کہ یہ ترجمہ اردو میں مہاراجہ کے حکم سے کیا گیا اور مکمل ہونے کے بعد ان کی خدمت میں منظوری کے لئے پیش ہوا۔ یہ ترجمہ ۱۸۷۴ء میں ہوا تھا۔ وادیِ کشمیر کے بارے میں ایک عبارت کا ترجمہ حسب ذیل ہے:-

"کشمیر خصوصاً ایک ہی بڑی اور خوبصورت وادی ہے جو کہ ہر طرف سے بلند اور برفانی پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے جس میں دریائے

جہلم موجزن ہے اور علاوہ اس بڑی وادی کے اور بھی چھوٹی چھوٹی وادیاں ہیں جن سے چہاروں طرف سے اس دریا میں پانی پڑتا ہے مگر وادیٔ کشمیر ان تمام وادیوں سے بڑی اور مشہور و معروف ہے۔"

اس دارالترجمہ کے ناظم پنڈت گنیش کول مقرر ہوئے تھے۔ دارالترجمہ کے انتظام کے بارے میں اب تک کوئی تفصیلات دستیاب نہیں ہوئیں۔ اتفاق سے حکومت کی نظم و نسق کی ایک رپورٹ میں جو ۱۸۸۲-۸۳ء سے متعلق اُردو میں لکھی گئی ہے، ایک اندراج ملتا ہے جس سے اس کے ایک سال کے اخراجاتِ ترجمہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ لکھا ہے:

"۴۰۲۵ روپیہ اجرت ترجمہ پر اس سال صرف ہوا اور سال حال میں کوئی کتاب جو انگریزی سے شاستری اور شاستری سے بھاشا اور عربی سے اردو میں ترجمہ ہوئی ہیں ختم نہیں ہوئی ہیں لہٰذا ان کی تفصیلی رپورٹ سالِ آئندہ میں درج ہوگی۔"

دارالترجمہ کی مساعی سے ہٹ کر مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں ریاست جموں و کشمیر میں اور علمی اور ادبی کام بھی ہوئے۔ اسی زمانے میں وزارت لداخ ریاست جموں و کشمیر نے اردو میں ایک رسالہ مرتب کروایا تھا۔ یہ رسالہ "پیداوار و جانوران لداخ" کے عنوان سے ۱۸۸۵ء میں مکمل ہوا۔ اسی سال مہاراجہ رنبیر سنگھ کا انتقال ہو گیا۔ رسالہ مرتب ہونے کے بعد وزیر وزارتِ لداخ، سردار محمد اکبر خاں نے اسے دیوان لکھپت رائے کی خدمت میں منظوری کے لیے پیش کیا تھا۔

پیداوار میں زمینی اور جانوروں کا ذکر علیحدہ علیحدہ کیا گیا ہے۔ زمینی پیداوار میں اکھروٹ (اخروٹ)، خوبانی، توت، انگور، سیب اور دوسرے میووں کی تفصیل

دی گئی ہے اور ان کی پیدائش کے رقبوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اسی طرح درختوں اور نباتات کی ان ساری قسموں کا بھی ذکر ہے جو اس دور دراز ملک میں پیدا ہوتے ہیں۔ جانوروں میں جنگلی بیل، جنگلی بکری، ہرن، گرگ، جنگلی کتا، لونبڑی، (لومڑی)، سانپ، جنگلی چوہا، خرگوش، مچھلی اور دریا سگ آبی، مرغ آبی، بگلا خورد، رام چکرا، دشک (جو بٹیر جیسا ایک پرندہ ہوتا ہے)، کبوتر، رگو (ایک چڑیا) چکنا (ایک چڑیا) کی تفصیل لکھی گئی ہے۔ دریاؤں اور کانوں کا حال بھی لکھا ہے۔ کانوں کے بیان سے ایک اقتباس ذیل میں دیا جاتا ہے:-

"علاقہ لوبراہ میں موضع پنامیک کے نزدیک ایک میدان ہے جس سے پھولی پیدا ہوتی ہے اور یہ جگہ لداخ سے پانچ منزل ہے اور علاوہ اس کے ایک کان پھولی علاقہ ٹانگی گوگرہ میں بھی ہے، مگر اوس جگہ سے لانے سے خرچ زیادہ آمدنی کم ہے۔ اس واسطے اس جگہ سے لائی نہیں جاتی۔"

یہ رسالہ ایک سرکاری دستاویز ہے۔ اور اس زمانے میں مرتب ہوا جب اردو کو ابھی سرکاری زبان کا مرتبہ نہیں ملا تھا۔ نظم و نسق کی ایک رپورٹ کا حوالہ بھی اوپر گذر چکا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اردو کو سرکاری زبان تسلیم کرنے سے بہت پہلے ہی یہ سرکاری دفتروں اور عوام و خواص میں رائج اور مقبول ہو چکی تھی۔

اسی نوعیت کی ایک اہم دستاویز مہتہ شیر سنگھ کا سفرنامہ بھی ہے جو ۱۸۶۶ سے ۱۸۶۷ء میں تحریر ہوا تھا۔ مہتہ شیر سنگھ رامپور (کشمیر) کے رہنے والے تھے اور مہاراجہ رنبیر سنگھ کی سرکار میں ملازم تھے۔ مہاراجہ کے حکم سے انہوں نے نزدیں، منگولیا، روس، تاشقند، یارقند، خوقند، بخارا، مجیرہ کا دورہ کر کے تجارت کے مواقع معلوم کرنے اور اسے فروغ دینے کے مقصد سے یہ سفرنامہ مرتب کیا تھا۔ یہ ایک طرح سے سرکاری رپورٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مہتہ شیر سنگھ نے سری نگر سے لے

کر ان سارے مقامات کے راستوں، وہاں کی حکومت اور کچھ سماجی حالات کی بھی تفصیل لکھی ہے۔ نیز منازل اور فاصلوں کو کئی جدولوں کی صورت میں مرتب کیا ہے انھوں نے سفرنامے کے دیباچے میں اپنے متعلق چند باتیں اور سفر پر روانہ ہونے کی تفصیلات لکھی ہیں۔ لکھتے ہیں:

" واضح ہو کہ یہ نمک پروردہ قدیمی حضور انور سری مہاراجہ صاحب بہادر فیاض زماں والی جموں و کشمیر ساکنہ خاص رامپور کا مہتہ شیر سنگھ نام قوم کا برہمن اور بہ نظر نمک اور آب و دانہ مقررہ، بہ روانگی واسطے کرنے دریافت حال تجارت ملک شاہ روس و امیر خوقند لطیف، و امیر بخارا شریف کے شہر سرینگر سے یعنی پایہ تخت حضور پُر نور بہ بدرقہ لطف الٰہی روانہ ہوا۔ چنانچہ یہ نیازمند بتاریخ ۱۲ ماہ ساون سمت ۱۹۲۳ بکرماجیتی مکان مذکورہ سے بعد حصول قدمبوسی حضور انور براہ مظفر آباد و ہزارہ و اٹک و پشاور و کابل و بلخ و بخارا و سمرقند و طاش قند و خوقند لطیف و کاشغار و یارقند و لداکھ وغیرہ گردش کر کے بعد مدت شانزدہ ماہ بتاریخ ۱۲ ماہ کاتک سمت ۱۹۲۴ قدمبوس پایۂ تخت جنت نظیر کا ہوا۔"

مہتہ شیر سنگھ نے کل ۱۷۲ مقامات کا حال لکھا ہے۔ بعض چھوٹے چھوٹے مقامات کا ذکر انھوں نے ترک کر دیا ہے کیونکہ انھیں ڈر تھا کہ اس سے سفرنامہ بہت طویل ہو جائے گا۔ ان ملکوں کے کچھ حالات سوالات اور جوابات کی شکل میں بھی لکھے ہیں۔ اس طرح یہ سفرنامہ بڑی مفید معلومات کا مخزن ہے اور ایک

ایسے زمانے میں لکھی ہوئی دستاویز ہونے کی حیثیت سے جب سفر کی وہ سہولتیں میسر نہیں تھیں جو آج کل موجود ہیں، یہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔

یہ سفرنامہ مرتب ہونے کے بعد یکم فروری ۱۸۶۸ء کو دیوان نہال چند کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ اس طرح اس سفرنامے کی حیثیت بھی سرکاری دستاویز کی ہو گئی ہے۔
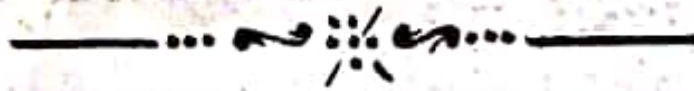
سیّد ضمیر حسن

دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی

انیسویں صدی ہندوستان کی ثقافتی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ اس دور کے مطالعہ سے اس ذہنی انقلاب کا پتہ چلتا ہے جو بے پاؤں ہماری اجتماعی زندگی میں آرہا تھا۔ پلاسی کی لڑائی کے بعد انگریزوں نے وسطی ہندوستان اور صوبہ جات اودھ کی سیاسی ناکہ بندی کا کام بڑی تیزی سے شروع کر دیا تھا۔ اودھ کا الحاق[1] اور ضابطۂ انضمام[2] اسی منصوبے کی دو اہم کڑیاں ہیں۔ اس وقت سلطنتِ مغلیہ کی شمع جھلملا رہی تھی اور انگریزی تسلط کی بنیادیں دن بدن مضبوط ہو رہی تھیں۔ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی فوجیں فاتحانہ پرچم کے ساتھ دلی تک پہنچ گئیں اور انگریزوں نے ضعیف العمر شاہ عالم کو جو عبدالقادر روہیلہ کے ہاتھوں نابینا ہو چکا تھا۔ اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اور وہ تیموری جلال جس کے آگے کبھی شانِ جم اور شوکتِ روم حقیر معلوم

---

[1] Annexation of Audh

[2] Doctrine of Tapse

ہوتی تھی نیست و نابود ہو گیا۔ شاہ عالم کی حکومت تو خیر پالم تک تھی لیکن اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی حکومت سمٹ کر قلعے کی چار دیواری تک رہ گئی یہ بساط بھی ۱۸۵۷ء میں درہم برہم ہو گئی۔

غدر ایک پیدا ہونے والا کوئی سیاسی ہنگامہ نہیں تھا۔ اسے حریت پسندوں کی آخری اور اجتماعی جدوجہد کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ انگریزوں نے ہندوستان کے سیاسی اقتدار پر قبضہ کرنے کے لئے گذشتہ دو سو برس سے جو سازشوں کا جال پھیلا رکھا تھا اس سے ہندوستان کے وہ لوگ جن کی نگاہ دور تک جاتی تھی بے خبر نہ تھے۔ اس عہد کا اردو ادب ٹوٹی پھوٹی جاگیر دارانہ اقدار کا علم بردار سہی، بیرونی مداخلت کاروں کی اس تشکست وریخت کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ ہم نے اس ادبی سرمائے کا اس نظر سے جائزہ نہیں لیا۔ معاشی استحصال جو انگریزوں نے ہندوستان میں ایک مدت تک کیا تھا اور جس کے بل پر انگلستان کے صنعتی انقلاب میں جان پڑ گئی تھی ہماری سیاسی پسپائی کا سب سے بڑا سبب بنا یہ بات مصحفی جیسے غزل گو کی نگاہ دوررس سے پوشیدہ نہ تھی۔

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بتدبیر کھینچ لی!!

بادیسی حکمرانوں کی بے دست و پائی پر جرأت جیسے معاملہ بند شاعر کا یہ اظہار خیال بڑا معنی خیز ہے۔

کہئے نہ انھیں امیر اب اور نہ وزیر انگریزوں کے ہاتھ قفس میں اسیر

جو کچھ وہ پڑھائیں سو یہ منہ سے بولیں بنگالے کی مینا ہیں یورپ کے اسیر

مختصر یہ کہ ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ولسٹرٹ محض عسکری تغلب کا نتیجہ نہیں تھا۔ بلکہ یہ داستان اورنگ زیب کی وفات سے غدر تک تقریباً ڈھائی سو برس کی مدت میں پھیلی ہوئی ہے۔

میخانۂ یورپ کے دستور نرالے ہیں لاتے ہیں سرور اوّل دیتے ہیں شراب آخر (اقبال)

اس موقعہ پر اپنی کوتاہیوں کا ذکر کرنا بھی کچھ بے جا نہیں ہے۔ زندگی کے وہ فرسودہ ضابطے جو قوموں کی زندگی کو گھن کی طرح کھا جاتے ہیں ہماری تہذیب کا ایک لازمی جزو بن گئے تھے۔ حرکت اور عمل کا دور دور کہیں پتہ نہیں تھا۔ شاہان اودھ اور وارثانِ تختِ دہلی معزول کئے جانے پر عورتوں کی طرح روتے تھے۔ جدوجہد کرنے، تلوار دکھانے اور میدان میں نبرد آزما ہونے کا حوصلہ ان میں باقی نہ رہا تھا۔ یہ صورت حال بھلا کب تک برقرار رہتی۔ آخر وہی حشر ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ کوئی ماحول کی ظلمت سے لڑے یا نہ لڑے رات خود صبح کے آثار تک آجاتی ہے سیاسی بساط کے ساتھ ساتھ تہذیبی بساط پر بھی زندگی آموز تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ نئے تقاضوں اور نئی تبدیلیوں نے تکلفات کا طلسم توڑا۔ اور زندگی میں سادگی اور سچائی کی نئی روایات جگہ پانے لگیں۔ اردو ادب کا نگہ گھر میں چھوئی موئی کی طرح دنیا سے الگ تھلگ نہیں رہا ہے۔ اس میں ایک سماجی احساس اور زندگی کے تقاضوں کا احترام موجود ہے۔ چنانچہ ان حقیقت پسندانہ تبدیلیوں کو جو انگریزی تسلط کے ساتھ ساتھ ہندوستانی عوام کی زندگی میں ایک خوشگوار انقلاب لا رہی تھیں فروغ دینے میں اردو والے زندگی کے کسی دوسرے شعبہ سے

پیچھے نہیں ہے۔ نئے سائنٹفک ذہن بنانے اور سنوارنے میں اسکا قابل قدر حصہ ہے اس کار خیر کو بالعموم سر سید اور ان کے رفقاء کار سے منسوب کیا جاتا رہا ہے! وراپنی وسعت اور ہمہ گیری کے اعتبار سے سر سید تحریک اس نحو کا ای کی بجا طور پر مستحق بھی ہے۔ لیکن اس کی چمن بندی میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور قدیم دلی کالج کی ان روایات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جنہوں نے عہد وسطیٰ کے اختتام پر ہمیں نئے مغربی نقطہ ہائے نظر سے مصالحت کرنے کا سلیقہ سکھایا۔ انیسویں صدی کے اوائل سے وسط تک جو کارہائے نمایاں ان دو اداروں نے ادبی اور خصوصاً نثری سطح پر انجام دیئے ہیں انھیں نظر انداز کر کے اس پورے انقلاب کو سمجھنا جس کے نتیجہ میں ہندوستان قدیم سے جدید دور میں داخل ہوا، قریب قریب ناممکن اور بڑی گمراہ کن بات ہے۔ فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء میں صاحبان نو آموز کو اردو پڑھانے کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ اسی لئے وہ صرف زبان دانی کا کالج ہو کر رہ گیا اور اس کا اثر بھی طرز و اسلوب کی حد سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس کے مخاطب ہندوستانی نہیں انگریز تھے۔ اور اس کی تعمیر میں مستشرقین کے پیش نظر کچھ سیاسی مفادات کا حصول بھی تھا اس لئے بیرون کالج اس کا زیادہ اثر نہ ہو سکا لیکن دہلی کالج ہندوستانیوں کی ترقی کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ اور اس کا اصلی مقصد ان کو اردو کے ذریعے یورپی علوم سے روشناس کرانا تھا اس لئے ایک نئی فضا اور ایک نئی شش جہت پیدا کرنے میں دہلی کالج نے فورٹ ولیم کالج کے مقابلے پر زیادہ گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ہندوستان میں انگریزوں کے اثر سے جگا ہیں جو بیداری پیدا ہوئی تھی اس کی حیثیت ادبی ہے مگر دہلی میں اس کی

حیثیت سائنسی ہے۔ اس قدیم شہر میں جو پرانی تہذیب کا علامتی مرکز تھا مغربی تمدن کی برکتوں کا یہ احساس کبھی بھی اتنی جلد پیدا نہ ہوتا[۱] اگر دہلی کالج کی نامور شخصیتیں اس کے لئے شعوری کوشش نہ کرتیں اور وہ اپنی تصانیف کے ذریعہ ان خیالات کی باقاعدہ اشاعت نہ کرتیں۔ مادری زبان میں تعلیم سے کس طرح علوم کے سب دروازے طلبا پر کھلتے ہیں اور ان کی شخصیت میں کس طرح استواری، گہرائی، حسن اور نکھار آتا ہے۔ اس کی سب سے اچھی مثال دہلی کالج کی تاریخ ہے۔

دہلی کالج کے تعلیمی تجربوں کے ساتھ دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کا ذکر کرنا بھی ناگزیر ہے۔ یہ سوسائٹی ۱۸۴۲ء میں قائم ہوئی۔ اور غدر سے پہلے تک اس نے ایک سو سترہ کتابیں ترجمے اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ تیار کرلی تھیں۔ ان کتابوں کی تیاری میں علمی اصطلاحوں کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کے جو اصول ملحوظ رکھے گئے تھے۔ وہ آج بھی ہمارے لئے شمع راہ بن سکتے ہیں۔ افسوس ہے کہ دارالترجمہ حیدرآباد نے ان متوازن اصولوں کا خاطر خواہ خیال نہ رکھا جس کی بنا پر اردو ترجمے کی روایت میں آگے چل کر کجی آگئی اور انگریزی اصطلاحات کے مترادفات کے نام پر ثقیل عربی اور فارسی الفاظ نے ہمارے ترجموں کی افادیت کو مجروح کردیا۔ کچھ عرصے پہلے تک دہلی کالج کے کارناموں سے ناواقفیت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ فورٹ ولیم کی ادبی اور علمی کوششوں اور سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کے درمیان اس اہم اور وسیع کڑی کو لوگ جانتے ہی نہ تھے اور اس وجہ سے انیسویں صدی کے نصف اول کو اردو نثر کا تاریک دور کہا جاتا تھا، حالانکہ غالب کے خطوط کی سادگی، سرسید

۱؎ بحوالہ مضمون پروفیسر آل احمد سرور، دہلی کالج میگزین ۱۹۵۳ء

کے اسلوب کی واقفیت اور اصلیت اور آزادانہ اور حالی کے افق ذہنی کی تعمیر میں دہلی کالج اور دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کی پیدا کردہ ادبی فضا کو جو دخل ہے وہ کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دہلی کالج ان چند ہندوستانی اداروں میں سے ایک ہے جہاں ۱۸۲۴ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظام کی سفارش پر برطانوی پارلیمنٹ کے ایک فیصلہ کی رو سے انگریزی کی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا۔ ان لوگوں میں جنہوں نے دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کو فروغ دینے میں سعی بلیغ انجام دی، مسٹر بوترو[1]، ڈاکٹر اشپرنگر[2]، منشی کریم الدین، مولوی ذکاء اللہ، پنڈت رام چندر، پنڈت رام کرشن، ماسٹر بھیروں پرشاد، پیارے لال، ہر دیو سنگھ اور ڈاکٹر ضیاء الدین قابل ذکر ہیں۔ اور ماسٹر رام چندر اور مولانا صہبائی اس انجمن کے روح رواں تھے۔

اس انجمن نے جو مفید کتابیں شائع کیں وہ طلباء کے بہت کام آئیں اور ان کی دیکھا دیکھی آگرے اور لکھنؤ میں بھی اس قسم کی کتابیں شائع کرنے کے لئے ادارے قائم کئے گئے اور یہاں سے بڑی کثرت سے کتابیں شائع کی گئیں۔ جو انڈیا آفس لندن کی لائبریری میں موجود ہیں۔ ان تراجم، تصانیف اور تالیفات سے ایک طرف تو اردو نثر بہت صاف سادہ اور بے تکلف ہو گئی اور دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ مغربی علوم، فلسفہ اور افکار سے ہندوستانی طلباء کو براہ راست واقفیت حاصل ہوئی۔ چنانچہ کئی موقعوں پر جب مقامی زبانوں میں تعلیم و تدریس کا سرکاری جائزہ لیا گیا تو دلی کالج میں اردو کے ذریعہ جو سائنس کی تعلیم دی جاتی تھی اس کی بڑی تعریف کی گئی۔

---

[1] Mr. Boutros (فرانسیسی مستشرق)

[2] Alios Sprenger (جرمن مستشرق)

بقول مولوی عبدالحق ریاضی نیچرل سائنس، فلاسفی، اور تاریخ وغیرہ میں شعبۂ انگریزی کے طلباء کو اردو ذریعۂ تعلیم کے طلبا نیچا دکھلانے لگے تھے اور مقابلے کے امتحان میں بازی لے جاتے تھے۔ مادری زبان میں تعلیم دینے کا تجربہ دہلی کی اس قدیم درسگاہ میں جس قدر کامیاب ہوا اس کا اندازہ اس زمانے کی تعلیمی رپورٹوں سے بخوبی کیا جا سکتا ہے البتہ اس راہ میں جو دشواری تھی وہ یہ تھی کہ جدید مغربی علوم پر ہندوستانی زبانوں میں کتابیں نایاب تھیں۔ تاریخ، جغرافیہ، سائنس، علم کیمیا نباتات، علم جراحی، علم تمدن، علم معاشرت پر اردو میں نہ تو خود تصنیف کردہ کتابیں تھیں اور نہ ہی تراجم دستیاب ہوتے تھے۔ اس کمی کو دور کرنے کے لئے متعدد کوششیں کی گئیں ایک ایجوکیشنل کمیٹی بھی قائم ہوئی لیکن کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ آخر علم وادب کے دلدادگان کے زیر اثر ایک تحریک چلی جس کے تحت انجمن اشاعت علوم بذریعہ السنۂ ملکی[1] وجود میں آئی۔ اس انجمن کے سرپرست اور معاون ہندوستانی اور انگریز دونوں ہی تھے۔ انتظامیہ کمیٹی مندرجہ ذیل چھ افراد پر مشتمل تھی۔

۱۔ ٹی مٹکاف ۲۔ سی گرانٹ، ۳۔ لے نے سی۔ ریون شا، ۴۔ ڈبلیو سین کونٹن، ۵۔ دوار کا ناتھ ٹیگور، ۶۔ دہلی کالج کے پرنسپل چونکہ اس کے فعال ممبر پرنسپل دہلی کالج مسٹر بوتیرو تھے، انھوں نے اپنے کالج میں ہی نشر واشاعت کا یہ سلسلہ جاری رکھا اور جب تک یہ جماعت قائم رہی دہلی کالج کے مدرسین اور طلباء ہی سب کام سرانجام دیتے رہے اس لئے اس انجمن کو بقول ڈاکٹر

---

[1] The Society for the promotion of the knowledge in India through the medium of Vernacular languages

عبدالحق دہلی کالج ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کہنا ہی زیادہ مناسب ہے۔ یہ سوسائٹی ہندی اور بنگالی زبانوں میں کام کرنا چاہتی تھی۔ لیکن کچھ مالی مجبوریوں کے باعث اور اس حقیقت کے پیش نظر کہ اردو اپنی مقبولیت کی بنا پر مغربی علوم کی ترویج کا سب سے موثر آلہ ہے اس نے بعد میں صرف اردو تراجم ہی پیش کئے۔

دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی نے اردو ادب اور خصوصاً اردو نثر کا دامن وسیع کرنے میں جو اہم خدمت انجام دی اس کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ اس نے انیسویں صدی کے نصف اول میں اردو زبان میں متنوع مضامین اور موضوعات پر متعدد کتابیں شائع کردیں اور اسی روایت نے آگے چل کے اردو نثر کی روایت کو اتنا فروغ دیا کہ بقول مہدی افادی "یہ کل کی چھوکری یورپ کی بڑی زبانوں سے آنکھ ملانے کے لائق ہو گئی"۔ دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کی تالیفات اور تراجم سے کچھ اہم کتابوں کے نام ذیل کی فہرست میں پیش کئے جاتے ہیں

۱۔ تاریخ انگلستان (خلاصہ تاریخ گولڈ اسمتھ)

۲۔ تاریخ یونان

۳۔ تاریخ روم

۴۔ رامائن

۵۔ مہابھارت

۶۔ دھرم شاستر

۷۔ رسالہ اصول حساب

۸۔ مبادیات تفرقی احصاء و تکمیلی احصاء[1]

---

1. Elements of Differential and Integral Calculus

۹- روشنی کا انعکاس اور اجتماعِ شعاع[۱]

۱۰- تجزیاتی جیومٹری[۲]

۱۱- ہائڈروسٹیٹیک[۳]

۱۲- حرارت[۴]

۱۳- برقیات[۵]

سب سے زیادہ اہم بات جس کا ذکر کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس سے آج بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے ان قواعد و ضوابط کی ہے جو اس ادارے نے ٹرانسلیشن کے لئے مقرر کئے تھے۔ ان قواعد کی روشنی میں ہمیں آئندہ کے امکانات کی راہ تعین کرنی چاہئے۔ اور زبان کو اس نیچرل رجحان کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرنی چاہئے جس سمت میں یہ ادارہ تراجم اور تالیفات کی شکل میں لسانی پیش رفت کر رہا تھا۔

۱- جب سائنس کا کوئی ایسا لفظ آئے جس کا مترادف اردو میں

---

۱ Double Refraction and Polarisation of light

۲ Analytical Geometry

۳ Hydrostatics

۴ Heat

۵ Electricity

Scanned with CamScanner

...نہیں مثلاً سوڈیم[1]، پوٹاسیم[2]، کلورین[3] وغیرہ تو ایسے لفظ بجنسہ اردو میں لے لینے میں کوئی حرج نہیں۔ یہی قاعدہ ایسے خطابات والقاب کے بارے میں مدِنظر رکھا جائے جس کے مساوی خطابات والقاب ہندوستان کی تاریخ میں نہیں پائے جاتے۔ مثلاً بشپ[4]، ڈیوک[5]، ارل[6]، کلکٹر[7]

۲۔ اگر سائنس کا کوئی لفظ ایسا ہے جس کا مترادف اردو میں پایا جاتا ہے تو اردو لفظ ہی استعمال کرنا چاہیے جیسے آئرن[8] کے لئے لوہا، سلفر[9] کے لئے گندھک، سمنز[10] کے لئے وزیر سمنز کے لئے طلب نامہ

۳۔ اگر لفظ مرکب ہے اور ہر دو لفظ انگریزی میں اور دونوں میں سے کسی کا مترادف اردو میں نہیں تو وہ لفظ بجنسہ اردو میں منتقل کردیا جائے جیسے ہائڈرو کلورک کیونکہ ہائیڈروجن اور کلورین میں سے کسی کا مترادف اردو میں نہیں ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ پورے انگریزی جملے کو بجنسہ اردو میں لے لیا جائے بلکہ اسے اردو میں ادا کرنے کی کوشش کی جائے مثلاً ملٹری آرڈر آف دی باتھ[11] کو لشکری جماعت باتھ کی اور ملٹری اینڈ ریلیجس آرڈر آف مالٹا[12] کو لشکری و مذہبی جماعت مالٹا کی ترجمہ کیا جائے۔

---

1. Sodium 2. Potassium 3. Chlorine 4. Bishop
5. Duke 6. Earl 7. Collector 8. Iron
9. Sulphur 10. Summons 11. Military order of the bath 12. Military and Religeous order of Malta

۴۔ اگر لفظ مرکب ہے اور اردو میں اس کا مترادف نہیں مگر الگ الگ لفظ کے مترادف اردو میں موجود ہیں تو یا ان دونوں لفظوں کو ملا کر یا کسی دوسرے مساوی مفہوم کا الفاظ میں ترجمہ کیا جائے مثلاً کرانولوجی[۱] کا ترجمہ علم زمان، ہاؤس آف لارڈز[۲] کا کچہری امیروں کی اور ہاؤس آف کامنز[۳] کا کچہری دکھلائے رعایا کی۔

۵۔ جب یہ قاعدہ یا قاعدۂ ذیل آسانی سے مطابق نہ ہو تو پھر غیر زبان کا لفظ اردو میں لیا جائے جیسے ہائیڈروجن، نائٹروجن۔

۶۔ اگر مرکب لفظ ایسے دو مفرد الفاظ سے بنا ہے جن میں سے ایک کا مترادف اردو میں موجود ہے مگر دوسرے کا مترادف نہیں تو ایک انگریزی اور دوسرے اردو لفظ سے مرکب بنا لیا جائے جیسے کورٹ آف ڈائرکٹرز کا ترجمہ کچہری ڈائرکٹروں کی، آرچ بشپ، بشپ اعلیٰ کر لیا جائے۔

۷۔ بعض لفظ ایسے ہیں جیسے آرڈر[۴]، کلاس[۵]، جینیئس[۶]، اسپیشیز[۷] جن کے مترادف اگرچہ کسی نہ کسی صورت میں اردو میں پائے جاتے ہیں تاہم انگریزی الفاظ اردو میں منتقل کر لئے جائیں تو بہتر ہوگا۔ کیونکہ اردو میں اس قسم کے الفاظ ایک دوسرے کے مترادف ہوتے ہیں۔ اور اس سے ایک دوسرے کے مفہوم سمجھنے میں مغالطہ پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ ان الفاظ کے معانی کا امتیاز نیچرل ہسٹری میں بہت ہے۔

---

[۱] Chronology [۲] House of Lords [۳] House of Commons [۴] Order [۵] Class [۶] Genius [۷] Species

۸- درختوں کے انواع (خاندانوں) کے نام یا تو اس نوع (خاندان) کے کسی ممتاز فرد کے نام پر رکھے جاتے ہیں یا اس نوع کی مشترکہ خاصیتوں کی بنا پر نام رکھ لیا جاتا ہے اس قاعدے کی پابندی اردو میں کی جائے۔

اوپر کے قواعد میں اردو مترادف سے مطلب ایسا لفظ ہے جو ملک کے تعلیم یافتہ اور متوسط درجے کے طبقے میں معروف ہے اگر ہماری مشرقی زبانوں کی ڈکشنریوں میں کوئی مترادف لفظ نہیں ملے اور پنڈتوں اور مولویوں سے پوچھنے کی ضرورت پڑے تو اس سے یہ بہتر ہوگا کہ انگریزی لفظ ہی اختیار کر لیا جائے سائنس کا ترجمہ انگریزی ہی سے کیا جائے گا۔ اس لئے انگریزی الفاظ سے زبان کو بچانا تقریباً ناممکن ہے۔

ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کی گئی تھی کہ جہاں تک آسانی سے ممکن ہو انگریزی الفاظ کے استعمال سے احتراز کیا جائے۔ جو شخص کسی سائنس کا ترجمہ کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ اس سائنس پر جو کتابیں اس سے قبل لکھی جا چکی ہیں انھیں مہیا کرے اور جب تک کوئی خاص وجہ نہ ہو انھیں الفاظ کے استعمال کرنے کی کوشش کرے جو ان کتابوں میں استعمال کئے گئے ہیں۔ جب کسی انگریزی کے جملے میں کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہو جس سے اہل ہند واقف نہ ہوں تو مترجم کو چاہئے کہ حاشیئے میں یا مناسب ہو تو متن میں اس کی مختصر طور سے تشریح کر دے۔

مترجم کو لفظ بہ لفظ ترجمے کی کبھی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ ترجمے میں سب سے بڑی بات اصل مفہوم یعنی جملے کے معنی اور مطلب کو صحیح طور سے ادا کرنا ہے خواہ اس کی ساخت یا طرز ادا کیسی ہی مختلف کیوں نہ ہو۔

کیمسٹری کی اصطلاحات کے بارے میں یہ رائے دی گئی تھی کہ تمام اصطلاحات کو بجنسہ اردو میں لے لینا مناسب ہوگا۔ البتہ کیمیائی عناصر جن کے نام اردو میں موجود ہیں وہ ویسے ہی رہنے دئے جائیں لیکن مرکبات میں انگریزی نام ہی رہیں۔ جیسے ہائیڈرو سلیفورک[1]۔ چونکہ اصطلاحی الفاظ کے مادّے تعداد میں بہت زیادہ ہیں اس لئے ان کی تفہیم میں زیادہ مشکل نہ ہوگی۔

نباتات کا ترجمہ بہت کٹھن ہے۔ یورپین مصطلحات کا لفظی ترجمہ بالکل مہمل ہوجائے گا۔ البتہ جو طریقہ درختوں کے نام رکھنے کا بتایا گیا ہے وہ بہتر رہے گا اور عام طور پر مستعمل ہے خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ یورپ کے کسی خاندان کے نہایت ممتاز افراد ہمیشہ وہی نہیں ہوتے جو ہندوستان میں ہیں۔ بہر حال یہ نہایت ضروری ہے کہ کوئی صاحب جو نباتات کا علم رکھتے ہوں اور اردو بھی خوب جانتے ہوں اس کام کو انجام دیں۔

اردو تراجم کے مذکورہ بالا اصول آج بھی ان اداروں کو سامنے رکھنے چاہئیں جو یہ کام کر رہے ہیں۔ دہلی ورنیکلر سوسائٹی نے غیر زبانوں سے تراجم اور تالیفات کا کام کرکے اردو نثر میں بڑی رنگارنگی پیدا کی ہے اور اس اعتبار سے اس سوسائٹی کے کارنامے ادب کی تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھنے کے لائق ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس سوسائٹی کے قیام سے پہلے اردو زبان دکن اور دہلی میں ترقی کی کئی منزلیں طے کرچکی تھیں لیکن جہاں تک نثر کا تعلق ہے اس

---

1. Hydrosulphuric

وقت لیے بھی ابتدائی حالت ایسی تھی۔ گو فورٹ ولیم کالج کے ادیب اس سلسلے میں کچھ کام کر چکے تھے مگر یہ کام محدود تھا سوائے آرائش محفل، تاریخ شیر شاہی یا تاریخ نادری کے یا دو ایک تذکروں کے اور جو کچھ بھی لکھا گیا وہ افسانوی قسم کا تھا، درسی یا سائنسی قسم کا ادب یہاں لکھا گیا زبان کو سادہ اور کار آمد بنانے کا جو کام میر امن، حیدری اور اکرام علی کے ہاتھوں شروع ہوا تھا دہلی کالج میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ دہلی کالج میں کام کرنے والوں نے نئی تہذیب سے مفاہمت کی ایسی فضا پیدا کی تھی جس سے بعد میں مرزا غالب، سر سید، نذیر احمد، حالی اور آزاد سب متاثر ہوئے اس لحاظ سے دہلی کالج اردو ادب کے درمیانی ارتقا کی وہ کڑی ہے جس کا ایک سرا فورٹ ولیم سے ملتا ہے تو دوسرا غالب و سر سید سے۔ لہذا اردو ادب کے ارتقاء کے اس پہلو کا تفصیلی مطالعہ کیا جانا ضروری ہے۔
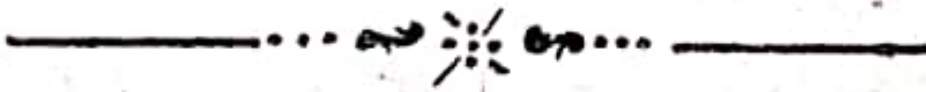
ڈاکٹر امیر عارفی

دارالترجمہ عثمانیہ

بیسویں صدی کا سب سے بڑا ادبی اور تعلیمی کارنامہ یہ ہے کہ اس صدی میں ایک ایسی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا، جہاں طلبا کو مادری زبان یعنی اردو زبان میں تعلیم دی جاتی تھی یہ ایک ایسا تجربہ تھا جس کی مثال تاریخ ہند میں اس سے پہلے نہیں ملتی کیونکہ دہلی کالج اور دوسرے تعلیمی اداروں میں ثانوی درجہ تک اور زیادہ سے زیادہ کالج میں آرٹس کے مضامین تک ذریعہ تعلیم اردو رہی — لیکن عثمانیہ یونیورسٹی نے آرٹس کے علاوہ سائنس انجینئرنگ، میڈیکل سائنس قانون، سوشیالوجی، ریاضی اور طب جیسے علوم کو پہلی مرتبہ اردو میں اعلیٰ سطح پر تعلیم کا کامیاب تجربہ کیا جو حیرت ناک حد تک کامیاب رہا۔ اس میں شبہ نہیں کہ علی گڑھ کالج کی نور بیز کرنیں ملک کے اطراف و جوانب میں دور دور تک پہنچیں اور وہاں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طلبہ نے ملک کے مختلف حصوں میں اپنے جوہر علمی دکھلائے لیکن خود علی گڑھ یونیورسٹی کے سنگ بنیاد میں نظام حیدرآباد اور اہل حیدرآباد کا زبردست دخل رہا ہے۔ عثمانیہ ہاسٹل، نظام میوزیم آج بھی اس دور کی یاد

دلاتے ہیں۔ سر سید نے جو علم کی شمع روشن کی اس کی کرنوں سے ملک کے ہر حصہ میں نئی شمعیں روشن ہوتی گئیں۔ حیدرآباد میں بھی اس کے کئی پروانے موجود تھے اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا تھا کہ یہاں بھی کسی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آتا۔ سب سے پہلے ۱۸۸۵ء میں عمادالسلطنت سر سالار جنگ ثانی نے "نظام یونیورسٹی" کا ایک منصوبہ پیش کیا۔ یہ علی گڈھ کے مدرستہ العلوم کے ٹھیک دس سال بعد کی بات ہے۔ اس وقت کے حالات اور ریاست کی سیاست و معاشرت اور فضا اس منصوبہ کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتی تھی۔ اس لئے یہ صرف تصور بن کر رہ گیا۔

نظام حیدرآباد میر عثمان علی خاں مرحوم کی تخت نشینی (۲۹ اگست ۱۹۱۱ء) کے بعد حیدرآباد میں بھی "حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس" کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کانفرنس نے ایک نیا شعور پیدا کیا۔ اور کسی بڑے تعلیمی ادارے کے قیام کے لئے فضا تیار کرنے میں بڑی مدد پہونچائی اس وقت ریاست حیدرآباد میں ریاست کے علمی طبی انجینئرنگ سول سروس اور دیگر شعبہ جات کے امتحانات ہوا کرتے تھے ضرورت اس بات کی تھی کہ ان امتحانات کو ایک مربوط سلسلہ سے جوڑا جاتا۔

۱۳۳۶ھ ۱۹۱۷ء میں سر حیدر نواز جنگ نے جو عرف عام میں سر اکبر حیدری کے نام سے مشہور تھے ایک عرضداشت میر عثمان علی خاں نظام حیدرآباد کی خدمت میں پیش کی۔ اس عرضداشت کے اصل محرک بابائے اردو مولوی عبدالحق تھے۔

پروفیسر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں۔ "میں عثمانیہ یونیورسٹی کا اصل بانی مولوی عبدالحق کو سمجھتا ہوں جب حیدر نواز جنگ ایجوکیشنل سکریٹری ہوئے تو مولوی عبدالحق

نے جوان کے مزاج میں دخیل تھے اردو زبان کے ذریعہ سے اعلیٰ تعلیم کی تجویز ان کے روبرو پیش کی، حیدر نواز جنگ کی تحریک پر میر عثمان علی خاں نظام حیدرآباد نے شرف قبولیت بخشا۔[۱]

اصل بانی اکبر حیدری ہوں یا مولوی عبدالحق دونوں ہی اردو دنیا سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔

سر اکبر حیدری اس عرضداشت میں موجودہ طریقہ تعلیم کے نقائص کی تفصیل اور ان پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"موجودہ طریقہ تعلیم کی دورنگی اور بے اصولی کو مٹانے اور ان خطرناک نقائص کو رفع کرنے کے لئے جو موجودہ طریقہ تعلیم نے پیدا کئے ہیں اور جو گھن کی طرح ہمارے نظام تمدن و معاشرت و قوائے دماغی اور جسمانی کو اندر ہی اندر کھاتے چلے جا رہے ہیں۔ ہمیں ایک جدید یونیورسٹی کی ضرورت ہے جس کی بنیاد صحیح اصول تعلیم ملکی ضروریات اور قومی خصائص پر قائم ہو۔ جس میں قدیم و جدید دونوں طریقوں کی خوبیوں سے فائدہ اٹھایا جائے جو تعلیمی بھی ہو اور امتحانی بھی اور ساتھ ہی تالیف و ترجمہ کا کام بھی کرے۔"[۲]

---

[۱] یادوں کی دنیا - پروفیسر یوسف حسین خاں

[۲] دکن میں اردو - نصیر الدین ہاشمی ص ۳۶۵ - پانچواں ایڈیشن کراچی سنہ ۱۹۶۰ء

اس عرضداشت کو نظام حیدرآباد نے شرف قبولیت بخشا اور یونیورسٹی کے قیام کا اعلان شاہی فرمان کے ذریعہ کیا۔

شاہی فرمان میں تحریر کیا کہ:

"مجھے بھی اس عرضداشت سے پورا اتفاق ہے ممالک محروسہ ریاست حیدرآباد دکن) کے لئے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں قدیم مشرقی اور مغربی علوم و فنون کا امتزاج اس طور سے کیا جائے کہ موجودہ نظام تعلیم کے نقائص دور ہو کر جسمانی دماغی اور روحانی تعلیم کے قدیم و جدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا فائدہ حاصل ہو سکے۔ جس میں علم پھیلانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ تمام علمی شعبوں میں اعلیٰ درجے کی تحقیق کا کام بھی جاری رہے۔

اس یونیورسٹی کا اصل اصول یہ ہونا چاہیئے کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان "اردو" قرار دی جائے اور انگریزی زبان کی تعلیم بھی بحیثیت ایک زبان کے ہر طالب علم پر لازمی گردانی جائے۔ لہٰذا میں خوشی کے ساتھ اجازت دیتا ہوں کہ میری تخت نشینی کی یادگار میں حسب مذکور اصول معمولہ عرضداشت کے موافق ممالک محروسہ کے لئے حیدرآباد میں یونیورسٹی قائم کرنے کی کاروائی شروع کی جائے اس یونیورسٹی کا نام "عثمانیہ یونیورسٹی" حیدرآباد ہوگا۔[1]

فرمان کی اشاعت کے بعد حیدرآباد کے علمی اور ادبی حلقوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ سر اکبر حیدری، مولوی عبدالحق اور اہل دکن نے جس پودے کا بیج بویا تھا بالآخر وہ ثمر آور ہوا۔ ۲۸ راگست ۱۹۱۹ء کو حیدرآباد کے ایک پر فضا مقام آغا منزل

---

[1] دکن میں اردو۔ نصیر الدین ہاشمی ص۲۲۶ پانچواں ایڈیشن کراچی ۱۹۶۰ء

میں عثمانیہ یونیورسٹی کا افتتاح ہوا (سانحۂ توپ) اور ارد گرد کی کئی عمارتیں یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے لئے کرایہ پر حاصل کی گئیں۔ وائس چانسلری کے لئے نظر انتخاب ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری پر پڑی۔ ان کی ناگہانی موت نے یونیورسٹی کو قابل ترین ہستی سے محروم کر دیا۔ صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے بحیثیت معین امیر جامعہ (وائس چانسلر) نے جامعہ عثمانیہ کا افتتاح فرمایا۔ اور دوسرے دن سے باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام سے پہلے ہی ترجمہ و تالیف کا مسئلہ زیر بحث رہا۔ کیونکہ یہ طے ہو جانے کے بعد کہ اعلیٰ تعلیم اردو میں دی جائے گی اس کے لئے نصابی کتابوں کی فراہمی اور ترجموں کے لئے اصطلاحات کا مسئلہ درپیش ہوا۔ ویسے دہلی کالج میں بھی ترجمہ کا کام ہو چکا تھا اور خود حیدرآباد میں شمس الامراء امیر کبیر نے اپنے ذاتی شوق کے لئے ایک دارالترجمہ قائم کیا تھا، جس میں فرانسیسی اور انگریزی کی چند سائنسی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا تھا۔ یہ ایک انفرادی کوشش تھی۔ لیکن یہ کوشش کسی بھی یونیورسٹی کی ضروریات کی تکمیل سے قاصر تھی۔ اسی لئے عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام سے دو سال پہلے ۱۴ ار اگست ۱۹۱۷ء کو تالیف و ترجمہ کا شعبہ قائم کیا گیا۔ تاکہ یہ شعبہ اصطلاحات اور ترجمہ کے مسائل پر سیر حاصل بحث کر کے کسی ایک نتیجہ پر پہونچے اور طلباء کے لئے نصابی کتب تیار کرے اس غرض سے دارالترجمہ کے لئے ۴ کمیٹیوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ۱۔ ارکان دارالترجمہ ۲۔ ارکان مجلس وضع اصطلاحات ۳۔ مجلس اہل علم و فن جن سے وضع اصطلاحات کے سلسلہ میں مشورہ لیا جاتا تھا۔ ۴۔ مجلس انتخابات نصابات۔ علوم و فنون کی کتابوں کا انتخاب کرنے والی کمیٹی۔

(۵) مجلس نظر ثانی ۔ (۶) مذہبی نقطہ نظر سے ترجموں پر غور کرنے کے لئے کمیٹی (۷) ادبی نقطہ نظر سے ترجموں کو دیکھنے والی کمیٹی

۱۔ ارکانِ دار الترجمہ ۔ مولوی عبدالحق (ناظم) قاضی محمد حسین ۔ چودھری برکت علی مولوی سید ہاشمی فرید آبادی ۔ مولوی محمد الیاس برنی ۔ قاضی تلمیذ حسین ۔ مولوی ظفر علی خاں ۔ مولانا عبدالماجد دریابادی ۔ چودھری برکت علی ۔ نعمت اللہ خاں ۔ محمد سعید الدین، نصیر احمد عثمانی ۔ مولوی عبدالحلیم شرر ۔ مولوی سید علی رضا ۔ عبداللہ العمادی غلام محمد خان ۔

۲۔ مستقل ارکان مجلس وضع اصطلاحات

مولوی عبدالحق (بہ اعتبار عہدہ ناظم دار الترجمہ) مولوی مرزا مہدی خاں کوکب ۔ مولوی حمید الدین ۔ مولوی علی حیدر طباطبائی (صدر یار جنگ) ۔ مولوی وحید الدین سلیم اپنے عہد کے ممتاز عالم تھے ۔ ان دونوں حضرات کو ماہرینِ زبان کی حیثیت سے مجلس وضع اصطلاحات میں لیا گیا تھا ۔

۳۔ مجلس اہلِ علم ۔

حسب ذیل حضرات سے "وضع اصطلاحات" میں مشورہ اور ان کے علم سے استفادہ کیا جاتا تھا ۔ خان محمد فضل خان ۔ پروفیسر عبدالواسع صفا ۔ پروفیسر عبدالرحمٰن مرزا محمد ہادی رسوا ۔ مولانا سلیمان ندوی ۔ سر سید راس مسعود ۔

۴۔ مجلس انتخاب نصاب ۔ اس کمیٹی میں ہر زبان اور مضمون کے ماہرین کو رکھا گیا تھا تاکہ وہ انگریزی اور دوسرے تمام علوم وفنون کی معیاری اور مستند کتابوں کی تخلیق درجات کے کورس کو مدِنظر رکھ کر ترجمہ کے لئے انتخاب کریں ۔

۵۔ مجلس نظر ثانی ۔ اس کمیٹی کے نگراں حاجی صفی الدین تھے۔

۶۔ ناظر امور مذہبی ۔ علی حیدر نظم طباطبائی ناظر امور مذہبی تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ مذہبی نقطہ نظر سے ترجمہ شدہ کتابوں کا جائزہ لیں۔

۷۔ مشیر ادب ۔ اس عہدہ پر جوش ملیح آبادی کا تقرر ہوا۔ جوش پہلے دارالترجمہ میں "مترجم انگریزی ادب" کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ چونکہ علی حیدر نظم طباطبائی ابتدا ہی سے "مشیر ادب" اور "ناظر مذہبی" دونوں خدمتوں کو انجام دے رہے تھے، نظم طباطبائی کی پنشن کے بعد "مشیر ادب" کے عہدہ پر جوش ملیح آبادی کا تقرر ہوا اور ناظر امور مذہبی کی حیثیت سے مولانا عبداللہ العمادی کا تقرر عمل میں آیا۔

مولوی عبدالحق، دارالترجمہ سے جب شعبہ اردو میں بحیثیت پروفیسر مقرر ہو گئے تو مولانا عنایت اللہ دہلوی نے ۱۹۲۱ء میں بحیثیت ناظم دارالترجمہ اس عہدہ کو سنبھالا۔

ترجمہ کے لئے دارالترجمہ میں مستقل اسٹاف رکھا گیا تھا۔ اس میں اس بات کا خیال ملحوظ رکھا گیا تھا کہ مترجم اپنے مضمون کا ماہر ہو۔ انگریزی اور اردو زبان پر پوری قدرت رکھتا ہو۔ مستقل مترجمین کے علاوہ تمام ہندوستان کے اسکالرز کی خدمات دارالترجمہ کے لئے بھاری معاوضہ پر حاصل کی گئیں تھیں۔

ذیل میں چند ممتاز مترجمین کے نام تحریر کئے جاتے ہیں

پروفیسر ہارون خان شروانی ۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ علامہ حکیم کبیرالدین ۔ ڈاکٹر ضیاءالدین انصاری ۔ رشید احمد ۔ سید ابوالخیر مودودی ۔ عبدالمجید صدیقی ۔ میجر فرحت علی مولوی فدا علی ۔ محبوب علی مجوی ۔ اشرف الحق ۔ احسان احمد ۔ عبدالباری ندوی ۔

سنجاجے پوری - محمد ابراہیم - مرزا لبیب وغیرہ ان حضرات کے علاوہ اور بہت سے نام ہیں جنہوں نے اعلیٰ اور معیاری کتابوں کا بہترین ترجمہ کیا جس کتاب کا ترجمہ کیا جاتا اس کے سرورق پر اصل مصنف کا نام۔ معیار قابلیت کے لئے اس کی تمام ڈگریوں اور اس کے عہدہ کی صراحت کردی جاتی تھی۔ اس کے نیچے مترجم کا نام اس کی ڈگری اور اس کا عہدہ بھی لکھا جاتا تھا۔ اس کے بعد نظر ثانی کرنے والی شخصیت کا نام، ڈگری اور عہدہ لکھ دیا جاتا تھا۔ تاکہ مضمون، کتاب اور ترجمہ کے مستند ہونے کا ثبوت واضح ہو جائے۔

دارالترجمہ میں پہلے ابتدائی، ثانوی جماعتوں کے لئے کتابیں ترجمہ کی گئیں۔ ۱۹۱۹ء میں جب عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تو انٹرمیڈیٹ آرٹس، سائنس، کامرس بی اے، بی ایس سی، بی کام - ایم - اے - ایم ایس سی - ایم - کام - قانون سوشیالوجی، طب یونانی، میڈیسن، انجینیرنگ، میکانیکل، سیول، الیکٹریکل۔ اور ریاضی، الجبرا، جیومیٹری وغیرہ کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ دارالترجمہ میں جملہ علوم وفنون کی ۴۶۵ کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔

دارالترجمہ نے ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۸ء تک پورے اکتیس سال تک اپنی عظیم الشان روایات کو برقرار رکھا۔ ۱۹۵۰ء میں جب عثمانیہ یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم اردو کے بجائے انگریزی کو قرار دیا گیا تو دارالترجمہ داستان پارینہ بن کر رہ گیا۔

وضع اصطلاحات:

پہلی مرتبہ دہلی کالج میں باقاعدہ ترجمے کے کام کا آغاز ہوا۔ صرف ترجمہ ہی نہیں بلکہ وہاں سائنس اور دیگر علوم کی اصطلاحتیں وضع کی گئیں۔ اس کے لئے دہلی کالج

میں ایک کمیٹی "مجلس اصطلاحات" بھی قائم کی گئی تھی۔ اس کمیٹی نے وضع اصطلاحات کے لئے کچھ اصول بھی مرتب کئے تھے۔ ان اصولوں کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

سائنس کے کسی لفظ کا مترادف اردو میں موجود نہ ہو جو سادہ خیال ظاہر کرتا ہے جیسے "سوڈیم" "کلورین" تو اس کو بجنسہٖ قبول کر لیا جائے۔ یہی اصول عہدوں، القاب و خطابات کے سلسلہ میں اختیار کیا جائے گا۔ جن کا ذکر تاریخ میں آئے گا۔

سائنس کے کسی لفظ کا سادہ و سلیس مترادف لفظ اردو میں موجود ہو تو اردو لفظ استعمال کیا جائے۔ جیسے آئرن کیلئے لوہا — سلفر کے لئے گندھک، منسٹر کے وزیر۔

اگر لفظ مرکب ہے اس کے دونوں جز کا مترادف اردو میں نہ ملے تو اس کو بجنسہٖ قبول کر لیا جائے۔ ہائیڈروجن اور کلورین وغیرہ۔

اگر لفظ مرکب ہے اس کا مترادف اردو میں نہیں ہے، مگر اس کے ہر جز کے مترادف اردو میں موجود ہوں تو یا تو ان دونوں کو ملا کر یا دوسرے مساوی مفہوم کے الفاظ میں ترجمہ کر لیا جائے جیسے "کرانالوجی" کا ترجمہ "علم زمان" وغیرہ،

جب ان قاعدوں میں سے کوئی بھی قاعدہ پورا نہ اترتا ہو تو غیر زبان کا لفظ بجنسہٖ اردو میں لے لیا جائے جیسے نائٹروجن وغیرہ۔

اگر مرکب لفظ دو مفرد الفاظ سے بنا ہے جس کا ایک مترادف اردو میں ہے اور دوسرے کا نہیں ہے تو ایک انگریزی اور دوسرے اردو سے مرکب بنا لیا جائے۔

بعض الفاظ انگریزی یا غیر زبان میں ایسے ہیں جن کے مترادف الفاظ اردو میں موجود ہیں لیکن ان الفاظ کو بجنسہٖ انگریزی سے اردو میں قبول کرلینا چاہئے کیونکہ انگریزی لفظ کا اردو میں مترادف موجود ہے لیکن اس کے صحیح مفہوم و معنی میں مغالطہ پیدا ہوجاتا ہے اور "نیچرل ہسٹری" میں یہ بات اہم ہوتی ہے، اس لئے انگریزی لفظ استعمال کرنا ضروری ہے۔

درختوں کے نام اُن کی خصوصیت، تاثیر یا کسی ممتاز شخصیت پر رکھے جاتے ہیں اس کا ترجمہ کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے۔

اگر ہماری مشرقی لغات میں کوئی ہم معنی لفظ نہ ملے، مولویوں اور پنڈتوں سے پوچھنے کی ضرورت لاحق ہو تو بہتر یہی ہے کہ انگریزی لفظ قبول کرلیا جائے سائنس کا ترجمہ انگریزی سے کیا جائے گا۔ اس لئے انگریزی سے بچنا ناممکن ہے اور ساتھ میں یہ بھی ہدایت کی گئی تھی کہ حتی الامکان انگریزی سے احتراز کیا جائے مترجم کو لفظ بہ لفظ ترجمے کی کوشش نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ترجمے میں سب سے بڑی بات اصل مفہوم یعنی جملہ کے معنی اور مطلب کو صحیح طور سے ادا کرنا ہے۔ کیمسٹری کی اصطلاحات کو بجنسہٖ اردو میں قبول کرلینا چاہئے البتہ کیمیائی عناصر کے مترادف اردو میں ہوں تو وہ لئے جائیں کیمیائی مرکبات کے نام انگریزی رہیں۔

یہ وہ اصول ہیں جو دہلی کالج کی مجلس وضع اصطلاحات نے بنائے تھے ان اصولوں سے اس عہد کی ذہنی کاوش اور تلاش وجستجو اور وضع اصطلاحات کی لگن کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس عہد میں ترجمہ اور اصطلاحات کے لئے اصول کا مرتب کرنا ہی سب سے بڑی بات ہے۔ یہ ابتدائی نقوش تھے جو ۱۸۲۵ء میں مرتب

کیے گئے تھے اور دارالترجمہ ۱۹۱۷ء میں قائم کیا گیا۔ ظاہر ہے انگریزی سے راست واقفیت اور اس کے ادب سے شناسائی نئیں کوئی مشکل نہ تھی اس وقت تک زبان ایک نئے سانچے میں ڈھل گئی تھی اور انگریزی کے مسلسل استعمال کی بدولت اس کے مزاج و نات بھی اردو بننے شروع ہو گئے تھے۔ سید حسین بلگرامی (عماد الملک) نے وضع اصطلاحات پر بہت زیادہ کام کیا ہے۔ جب وہ لکھنؤ میں کالج کے پروفیسر تھے تو انھوں نے ایک طویل مقالہ اس موضوع پر تحریر کیا تھا! وہ سرکاری و غیر سرکاری "وضع اصطلاحات" کمیٹیوں میں وہ شریک رہے۔ انھیں اس موضوع سے جذباتی لگاؤ تھا۔

جب دارالترجمہ میں وضع اصطلاحات کمیٹی قائم ہوئی تو سید حسین بلگرامی نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کی درخواست پر "وضع اصطلاحات علمیہ" کے لئے چند اصول مرتب کیے جو حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اصول وضع اصطلاحات کا یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حافظے پر بار کم ڈالا جائے۔ اس لئے ایسے اصطلاحات وضع کرنا جن میں لفظاً موضوع دلہٗ سے کوئی مناسبت نہیں ہے بالکل نامناسب ہے اس سے جہاں تک ممکن ہو احتراز کیا جائے۔

۲۔ زبان عربی میں جتنی اصطلاحات قدیم زمانے سے موجود ہیں ان کو ترک نہ کیا جائے ان کے لئے جدید مصطلحات وضع کرنے کی ضرورت نہیں مثلاً ہیئت۔ ہندسہ اور اس کے فروع، حساب، جبر و مقابلہ، اقلیدس وغیرہ یا طب تشریح منطق وغیرہ میں ہمارے اساتذۂ فنون نے جو مصطلحات قدیم زمانے میں وضع یا کسی دوسری زبان سے اخذ کیں وہ قائم رہیں ان کے عوض جدید مصطلحات وضع نہ کی جائیں ذرا سی توجہ سے معلوم ہو جائے گا کہ بعض فنون کی متعدد عربی مصطلحات

آج یورپ کی زبانوں میں رائج ہیں پھر ہم کیوں اپنی مصطلحات ترک کریں۔

۳- جو لغات غیر زبان سے لے کر قدیم زمانے میں معرّب کر لئے گئے ہیں یا جو دخیل ہیں وہ اپنے حال پر قائم رہیں۔ اصل کی طرف رجوع کرنا ضروری نہیں۔

۴- جدید مصطلحات اردو زبان کے لئے وضع کرنے میں جہاں تک ممکن ہو امور ذیل ملحوظ رہیں۔ حتی الامکان ہندی، فارسی، عربی اور انگریزی کے انہی لغات سے مدد لی جائے جو ہماری زبان اردو میں مروج ہیں۔ غیر مانوس جدید لغات سے احتراز کیا جائے۔

۵- ثقیل تلفظ۔ رکاکت۔ تراکیب۔ مغلق و غیر مانوس طولانی اضافات وغیرہ سے پرہیز کیا جائے۔

۶- اسم سے فعل بنا لینا ایک قسم کا تصرف ہے جس کی بڑی ضرورت ہے اس کو جائز رکھا جائے۔

۷- ہیئات، ترمیم، فک اضافت اور دوسرے تصرفات سے بوقت ضرورت بے تامل کام لیا جائے۔

۸- عربی اور ٹھیٹھ ہندی لفظوں کی ترکیب سے حتی الامکان پرہیز کرنا چاہئے۔

۹- دو یا تین یا زیادہ الفاظ کو ملا کر ایک مرکب لفظ بنانا منظور ہو تو جس طرح فن کیمیا میں اکثر ضرورت پڑے گی اور اس قدر تصرف جائز رکھا جاتے کہ ہر لفظ مفرد میں سے ایک حرف حذف کر کے مرکب اصطلاح میں اختصار پیدا کر دیا جائے۔

۱۰- فن کیمیا میں سینکڑوں نام بسیط اور مرکب مادّوں کے مستعمل ہونگے۔

جن کے واسطے علامات کا مقرر کرنا ضروری ہے یورپین زبانوں کی کتابت میں حروف علیحدہ علیحدہ لکھے جاتے ہیں اس لئے یورپین لوگوں کو اس میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ اب سوال یہ ہے کہ اردو میں مرکب مادّوں کے ناموں میں حروف الگ الگ لکھے جائیں یا ملا کر مثلاً کیمیکل "اورک، ب، ی، ک، ج۔ پر غور کیجئے حروف کے الگ الگ لکھنے میں آسانی یہ ہے کہ ان کی مقدار کے اظہار کے لئے ہندسے لگائے جا سکتے ہیں۔ ملا کر لکھے جائیں تو ہندسے لگانا مشکل ہو جائیگا۔ حروف کے علیحدہ علیحدہ لکھے جانے میں طوالت بے شک ہے۔ یہ رہنمایانہ اصول دارالترجمہ کے مترجمین کے لئے مشعل راہ کا کام دیتے رہے وضع اصطلاحات کی جنرل کمیٹی نے ان اصولوں کی روشنی میں یہ بات طے کر دی تھی کہ کوئی لفظ بجنسہ اردو میں قبول نہیں کیا جائے گا۔ جب تک کہ اس کا مترادف نہ مل جائے اور مختلف الفاظ کی اصطلاح بنائی جائے گی۔ دلی کالج والوں نے اپنے عہد کو اپنے سامنے رکھا اور دارالترجمہ والوں نے اپنے عہد ضرورت اور ادبی و علمی مذاق کے پیش نظر اصطلاح سازی کا کام انجام دیا۔ آج کسی ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ان اصطلاحوں پر رائے زنی کرنا بہت آسان بات ہے اگر انہی حضرات سے کسی انگریزی لفظ کا مترادف پوچھ لیا جائے تو ساری قابلیت دھری کی دھری رہ جائے۔

اس رائے میں کافی وزن ہے کہ دارالترجمہ کی اصطلاحات ثقیل اور بوجھل ہیں یقیناً ہیں۔ اس کی وجہ جواز بھی موجود ہے۔ کیونکہ جب دو سال میں انٹرمیڈیٹ تک کی سائنس اور کامرس اور آرٹس کی کتابیں تیار کرنی ہوں تو اس وقت جو

---

[1] علمی اصطلاحات۔ مولوی عبدالحق ص ۶۰ رسالہ اردو ۱۹۳۰ء اورنگ آباد

لفظ جلدی اور آسانی کے ساتھ مفہوم بھی اور معنی بھی ادا کرتا ہو اصطلاح بنا دیا جائے گا۔ دوسری طرف وضع اصطلاحات میں ملک کے دو بڑے عالم زبان داں شعر و ادب کے نباض اور اپنے وقت کے بلند پایہ شاعر و نثار۔ علی حیدر نظم طباطبائی پروفیسر وحید الدین سلیم یہ دونوں مشرقی ہونے کے باوجود بعد المشرقین رکھتے تھے۔ سلیم ہندوستانیت پر زور دیتے رہے ان کا کہنا تھا کہ ہمیں ہندی اور عربی کو اصل بنیاد بنانا چاہئے جو آگے چل کر ملک کی زبان بننے والی ہے۔ اگر ہم آج اس زبان کو اصطلاح کی بنیاد بناتے ہیں تو یہ اصطلاح عام فہم، سادہ اور سلیس ہوگی اور اس میں اپنے ملک کی بو باس اپنائیت کا سبب بنے گی اس نظریہ کو بڑھانے میں مولوی عبدالحق ان کا ساتھ دیتے تھے دوسرا نظریہ علی حیدر نظم طباطبائی کا تھا جو ہندی، فارسی، عربی کو بنیاد بنانا چاہتے تھے لیکن ان کا زور سب سے زیادہ عربی پر رہا۔ وہ عربی کو اصطلاحات کا منبع سمجھتے تھے۔ سلیم کے مقابلے میں نظم طباطبائی کے نظریئے کو ماننے والوں کی تعداد زیادہ رہی۔ اس وقت جب کہ اصطلاح سازی کا کام ہوتا تھا ایک ایک لفظ پر گھنٹوں غور کیا جاتا تھا، آپس میں تائید و مخالفت میں بحث کا میدان گرم ہوتا تھا ہر طرح سے لفظ کے حسن و قبح پر غور کرنے کے بعد اس لفظ کو سند اصطلاح دی جاتی تھی۔

دارالترجمہ کی کتابوں کو دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مترجمین نے بڑا لچکدار رویہ اختیار کیا ہے۔ مثلاً دہلی کالج اور سید حسن بلگرامی کے مشورہ پر پوری طرح عمل کیا گیا ہے۔ جیسے سوڈیم کلورین۔ اور اسی قسم کے جتنے بھی لفظ سائنس میں استعمال ہوتے ہیں ان کو بجنسہ استعمال کیا گیا ہے اور بعض الفاظ تو ایسے ہیں کہ تلفظ کی بدولت

وہ لفظ خود بخود اردو کا بن گیا — جیسے

اردو	انگریزی
گراموفون ۔ فونوگراف ۔ ذیابیطس	Diabetis
فونوگرام انفلوئنزا	Influenza
ملغم	Amalgam

اس طرح کے ہزاروں اصطلاح اردو میں آج بھی رائج ہیں! اس طرح کی اصطلاح میں ترجمہ کی کوشش نہیں کی گئی یہ ان کی فراخ دلی کا ثبوت ہے۔

بعض جگہ تو پوری انگریزی اصطلاح کا بہت عمدہ سلیس بامحاورہ ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ جیسے

(1) Examintion of hearing — سماعت کا امتحان

(2) Short sightedness — کوتاہ نظری

یہ تو میں دو تین مثالیں، طوالت کے خیال سے پیش کر رہا ہوں ورنہ اس طرح کی ہزاروں مثالیں کتابوں میں مل جائیں گی۔ آرٹس اور اس سے متعلقہ مضامین کی اصطلاحوں پر عربی کا اثر نمایاں نہیں ہے کیونکہ اس کے مترادف الفاظ اردو زبان میں مل جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ مشکل، میڈیکل، انجینئرنگ اور اس سے متعلقہ مضامین کی اصطلاحوں میں پیش آئی کیونکہ پہلی مرتبہ ان مضامین کا ترجمہ اعلیٰ جماعتوں کے لئے کیا جا رہا تھا۔ ان مضامین کی اصطلاحوں پر عربی کا زبردست اثر ہے اور عربی کو ہی اس کی اصل بنیاد بنایا گیا ہے۔ حالانکہ ان کے عام فہم الفاظ بھی مل سکتے تھے لیکن ان کو نظر انداز کر دیا گیا۔ عربی زدہ چند مثالیں درج ذیل ہیں جو میڈیسن کے لئے وضع کی گئیں ہیں۔

(1) Focus	۱۔ توجہ یا مرکوز	ماسکہ
(2) Exposure	۲۔ سردی لگنا	تکشف
(3) Bronehitis	۳۔ نرخرے کی نالیوں کا ورم	شعی التہاب
(4) Hayfever	۴۔ تیز بخار	حمتہ القش
(5) Spray	۵۔ چھڑکنا یا چھڑکاؤ	رشاش
(6) Epistaxis	۶۔ نکسیر ہو سکتا تھا	رُعاف
(7) Tonsil	۷۔ حلق۔ کوا۔ گلے کی گٹھی	لوزہ
(8) Tensillitls	۸۔ گلے آنا	التہاب اللوزہ
(9) Measles	۹۔ کھسرا	حصبہ
(10) Spirit	۱۰ حوصلہ۔ ہمت۔ جرأت۔ روح شراب	
(11) Dropper	۱۱۔	مقطار چشم
(12) Lamp Black	۱۲۔	کاجل کجل

یہ اور اس طرح کی بہت سی اصطلاحیں ہیں جو میڈیکل میں مل جائیں گی۔ فارسی، عربی کے علاوہ خاص خاص ہندی کا اثر بھی اصطلاحوں پر نمایاں ہے جیسے

Air Bath — پون جنتر — Water Bath — پن جنتر

وغیرہ ان کے علاوہ چند مختلف مضامین کی اصطلاحات تحریر کر رہا ہوں تاکہ ان کی افادیت کا اندازہ ہو سکے۔

Baromtric — بار پیمائی

Battery — مورچہ

Beat	ضرب
Colums	قطار
Cerrction	تصحیح
Copper Sulphate	نیلا تھوتھا (رنگ کی مناسبت سے)
Crude petroleum	خام ارضی تیل
Disturbance	خلل
Dust	گرد و غبار دھول
Gallery	چھتہ
Key Board	چابیوں کا تختہ
Sonometer	صوت پیما
Survey	پیمائش
Profile	ڈھانچہ، خاکہ
Powder	سفوف
Turning	موڑ یا چکر
Wear and Tear	توڑ پھوڑ

اصطلاحات کے سلسلے میں اس بات کو بھی مدِ نظر رکھا گیا کہ ایک لفظ سے اصطلاحات بن سکتی ہیں مثلاً لفظ برق" کو لیجیے سابقوں اور لاحقوں، نیم سابقوں اور نیم لاحقوں کا اضافہ کر کے (۳۰۰) سے زیادہ تراکیب اور اصطلاحات بنائی گئیں مثلاً برق پاشیدگی Electrolysis

برقیرہ Electrode — برقی منفا بیس Kathode

زبر برقیرہ Electro-Magnet

ایک بات عرض کردوں - اس مضمون کے سلسلہ میں میرے یہاں جتنی کتابیں دارالترجمہ کی موجود ہیں انہی کو اس مضمون کی بنیاد بنایا گیا ہے ابھی تک دارالترجمہ پر کوئی کام نہیں ہوا اور نہ اس کی طرف توجہ دی گئی —— اس کی اصطلاحات دیکھنے کے لئے کتب خانوں کی خاک چھاننی پڑتی ہے جس کی وجہ سے ہمت ٹوٹ جاتی ہے اس مضمون میں اصطلاحوں پر اور بحث کی گنجائش ہے لیکن مجبوری یہ ہے کہ مضمون طویل ہوتا جا رہا ہے! اور مواد کی فراہمی سب سے زیادہ مشکل مسئلہ ہے لیکن خوشی کی بات ہے کہ حیدر آباد کے بجائے شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے دارالترجمہ کی افادیت کے پیش نظر اس موضوع پر ڈاکٹریٹ کرنے کے لئے اجازت دی ہے امید ہے کہ اس مقالہ کے مکمل ہونے کے بعد دارالترجمہ کی خدمات کا ایک واضح نقشہ سامنے آجائے گا۔